www.pklibrary.net
www.pklibrary.net

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

واٹس اپ

03172266944

بانی محمود ریاض

مدیر منتظم ——— آذر ریاض

مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیر خصوصی ——— امت الصبور

فلم/ٹی وی ——— شاہین رشید

قانونی مشیر ——— نور الدین سرکی اینڈ کمپنی

ایڈوکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

مئی 2025

جلد 38 شمارہ 09

قیمت 150 روپے

پہلی شعاع، 8

حمد، تنویر پھول 9

نعت، ناصر کاظمی 9

نبی ﷺ کی باتیں، ادارہ 10

سروے

عید کے رنگ، محبتوں کے سنگ، ادارہ 20

انٹرویو

دستک، شاہین رشید 24

جب تجھ سے ناتا، نیڈ خان 15

ظفر معراج سے ملاقات، عین۔خ 26

ناول

دھوپ دریچہ، مریم عزیز 34

مکمل ناول

بس تھوڑی سی بے وفائی، امت العزیز شہزاد 76

چاندی کے گھر، آیمن ملی 164

ماء الملوک، نگہت سیما 122

افسانے

ادھوری دعا، لبنیٰ آصف 65

ابھی کچھ دن لگیں گے، ملیحہ غزال 68

آخر وہ بھی، صائمہ نور 115

کامیاب عورت، شگفتہ الطاف ہاشمی 120

ایک ہم، قرۃ العین خرم ہاشمی 191

لازوال، قانتہ رابعہ 156

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جا سکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) —— 1,800 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، یورپ — 25000 روپے

سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں

subscriptions@khawateendigest.com

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

نظمیں غزلیں

غزل — اظہر فراغ — 197

نظم — شازیہ نایاب ستار — 197

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

مستقل سلسلے

خط آپ کے — ادارہ — 30

باتوں سے خوشبو آئے — شگفتہ چاہ — 198

کھلتا کسی پہ — واصفہ سہیل — 201

تاریخ کے جھروکے — امت الصبور — 202

مسکراہٹیں — ادارہ — 200

موسم کے پکوان — واصفہ سہیل — 208

خوبصورت بننے — ادارہ — 210

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

یہ ملکی شعاع

مئی کا شمارہ لیے حاضر ہیں

زندگی کا بہاؤ تیز ہے اور وقت کی رفتار تیز تر۔ وقت کا ساتھ نبھانا مشکل سہی لیکن اس سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہم ابھی تک صحیح سمت کا تعین ہی نہیں کر پائے ہیں۔ ہم سب تبدیلی چاہتے ہیں لیکن خود کو بدلنے پر تیار نہیں۔

ایسے وقت میں جب ملکی معیشت لڑکھڑاتے ہوئے اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہی ہے اور ہمارا ازلی دشمن ہماری نظریاتی سرحدوں پر حملے کر رہا ہے۔ ہمارے وجود کو چیلنج کر رہا ہے۔ ہمیں للکار رہا ہے۔ ہم آپس کے جھگڑوں میں الجھے ہوئے ہیں۔

قوموں کے فیصلے جذبات سے نہیں عقل سے کیے جاتے ہیں۔ کوئی بھی فرد اس ملک کے لیے ناگزیر نہیں ہے لیکن یہ ملک بائیس کروڑ عوام کے لیے، ان کی آنے والی نسلوں کے لیے ناگزیر ہے۔ سر پر چھت نہ بھی ہو لیکن قدم جما کر کھڑا ہونے کے لیے زمین کی ضرورت ہوتی ہے۔

لوگ آتے رہیں گے۔ جاتے رہیں گے لیکن یہ ملک نہیں رہا تو کوئی بھی نہیں بچے گا۔ بھارت کے مسلمانوں کی مثال سامنے ہے۔ آج ان کی نسلوں کا وجود غیر محفوظ ہے۔

عید نمبر سروے

جون کا شمارہ عید نمبر ہوگا۔ عید نمبر میں قارئین کی شمولیت کے لیے سروے بھی شامل ہوگا۔

سوالات یہ ہیں۔

1۔ اب خواتین بھی قربانی کے جانوروں کی خریداری میں دلچسپی لیتی ہیں، کیا آپ کبھی اپنے والد، بھائی یا شوہر کے ساتھ قربانی کے جانور کی خریداری کے لیے گئی ہیں۔

2۔ عیدالاضحیٰ کے دن آپ کے ہاں بننے والی گوشت کی پہلی ڈش کیا ہوتی ہے۔

3۔ قربانی کے گوشت سے بنائی جانے والی آپ کی پسندیدہ ڈش کیا ہے؟

ان سولات کے جواب اس طرح بھجوائیں کہ 22 مئی تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

محمود ریاض صاحب

انسانی زندگی کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ شاہراہ زندگی پر بھاگتے دوڑتے جدوجہد کرتے جب انسان کے قدم جمنے لگتے ہیں۔ وہ تھوڑا دم لے کر اطمینان کی سانس لیتا ہے۔ اپنے لگائے پودوں کو پھلتا پھولتا دیکھ کر طمانیت محسوس کرتا ہے تو قدرت کی طرف سے بلاوا آجاتا ہے۔ اب کام ختم۔

محمود ریاض صاحب نے ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی بنیاد رکھی۔ خواتین ڈائجسٹ، شعاع اور کرن کی شکل میں بامعنی، بامقصد اور خوب صورت پرچوں کا اجرا کیا۔

ان پرچوں نے خواتین کو شعور آگہی اور اپنی ذات کا ادراک دیا، انہیں اپنی بات کہنے کا، اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع دیا۔

محمود ریاض صاحب آج ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ 10 مئی 2001 کو وہ دنیا کو الوداع کہہ گئے۔ لیکن وہ لاکھوں لوگوں کی زندگی میں شامل ہیں۔ جو چراغ وہ روشن کر گئے۔ وہ ان کی زندگیوں میں روشنی پھیلا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ (آمین)

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

حمد باری تعالیٰ

خداوندِ دو عالم! بے نواؤں کی دعا سن لے
تجھی سے ملتجی ہیں ہم، ہماری التجا سن لے

گدا ہیں ہم تیرے در کے، ترا دربار ہے عالی
لگائے آس تجھ سے ہیں تو بھر دے جھولیاں خالی

رسول اللہ کے صدقے میں ہو لطف و کرم یارب
کہ شامل ہیں تیرے محبوب کی امت میں ہم یارب

خطائیں بخش دے مولا، تجھے غفار کہتے ہیں
چھپالے سارے عیبوں کو، تجھے ستار کہتے ہیں

ترا در چھوڑ کر جائیں کہاں اے خالق عالم
کہ ہے معبود تو ہی تو ہمارا عبد تیرے ہم

بھلائی کر عطا یارب ہمیں تو دین و دنیا کی
منور نور ایماں سے ہو قلب آدم خاکی

دعا اب پھول احقر کی یہی ہے رب اکبر سے
کہ ہر مسلم کو اے مولا بچا ابلیس کے شر سے

تنویر پھول

نعت رسولِ مقبول ﷺ

شجر حجر تمہیں جھک کر سلام کرتے ہیں
یہ بے زباں تم ہی سے کلام کرتے ہیں

زمیں کو عرشِ معلیٰ ہے تیرا گنبد سبز
تری گلی میں فرشتے قیام کرتے ہیں

مسافروں کو ترا در ہے منزل آخر
یہیں سب اپنی مسافت تمام کرتے ہیں

جنہیں جہاں میں کہیں بھی اماں نہیں ملتی
وہ قافلے یہاں آ کر قیام کرتے ہیں

نظر میں پھرتے ہیں تیرے دیار کے منظر
اسی نواح میں ہم، صبح و شام کرتے ہیں

سکونِ دل کی انہی سے امید ہے ناصر
جو اپنا فیض غریبوں پہ عام کرتے ہیں

ناصر کاظمی

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

مشتبہ کام

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''قتل وغارت (اور فتنوں کے ایام) کے دوران میں عبادت کرنا ایسے ہے جیسے میری طرف ہجرت کرنا۔''

فوائد ومسائل

1۔فتنہ وفساد کے ایام میں فتنوں میں شمولیت سے بہتر ہے کہ ان سے الگ تھلگ رہا جائے۔اس کے لیے بہتر طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت عبادت میں گزارا جائے۔

2۔رہبانیت ممنوع ہے لیکن فتنوں کے ایام میں گوشہ نشینی رہبانیت میں شامل نہیں کیونکہ رہبانیت کا مطلب ہے کہ عوام سے جائز میل جول سے بھی اجتناب کیا جائے اور عبادت میں اس طرح کی سختی کی جائے جو سنت کے خلاف ہے، جب کہ اس گوشہ نشینی کا مقصد اپنے آپ کو قتل و غارت اور فساد میں ملوث ہونے سے محفوظ رکھنا ہے۔اس دوران میں مسنون نفلی عبادات میں اس حد تک مشغول ہوا جاسکتا ہے کہ اپنی ذات اور بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنے کے علاوہ کسی اور مشکوک سرگرمی میں حصہ نہ لیا جاسکے۔

3۔ہجرت میں وطن چھوڑا جاتا ہے اور گوشہ نشینی میں اہل وطن کی برائیوں اور شرارتوں سے دامن بچانے کے لیے ان سے تعلق محدود کیا جاتا ہے۔اس لحاظ سے یہ دونوں مکمل مشابہ ہیں اور ان دونوں کا ثواب بھی بہت زیادہ ہے۔

اسلام شروع میں اجنبی تھا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اسلام شروع میں اجنبی تھا، اور وہ دوبارہ اجنبی ہو جائے گا، اس لیے اجنبیوں کو مبارک ہو۔''

فوائد ومسائل

1۔''غریب'' اجنبی اور بے وطن کو کہتے ہیں۔ شروع میں اسلام کی یہ کیفیت تھی کہ اسے کوئی جانتا نہ تھا۔معاشرہ اسے قبول کرنے پر تیار نہ تھا۔آہستہ آہستہ لوگ اسے سمجھتے اور قبول کرتے گئے حتیٰ کہ ہر طرف اسلام کا بول بالا ہوگیا اور کفر وشرک ختم ہوگیا۔

2۔خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور کے بعد اسلام میں بدعات کا ظہور ہوا، بعد کے ادوار میں مسلمانوں نے غیر مسلموں کے رسم ورواج اور خیالات اپنا لیے۔ اس طرح اصل اسلام چند لوگوں تک محدود ہوکر رہ گیا۔اکثریت نے خود ساختہ رسم ورواج اور غلط عقائد واعمال ہی کو صحیح اسلام سمجھ لیا۔

3۔جن اجنبیوں کو مبارک باد دی گئی ہے، ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو بدعات کی کثرت میں سنت پر عمل پیرا رہیں، غلط عقائد مشہور ہونے پر صحیح عقیدے پر قائم رہیں اور اخلاقی انحطاط کے دور میں صحیح اسلامی اخلاق کو اختیار کریں۔

4۔حق وباطل کا دارومدار کسی نام کو اختیار کرنے پر نہیں بلکہ قرآن وحدیث کی موافقت اور مخالفت پر ہے۔

فتنوں سے خلاصی

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ ایک دن مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں۔ انہوں نے کہا۔

''آپ کیوں رو رہے ہیں؟''

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

''مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہوئے ایک ارشاد کی وجہ سے رونا آرہا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرمارہے تھے ''تھوڑا سا دکھاوا بھی شرک ہے۔ اور جو کوئی اللہ کے کسی دوست سے دشمنی رکھتا ہے، وہ (گویا) اللہ تعالیٰ کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو وہ گمنام، متقی، نیک لوگ پسند ہیں جو غیر حاضر ہوں تو انہیں تلاش نہیں کیا جاتا، اگر موجود ہوں۔ انہیں بلایا نہیں جاتا، نہ انہیں پہچانا جاتا ہے۔ ان کے دل ہدایت کے چراغ ہیں۔ وہ ہر ایک غبار آلود تاریک فتنے سے نکل جاتے ہیں۔'' (اور فتنوں سے متاثر ہو کر گمراہ نہیں ہوتے۔)

کامل انسان

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''لوگوں کی مثال ان سو اونٹوں کی سی ہے جن میں سے ایک بھی سواری کے قابل نہ ملے۔''

فوائد و مسائل:

1۔ صاحب کمال لوگ تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں۔

2۔ عوام میں زیادہ تر لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی اہم ذمہ داری کو اٹھانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اگر کامل اہلیت والا فرد نہ ملے تو ناقص اہلیت

...کام چلانا چاہیے، تاہم ان کی مناسب رہنمائی اور ان کے کام کی مناسب نگرانی ضرور ہے۔

3۔ مربی تربیت میں محنت کرے اور اس کا مطلوب نتیجہ نہ نکلے تو ضروری نہیں کہ تربیت میں نقص ہو۔ بعض اوقات تربیت پانے والوں کے نقص کی وجہ سے مطلوب نتائج حاصل نہیں ہوتے۔

امتوں کا فرقوں میں تقسیم ہونا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''یہودی 71 فرقوں میں تقسیم ہوئے اور میری امت 73 فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔''

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''یہودی اکہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے۔ (ان میں سے) ایک فرقہ جنتی تھی اور ستر جہنمی۔ عیسائی بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے۔ (ان میں سے) اکہتر جہنمی تھے اور ایک جنتی۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! میری امت ضرور تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ (ان میں سے) ایک فرقہ جنت میں جائے گا اور بہتر جہنم میں۔''

عرض کیا گیا۔ ''اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! وہ کون لوگ ہیں؟'' فرمایا ''جماعت۔''

فوائد و مسائل:

1۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مستقبل میں پیش آنے والے جن جن واقعات کی جس جس طرح خبر دی وہ اسی طرح پیش آئے۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور صداقت کی دلیل ہے۔

2۔ فرقوں میں تقسیم ہونے کے بارے میں اس لیے بتایا گیا ہے کہ مسلمان ان اختلافات میں صحیح طرز عمل اختیار کرنے کی کوشش کریں۔

3۔ نصاریٰ اور مسلمانوں میں اختلاف کی اصل وجہ خواہشات نفس کی پیروی اور تعصب ہے اور یہ

جرائم جہنم میں لے جانے والے ہیں۔

4۔ مسلمانوں کی اصل "جماعت" وہ ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقے پر چلی آ رہی ہے۔ اس جماعت سے لوگ الگ ہو کر مختلف فرقوں کی شکل اختیار کر گئے لیکن اصل "جماعت" بھی قائم ہے۔ مسلمان کو اسی "جماعت" کے ساتھ رہنے اور ان کی پیروی کرنے کا حکم ہے۔

5۔ جماعت سے الگ ہونے والے خواہش نفس یا غلط تاویلات کی وجہ سے الگ ہوئے۔ جو لوگ ان فرقوں میں شامل نہیں ہوئے، وہ قرآن و حدیث پر قائم رہے۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔

6۔ نجات کا دارومدار اپنی پارٹی کا کوئی خاص نام رکھ لینے پر نہیں بلکہ قران وسنت کے مطابق عمل کرنے پر ہے۔ عاملین کتاب وسنت مختلف زمانوں اور علاقوں میں مختلف ناموں سے مشہور ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ الگ الگ فرقے بن گئے ہیں، بلکہ وہ سب تنظیمیں یا جماعتیں "الجماعۃ" میں شامل ہیں۔

گمراہی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم لوگ پہلوں کے طریقے کی (پوری طرح) پیروی کرو گے، جیسے باع باع کے برابر، ہاتھ ہاتھ کے برابر اور بالشت بالشت کے برابر ہوتی ہے حتیٰ کہ اگر وہ کسی سانڈے کے بل میں گھسے ہوں گے تو تم بھی ضرور اس میں گھسو گے۔"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہم یہودیوں اور عیسائیوں کی (پیروی کریں گے؟)"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اور کن کی؟"

فوائد و مسائل:

1۔ یہود و نصاریٰ کے رسم و رواج کی پیروی کرنا گمراہی کا باعث ہے۔

2۔ یہود و نصاریٰ اور ہندوؤں کے تہواروں میں شریک ہونا ان کی محبت پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں ان کا مذہب بھی اچھا محسوس ہونے لگتا ہے۔ جب اسلام کے مقابلے میں کفر کے طور طریقے اچھے لگنے لگیں تو پھر نام نہاد ایمان کا باقی رہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

3۔ "باع" سے مراد وہ فاصلہ ہے جو دونوں ہاتھوں کے سروں کے درمیان اس وقت ہوتا ہے، جب دونوں بازو مخالف سمتوں میں دائیں بائیں پھیلا لیے جائیں۔ "ہاتھ"...... سے مراد ہاتھ کی انگلیوں سے کہنی تک کا فاصلہ ہے۔

4۔ سانڈے کے بل میں گھسنے کی کوشش کرنا ایک نامعقول حرکت ہے، لیکن یہود ونصاریٰ کی پیروی میں مسلمان یہ بھی نہیں دیکھیں گے کہ یہ کام یا سوچ درست بھی ہے یا نہیں، بغیر سوچے سمجھے اس کی پیروی شروع کر دیں گے۔

5۔ اس پیش گوئی پر عمل کی موجودہ دور میں متعدد مثالیں ہیں۔ مغرب کی تہذیبی وثقافتی یلغار ہے۔ جس کا مسلمانوں کی نسل نو بڑی تیزی سے شکار ہوتی جا رہی ہے۔

مال کا فتنہ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا۔

"لوگو، قسم ہے اللہ کی! مجھے تمہارے بارے میں صرف دنیا کی زینت (اور مال و دولت) سے خطرہ ہے جو اللہ تعالیٰ تمہیں عطا فرمائے گا۔"

ایک آدمی نے کہا۔ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا خیر سے بھی شر حاصل ہو جاتا ہے؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر خاموش رہے، پھر فرمایا۔ "تم نے کیا سوال کیا؟"

اس نے کہا۔ "میں نے کہا تھا کیا خیر سے بھی شر حاصل ہوتا ہے؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''خیر (حلال مال) سے خیر ہی حاصل ہوتا ہے، کیا وہ (دنیا کا ہر مال خیر نہیں ہوتا) موسم بہار خیر ہے؟ (دنیا کا ہر مال خیر نہیں ہوتا) موسم بہار میں جو سبزہ اگتا ہے، اس سے جانور اپھارے کا شکار ہو کر مر جاتا ہے یا مرنے کے قریب ہو جاتا ہے، مگر وہ چرنے والا جانور (بچ جاتا ہے) جو کھاتا ہے، پھر جب اس کی کوکھیں بھر جاتی ہیں تو دھوپ کی طرف منہ کر کے گوبر اور پیشاب کرتا ہے، پھر جگالی کرتا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ کھانے لگتا ہے۔ جو شخص جائز طریقے سے مال حاصل کرتا ہے، اسے اس میں برکت حاصل ہوتی ہے اور جو شخص ناجائز طریقے سے مال حاصل کرتا ہے اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی کھاتا رہتا ہے لیکن سیر نہیں ہوتا۔''

فوائد و مسائل

1۔ مال و دولت کی حرص انسان کے دین کے لیے خطرناک ہے۔

2۔ مال اللہ کی نعمت ہے، اس لیے حلال طریقے سے حاصل کرنا منع نہیں۔

3۔ حلال کمائی سے حاصل ہونے والا مال بھی خرچ نہ کرنا بلکہ سمیٹ سمیٹ کر رکھنا نقصان دہ ہے۔

4۔ گھاس اور سبزہ جانور کے لیے مفید ہے، بشرطیکہ پہلا کھایا ہوا ہضم ہونے کے بعد اور کھائے۔ اگر مسلسل کھاتا جائے گا تو نقصان اٹھائے گا۔ اسی طرح مال مفید چیز ہے بشرطیکہ اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ بھی کیا جائے۔

5۔ مثال دے کر سمجھانے سے بات زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔

مال دنیا

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جب تم فارس اور روم (کی سلطنتوں) کے خزانے فتح کر لو گے تو تمہاری کیا حالت ہو گی؟''

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''ہم وہی کچھ (شکر کے کلمات) کہیں گے (اور شکر والے عمل کریں گے) جن کا اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''یا دوسری بات ہو گی۔ تم ایک دوسرے پر رشک کرو گے، پھر ایک دوسرے سے حسد کرو گے، پھر ایک دوسرے سے منہ پھیرو گے، پھر اک دوسرے سے ناراض رہنے لگو گے یا اس طرح کا کوئی اور لفظ فرمایا۔ پھر غریب مہاجرین میں جاؤ گے اور انہیں ایک دوسرے کی گردنوں پر لاد دو گے۔''

فوائد و مسائل

1۔ رشک سے یہاں دنیا کے مال کی طرف مسابقت مراد ہے۔ کسی نعمت کے بارے میں یہ خواہش کہ وہ مجھے ملے، دوسرے کو نہ ملے، ناجائز رشک ہے۔ اس قسم کا رشک حسد تک لے جاتا ہے جو ناپسندیدہ ہے۔ جائز رشک کا مطلب یہ خواہش ہے کہ جیسی نعمت کسی کو ملی ہے ویسی مجھے بھی ملے۔ یہ رشک جائز ہے۔

2۔ حسد کے نتیجے میں تعلقات کشیدہ ہوتے ہیں اور دشمنی تک نوبت جا پہنچتی ہے۔ یہ سب عادتیں مذموم ہیں۔

3۔ آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ دولت مند افراد تنگ دست افراد پر سختی کریں گے اور رعب جمائیں گے۔ یہ صفات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں نہیں تھیں، بعد والوں میں ایسے افراد ظاہر ہوئے جن میں ایسی خصلتیں موجود تھیں۔

مال

حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ بنو عامر بن لوی کے حلیف تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ غزوہ بدر میں شریک ہوئے تھے۔ انہوں نے بیان کیا۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو بحرین روانہ فرمایا تاکہ وہاں (کے لوگوں) کا جزیہ لے کر آئیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین والوں سے صلح کی تھی اور ان پر حضرت علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر فرمایا تھا۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بحرین سے مال لے کر آئے۔ انصار کو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی آمد کا علم ہوا تو انہوں نے فجر کی نماز (مسجد نبوی میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں ادا کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز سے فارغ ہوئے تو وہ لوگ آپ کے سامنے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا تو مسکرا دیے۔ پھر فرمایا۔

''میرا خیال ہے، تم نے سنا ہے کہ ابوعبیدہ بحرین سے کچھ لائے ہیں؟'' انہوں نے کہا۔

''جی ہاں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''خوش ہو جاؤ اور خوشی والی چیزوں کی امید رکھو۔ قسم ہے اللہ کی! مجھے تم پر فقر کا اندیشہ نہیں۔ مجھے تو یہ خطرہ ہے کہ دنیا تم پر اسی طرح فراخ ہو جائے گی جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر ہوئی تھی، پھر تم اس کے لیے ایک دوسرے پر رشک (اور مسابقت) کرو گے جس طرح تم سے پہلے لوگوں نے کیا، تو یہ (دنیا) تمہیں تباہ کر دے گی جس طرح اس نے تم سے پہلے لوگوں کو تباہ کر دیا تھا۔''

فوائد و مسائل

1۔ دولت ایک آزمائش ہے۔ اس کی حرص کی وجہ سے ظلم اور گناہ کا ارتکاب ہوتا ہے۔

2۔ مال حلال طریقے سے حاصل ہو اور اس پر قناعت کی جائے تو برا نہیں۔

نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''نیکی کا حکم دو اور برائی سے منع کرو، قبل اس کے کہ تم دعائیں مانگو اور تمہاری دعائیں قبول نہ کی جائیں۔''

فوائد و مسائل

1۔ نیکی کا حکم دینے سے مراد مناسب طریقے سے نیکی کی ترغیب دینا ہے۔ حاکم اپنی رعایا کو، والد اپنی اولاد کو اور شوہر اپنی بیوی کو حکم دے سکتا ہے جس کی وہ تعمیل کرتے ہیں۔ دوسروں کو اس انداز سے حکم نہیں دیا جا سکتا۔

2۔ برائی سے منع کرنے کی طاقت ہو تو ہاتھ سے منع کرنا (جیسے حاکم، والدین اور خاوند وغیرہ) ورنہ زبان سے سمجھانا ضروری ہے (جیسے عالم عوام کو سمجھاتا ہے) اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو گناہ سے دلی نفرت ضرور ہے۔

3۔ گناہوں کا ارتکاب دعا کی قبولیت میں رکاوٹ بن جاتا ہے، لہٰذا توبہ کرنی چاہیے۔

فتنہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں بیٹھے تھے کہ قبیلہ مزینہ کی ایک عورت زینت والا لباس پہنے اتراتی ہوئی مسجد میں آئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''لوگو! اپنی عورتوں کو مسجد میں زینت والا لباس پہننے اور تفاخر والی چال چلنے سے منع کرو۔ بنی اسرائیل پر اسی وقت لعنت کی گئی تھی جب ان کی عورتوں نے زینت والا لباس پہنا اور مسجدوں میں فخر سے چلنے لگیں۔''

☆☆

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ع۔خ

میں نے سوچا تھا، اس مہینے تجھ سے ناتا جوڑا میں اپنے بارے میں لکھ کر بھیجوں گی۔ یہ بھی سوچا انسان کی زندگی کا کوئی پتا نہیں کب زندگی کا پتا کٹ جائے۔ لیکن اس بار بھی موقع نہیں ملا کیونکہ میں جس کا ناتا جوڑا لکھنے جارہی ہوں۔ وہ میری کوکھ سے تو پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن میں اس کی چچی کے ساتھ رضاعی ماں ہوں۔ وہ میری بیٹی کی دودھ شریک بہن ہے۔ وہ مجھے اپنی سگی بیٹی سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ بہت محبت اور خلوص والی بچی ہے۔ جس کی شادی 27 مارچ کو ہوئی۔ اور صرف 50 دن کی شادی کے بعد وہ اپنے ماں باپ کے گھر ہے۔

بہت افسوس ہے ان ماں باپ پر جن کی اولادیں بگڑی ہوتی ہیں۔ اور وہ یہ سوچ کر ایک بچی کی زندگی خراب کر دیتے ہیں کہ شادی کے بعد سدھر جائے گا۔

میں نے ماہ نور بیٹی سے کہا۔ اپنے بارے میں اس دو ماہ میں جو گزرا بتاؤ۔ میں اسے ناتا جوڑا میں بھیجوں گی تو کہنے لگی۔

"چاچی تجھ سے ناتا جوڑا تو نہ کہیں۔ تجھ سے ناتا توڑا کہیں۔"

اس وقت ماہ نور کی بات پر بہت دکھ ہوا۔ سلام ہے بچی کے ماں باپ پر جنہوں نے بچی کی بات کو سمجھا۔ اور اس کو اس بات کا یقین دلایا۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ بتاؤ کیا فیصلہ ہے۔ تمہارا۔"

بچی ماشاء اللہ بی ایس ٹیکنالوجی کے سیکنڈ پارٹ کے ایگزام دینے والی ہے۔ اپنے والدین کے ساتھ کی وجہ سے اس نے رشتے کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

'میں ساری زندگی اس دو چہرے والے انسان کے ساتھ نہیں گزار سکتی۔ بعد میں رونے سے بہتر ہے ابھی رو لیا جائے۔ میں نے اپنی چوبیس سالہ زندگی کے نشیب و فراز میں کچھ سہا ہے، تو وجہ میرا شوہر ہے۔ جس کی وجہ سے وقت گزر گیا۔ اگر شوہر کا ساتھ نہ ہوتو لڑکی اس سسرال میں کیسے وقت گزارے جنہیں کل وقتی ملازمہ مل گئی۔

میں نے کوشش کی تھی بچی کو سمجھانے کی۔ لیکن اس کی باتوں نے میرا دل کاٹ دیا۔ ایسے بے رحم لوگوں کے لیے بچی اپنی زندگی کیوں برباد کرے۔ اللہ ایسے لوگوں کو ہدایت دے۔

س۔ شادی کب ہوئی؟

ج۔ شادی تو نہ کہیں میری بربادی کا دن کہیں ، ستائیس مارچ دو ہزار بائیس کو ہوئی۔

س۔ شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟

ج۔ شادی سے پہلے بہت خوب صورت زندگی تھی۔ میں بی ایس سی سائیکالوجی کی طالبہ ہوں، کالج جانا، گھر آ کر کچھ گھر کے کام کرنا، ٹی وی دیکھنا، امی کے ساتھ کام میں مدد کروانا، کالج کی اسائمنٹ وغیرہ بنانا۔ اور میں بہت ہنس مکھ اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ جس کے ساتھ بیٹھے گھر والے خاندان والے سب بہت خوش ہوتے تھے۔ جب کہ شادی کے ان دو ماہ میں مجھے چپ لگ گئی۔ مرجھا کر رہ گئی میں۔

س۔ شادی سے پہلے جیون ساتھی کے حوالے سے کیا تصور تھا؟

ج۔ ایک شفاف دل اور اخلاقیات سے بھرپور شخصیت کا مالک ہو، میری امی ابو کی اکثر لڑائی ہو جاتی تھی، اور اکثر کام امی کے بولنے سے خراب ہوتا تھا۔ تو میں نے یہ سوچا تھا۔ میں ان شاء اللہ ایسا نہیں ہونے دوں گی خاموش رہوں گی۔ لیکن میرے شوہر نے میرا تصور چکنا چور کر دیا شکل سے معصوم نظر آنے والا شخص انتہائی بدصورت دل کا مالک تھا۔ جو مجھ سے کہتا تھا۔ میری اتنی معصوم شکل ہے۔ تم ثابت ہی نہیں کر پاؤ گی۔ میں دو چہروں والا شخص ہوں جو فیملی کے سامنے اچھا ہونے کا ڈرامہ کرتا۔ اور اکیلے میں مجھے

دھمکاتا اگر تم نے کسی کو کچھ بھی بتایا تو گندم کی گولی کھالوں گا۔ شادی کے تیسرے دن سے ہی اس نے مجھے ڈانٹنا، ڈرانا، دھمکانا شروع کردیا، بغیر کسی وجہ کے، میں حیران ہی رہ گئی۔ اللہ یہ سب کیا ہے۔

س۔ منگنی کتنا عرصہ رہی بات یا ملاقات ہوئی؟

ج۔ میں ایک بات سب والدین سے کرنا چاہتی ہوں۔ آپ منگنی کردیتے ہیں۔ شادی بھی کروادیتے ہیں۔ لیکن اپنے بچوں کو حق نہیں دیتے کہ وہ اس شخص سے بات کریں جو کہ اس کی زندگی میں شامل ہونے والا ہے۔ اور کبھی بھی شادی میں جلدی نہ کریں۔ میری منگنی پانچ ماہ رہی اور اس بات پر زور تھا۔ دو ماہ میں شادی کریں۔ جب کہ میری خواہش تھی کہ میں بی ایس سی کے پیپر دے دوں، تو شادی ہو میرا شادی کرنے کا بالکل دل نہیں تھا۔ پر اپنے ماں باپ کی خوشی مجھے عزیز تھی۔ بظاہر اچھے نظر آنے والے لوگ اس وجہ سے جلدی کرتے ہیں کہ کہیں ہماری پول نہ کھل جائے۔ کاش میری ایک دفعہ بات ہوتی تو میری زندگی تباہ ہونے سے بچ جاتی۔ میری نند نے مجھے خود بتایا۔ بھائی تو کہہ رہا تھا۔ بات کرنی ہے پر ہم پاگل تھے جو نمبر دیتے رشتہ ہی ختم ہو جاتا اگر بات کرتا تو۔"

س۔ شادی سے پہلے آپ کے سسرال والوں کے بارے میں خیالات؟

ج۔ ہنسی آتی ہے۔ سوچ کے، دراصل کرنی بھرنی پڑتی ہے۔ ہماری دادو نے جو ظلم میری امی پر کیے۔ اور میری چاچی جو اب تک سہہ رہی ہیں ان کی کرنی ہے۔ جو ہم بچوں پر آرہی ہے۔ میری ماں اور چاچی کے صبر کو دیکھ کر سوچا تو یہ تھا برے ہوں گے پر اتنے نہیں ہوں گے لیکن شاید اللہ نے مجھے چنا اس سختی کا بدلہ لینے کے لیے، لیکن میری دادو آج بھی نہیں سمجھتیں۔

چار بھائی اور پانچ بہنیں اور سسر ساس کل گیارہ افراد کا کنبہ جس میں ایک بیٹی کی شادی ہوئی۔ دو کے علاوہ سب دس سال سے چھبیس سال تک کی عمر کا سسرال تھا میرا، جس میں دس سال کا دیور بھی میری انسلٹ کرتا تھا۔ عزت کی خواہش تھی۔ لیکن ان کو بہو نہیں ایک کل وقتی ملازمہ چاہیے تھی۔

س۔ شادی کے لیے تعلیم چھوڑنا پڑی یا کوئی قربانی دی؟

ج۔ تعلیم تو نہیں چھوڑی لیکن میرے ابو کو لگا۔ اب میں سسرال کی ذمہ داری ہوں۔ تو کالج لانے لے جانے کی ذمہ داری ان کی ہوئی۔ لیکن شوہر کو بائیک چلانی نہیں آتی۔ یہ کہہ کے جان چھڑالی۔ باقی سب بھی کوئی فیکٹری، تو کوئی کالج اور میری ذمہ داری ابو نے پھر سے اٹھالی کیونکہ سسرال والوں کا کہنا تھا۔ خود ہی آؤ اور خود ہی جاؤ۔ لیکن ابو نے اکیلے جانے کے لیے کبھی نہیں چھوڑا۔

س۔ شادی خیریت سے ہوئی یا رسموں کے لین دین میں جھگڑا ہوا؟

ج۔ ان لوگوں کو شادی کی جلدی تھی۔ پر شادی کی تاریخ فکس کرنے نہیں آرہے تھے۔ میری بڑی نند شادی شدہ تھی۔ اس کی ڈلیوری کا انتظار کررہے تھے۔ اور تاریخ رکھنے تب آئے جب ہال بک کروا آئے تھے۔ تاریخ رکھنے کے لیے پندرہ لوگوں کی بارات لے کر آئے۔ کھانا کھایا اور جب ولیمہ میں ہمارے مہمانوں کی بات ہوئی تو ابو اور چاچو نے کہا۔ ہمارے بھی پچاس لوگ شامل ہوں گے ولیمہ میں تو موڈ خراب کرلیا۔ یہ کہہ کر کہ "آپ لوگ بارات لائیں گے کیا؟"

کئی بار ہمارے گھر آئے۔ اور کھا کر گئے صرف ولیمہ ہی فنکشن تھا جس میں ہماری فیملی نے جانا تھا۔ ان لوگوں نے فوراً موڈ خراب کیا میرے والدین کو کئی بار اشارہ بھی ہوا پر یہ لوگ سمجھے نہیں۔ ہمارے پندرہ لوگ بھی شامل نہیں ہوئے ولیمہ میں۔

س۔ شادی کے بعد آپ کو دیکھ کر شوہر نے کیا کہا؟

ج۔ عجیب ہی لگا مجھے تو، پورے خاندان کے لوگوں کی بات ہی کرتے رہے اور مجھے تو حیرانی ہو رہی تھی ان کی باتیں سن کر، تب دل میں کھٹکا ہوا۔ یہ میں کہاں پھنس گئی۔ مجھے ولیمہ والے دن کے بعد سے ہی اقرا اقرا کہے جارہا تھا۔ جب کہ میرا نام رخسانہ ہے۔ میں بہت پریشان ہوئی یہ اقرا کون ہے؟

س۔ شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

ج۔ آپ تبدیلی کی بات کر رہی ہیں۔ میری تو زندگی ہی الٹ پلٹ ہوگئی دو چہروں والا شوہر ملا۔ جو شادی کے چوتھے دن ہی مجھے ڈانٹ کے کہہ رہا ہے۔

''تم کہاں متھے لگ گئی ہو۔ میرا صبر ہے جو میں تمہیں برداشت کر رہا ہوں۔''

موصوف کے پتا نہیں کتنے عشق تھے جن کی گنتی ہی کوئی نہیں تھی۔ مجھ سے کہا اپنی شکل دیکھی ہے۔ تم کتنی چالاک لگتی ہو اور میں اتنا معصوم نظر آتا ہوں کہ کوئی یقین ہی نہیں کرے گا تمہاری بات پر۔ ستائیس مارچ کو شادی ہوئی۔ گیارہ لوگوں کی سحری کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی، صرف ایک ہفتہ کی دلہن پر پوری فیملی سوئی ہوتی تھی اور میں دو بجے رات سحری کی تیاری کرتی۔ کوئی ہیلپ کروانے نہیں آتا۔ جب کہ میری ساس اور تین نندیں جوان تھیں۔

صبح سات بجے اٹھا دیتے تھے۔ سخت بخار میں بھی کام لیا مجھ سے۔ برتن، کپڑے، صفائی اور ساتھ کالج بھی جاتی تھی۔ پریشانی سے میرا بی پی ہائی ہونے لگا۔ میری عمر جب کہ صرف اکیس سال ہے۔ میرے پیٹ میں شدید درد رہنے لگا اور میرے ابو روز مجھ سے پوچھتے۔

''تم خوش تو ہو بیٹا۔ اور میں کہتیں جی ابو میں خوش ہوں۔ مجھے اس سسرال سے نجات میرے ابو نے دلائی۔ حالانکہ میرے جہیز میری شادی کے لیے ابو نے قرض لیا اور میری شادی کی۔ میرے لیے ہر چیز ڈبل لی۔ تاکہ میری بیٹی اپنے سسرال خوش رہے۔ اور یہی وجہ میرے ابو کو سچ بتانے کو روکتی تھی۔

ابو پوچھتے پیسے ہیں تمہارے پاس؟ اور میں جھوٹ بولتی۔

''جی ابو ہیں۔'' ابو نے کہا دکھاؤ۔'' میرے پاس ہوتے تو دکھاتی نہ۔ ابو نے پوچھا۔

''بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟''

اس دن میں پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ اور ابو کو بتایا جب ابو نے کہا۔

''آج تم سسرال نہیں جاؤ گی ہم بات کریں گے۔ ہم نے بیٹی بیچی نہیں ہے۔''

س۔ کیا میکے اور سسرال میں کھانے پکانے میں فرق تھا۔ اور ذائقے مختلف تھے؟

ج۔ انتہائی کنجوس لوگ تھے۔ ساری ذمہ داری مجھ پر تھی۔ چالاکی سے پیار سے۔ تم روٹی بہت اچھی بناتی ہو۔ تمہارے سالن کی خوشبو اچھی ہوتی ہے، اور میں پاگل ان کو خوش کرنے میں لگی رہی۔ رمضان میں پکوڑے سموسے نہیں بناتے۔ بس سبزیاں بنتی رہتیں۔ جب کہ ہمارے گھر چاہے، تھوڑا سا ہی سبزی کا ذائقہ بدل جائے چکن ڈالا جاتا کیونکہ ہم سبزی کھانے میں نخرے کرتے تھے یہ کہتے ہمیں گوشت نہیں پسند۔ اور اگر کہیں سے آجاتا۔ چٹ کر جاتے۔ درجن کیلے منگواتے۔ سب کو ایک ایک ملتا۔ میں بیمار ہوئی تو امی کے گھر بھیج دیتے۔ دو مہینے میں والدین سے تو خوب کھایا۔ لیکن ایک دعوت تو چھوڑیں چائے پہ بھی نہیں بلایا۔

س۔ شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟

ج۔ انہوں نے تو شادی ہی اس لیے کی تھی ایک مفت کی نوکرانی مل جائے اور بیٹے کو بے دام غلام بیوی جس کو صبح و شام پیار کے بجائے باتیں بنائیں۔

سارا کام سارا گھر مجھ پر چھوڑ دیا پریشانی سے میرا بی پی ہائی رہنے لگا۔ کسی کو کچھ نہ بتانے کی وجہ سے میرے پیٹ میں شدید درد ہونے لگا یہ سالوں کے نہیں صرف دو مہینے کا حال ہے۔

ایک دن بخار میں تپ رہی تھی۔ میری ساس نے سر پہ ہاتھ رکھا۔ اور کہنے لگی۔

''ٹھیک ہو، ناشتہ بناؤ۔''

اور ایک دفعہ تو میرے پیٹ میں اتنا شدید درد تھا کہ روٹی نہیں بیلی جا رہی تھی۔ پر میری ساس کو رحم نہ آیا۔ کھڑے نہ ہونے کی سکت کی وجہ سے زمین پر بیٹھ کر روٹی بیلتی اور توے پر ڈالتی۔

س۔ میکے اور سسرال میں کیا فرق محسوس کیا؟

ج۔ میرا میکہ جس میں امی میری بہنیں، میرا چھوٹا بھائی جو کہ صرف آٹھ سال کا ہے۔ آپی کی شادی کے بعد۔ میں نے امی کے ساتھ گھر کو سنبھالا۔ ہماری امی نے ہمیں ہر کام میں طاق کیا ہوا تھا۔ ابو آفس جاتے تو گھر

میں ہماری مرضی ہوتی تھی۔ کھانا، پینا، سونا کسی بات کی پابندی نہیں تھی یقین مانیے ان دو ماہ میں میں نے ہزار بار اپنے میکے کو یاد کیا جو کہ ایک گلی کے فاصلے پر تھا اور میں اتنی بے بس تھی کہ ابو امی کو کچھ بتا نہیں پا رہی تھی۔ صرف اس وجہ سے کہ ابو بہت قرض دار ہو گئے اور یہ ہی سوچتی یہ اب میرا نصیب اب شاید زندگی ایسے ہی گزارنی پڑے۔

یہ تو میرے ابو نے حوصلہ دیا اور کہا۔

”تم سب بتاؤ سامان کی قرضے کی کسی بات کی فکر نہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

اور ابو کی تسلی کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا اب میں یہ رشتہ اور نہیں چلا سکتی۔ میری ساری زندگی کا سوال ہے۔

س۔ سسرال میں کن باتوں پر تعریف یا تنقید ہوتی؟

ج۔ تعریف کر کر کے کام میرے سر ڈالے جاتے رہے اور میں پاگل سب کچھ کرتی رہی۔ روٹی اچھی بناتی ہو۔ کپڑے بہت صاف دھوتی ہو۔ تمہارے سالن کی خوشبو بہت اچھی آتی ہے۔ بی پی ہائی ہونے کی وجہ سے ساس نے امی کی طرف بھیج دیا۔ جب واپس آئی تو سسر نے تنقید کی کہ دو دن بعد گھر سے آئی ہے یہ سب ایک ہی کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ جہاں کولر لگا ہے۔ سارے افراد وہیں پر ہوتے ہیں ہمیں عادت نہیں تھی۔ جہاں پر مرد بیٹھے ہوں تو ہم بھی وہیں بیٹھیں، میرے دیور یہاں تک کہ نندوئی بھی وہیں موجود تھا۔ مجھے میرے سسر فورس کرتے کہ تم بھی سب میں آ کے بیٹھو۔

ہمارا تعلق پٹھان فیملی سے ہے ہم میں اس بات کو مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ ایک دفعہ میرے سسر نے یہ تک کہہ دیا۔

”تمہارے گھر والوں نے تمہیں تمیز نہیں سکھائی۔ سلام دعا نہیں کی۔“

جب کہ میں سلام کر کے باہر آ کر اپنی ایک نند کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔

س۔ سسرال سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟

ج۔ اس بات کا میں بہت شکر ادا کرتی ہوں۔ اللہ نے دو ماہ میں ہی ان کی اصلیت کھول دی۔ میری نندوں نے ایک ایک پول میرے سامنے کھولا شوہر کس نیچر کا ہے، اسے فیملی میں کسی کا نمبر نہ دینا۔ اس کا لڑکیوں سے افیئر ہے۔ یہ لڑکیوں کو پیسے بھیجتا ہے۔“ ابو نے اس کا اے ٹی ایم اپنے پاس رکھا ہے کسی کزن کو پسند کرتا تھا۔ پر ماں باپ نے وہاں شادی نہیں کی۔

تب میں نے ان سے پوچھا۔

”جب یہ کسی کو پسند کرتا تھا تو آپ لوگوں نے میری زندگی کیوں تباہ کی۔“

ایک دفعہ مجھے میری ساس نے جب شوہر کے آنے میں آدھا گھنٹہ تھا مجھے کہا۔

”روٹی سالن بنا لو۔“

میں نے کہا کہ ”وہ آنے والے ہیں۔“

تو کہنے لگی۔“ کوئی بات نہیں۔ تم کرو، جب وہ آئے گا۔ تو میں بتا دوں گی۔“

مجھے کام کرتے ہوئے گھنٹہ ہو گیا کام ختم کر کے جب میں کچن سے نکلی۔ تو میرا شوہر منہ بنا کر بیٹھا تھا۔ پانی دیا تو پانی کا گلاس پھینک دیا۔ میں نے کہا۔

”میں نے آنٹی کو کہا کہ آپ کا بیٹا آ جائے تو مجھے بتا دینا۔“

تو ساس کہنے لگی۔ مجھے کب کہا تھا تم نے۔ غرض کہ ہر نند نے اتنا مینٹلی ٹارچر کیا کہ میرا اس گلی کے پاس سے گزرنے کا دل نہیں کرتا۔ جہاں میرا سسرال ہے۔

اللہ کی شکر گزار ہوں۔ اللہ نے دو ماہ میں ان سب کا چہرہ واضح کیا آپ لوگ خود بتائیں جہاں دو ماہ گزرنا مشکل ہو گیا وہاں ساری زندگی کیسے گزارنی۔ اگر میرا شوہر اچھا ہوتا تو جیسے تیسے زندگی گزار لیتی۔ مانو کی ایک بات۔

”چاچی اگر میرا شوہر ٹھیک ہوتا نہ تو پورا گھر میں زبان سے صاف کرتی۔ میں ہر طرف سے ٹارچر ہو رہی تھی۔ اب سب بتائیں میرا فیصلہ ٹھیک ہے ناں۔

میری دادو نے بہت زور ڈالا پر میری ایک ہی بات مار دیں پر میں واپس نہیں جاؤں گی ابو نے پندرہ دن کا ٹائم دیا۔ اور یہ لوگ گیارہ دن بعد ہمارے گھر

آئے۔ میری ساس سسر ایک ہی بات کرتے۔

''دل تو نہیں تھا پر آ گئے۔ ہمارا بیٹا ٹھیک ہے۔ آپ کی بیٹی رہنا نہیں چاہتی۔'' ابو نے کہا۔

''بیٹا نہیں آیا۔'' وہ کہنے لگے۔

''وہ نہیں آئے گا ہمارے ساتھ چلو۔ ہم لے کر جاتے ہیں۔''

میں نے کہا ''نہیں جاؤں گی۔''

تین دن بعد پھر آیا میرا شوہر بہن کے ساتھ ابو نے پریشرائز کیا ساتھ چلنے کے لیے تو میرا بی پی پھر ہائی ہو گیا میرے اندر اتنا ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ جانے کے نام سے مری جان جاتی تھی۔ پھر میرے بہنوئی نے ابو کو سمجھایا۔

''آپ زبردستی نہ کریں اگر مانو جانا نہیں چاہتی تو۔''

س۔ بچوں کی پیدائش عورت کی زندگی میں بہت بڑا امتحان بن کر آتی ہے خصوصاً پہلا بچہ؟

ج۔ شکر اللہ کا، اللہ نے اس آزمائش سے بچایا۔ میرے ٹینشن سے ہارمونز ہی ڈسٹرب ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے امی بہت پریشان رہیں۔ ہر طرح کا ٹیسٹ کروایا پر ہر رپورٹ میں نیگٹیو آتی۔ پر امی کو وہم رہا جب تک میرے پریڈ نہیں ہوئے۔ جس دن پریڈ ہوئے اس دن میرا شوہر اپنی بہن کو لے کر آ گیا۔ انہیں دیکھ کر میری حالت بہت بری ہو گئی۔ ابو نے کہا ''جاؤ۔''

پر میں نے کہا۔ ''نہیں بنوں گی آپ پر بوجھ جاب کر لوں گی پر جاؤں گی نہیں۔''

سب نے سمجھایا تو ابو مان گئے۔ میں آج کل اپنی دادو کے گھر ہوں۔ چاچی کی طرف آئے دن میرے سسرال والے آ جاتے تھے۔

س۔ جوائنٹ فیملی سسٹم سے اتفاق کرتی ہے یا علیحدہ رہنا پسند ہے؟

ج۔ جہاں سکون ہو احترام ہو۔ تو جوائنٹ فیملی سسٹم سے بہتر کوئی زندگی نہیں ہے لیکن میری موجودہ زندگی نے مجھے اتنا ڈرایا کہ اب سسرال کے نام سے ڈر لگتا ہے واش روم میں نل کھول کر گھنٹہ گھنٹہ روتی تھی۔ اللہ میں کہاں پھنس گئی۔ کیسے گزرے گی یہ زندگی۔

س۔ آپ نے سسرال کے ماحول کو بہترین بنانے کی کتنی کوشش کی اور کس حد تک کامیاب رہیں؟

ج۔ میں نے تو نیک نیتی سے زندگی شروع کی تھی۔ پر ان لوگوں نے مجھے اتنا زچ کیا۔ بڑے سے لے کر چھوٹے تک ان سب کی باتیں اور سارے گھر کا کام بھی برداشت کر لیتی۔ اگر میرے شوہر کا ساتھ ہوتا۔ پر میرے شوہر تو دوسرے دن سے ہی اقرا کو ڈھونڈ رہے تھے۔ بڑا ہی چالاک اور عیار انسان تھا۔

مجھے کہتا ''میں تو اتنا معصوم لگتا ہوں تمہاری بات پر تو کوئی یقین ہی نہیں کرے گا۔''

لڑکیوں سے میرے سامنے بات کرتا تھا۔ اور اگر میں کہتی۔

''میں تمہارے ابو کو بتاتی ہوں۔''

تو کہتا ''میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔ اگر کسی کو بتایا تو۔''

کبھی گندم کی گولی کھا لوں گا کی دھمکی دیتا۔

تب ہی میں نے اپنے ماں باپ کی سپورٹ اور چاچی کی سپورٹ کے بعد یہ فیصلہ کیا۔ مجھے اس رشتے کو نہیں ختم کر دینا چاہیے۔

اسلام نے ہمیں یہ حق دیا ہے۔ پر ہمارا معاشرہ کہیں جینے نہیں دیتا میرا ان سب لڑکیوں کو پیغام ہے کہ اپنے حق کے لیے آواز اٹھائیں پر افسوس اکثر بیٹیاں یوں ہی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں سسرال والوں کی، ساری زندگی روتے دھوتے گزار لیتی۔

میں شکر کرتی ہوں۔ میری دادو تو آج بھی اس گمان میں ہیں کہ میں واپس چلی جاؤں گی۔ پر بس جو میری ماں نے سہا میں نہیں سہوں گی۔

میری ماں کا ساتھ ابو نے دیا۔ تب ہی وہ اتنی سختیاں برداشت کر گئیں۔ پر میں آج کے دور کی لڑکی ہوں مجھے جینا ہے اور پوری امید ہے ان شاء اللہ۔ اللہ میرے ساتھ بہترین کرے گا۔ (آمین)

عید کے رنگ محبتوں کے سنگ

ادارہ

عید کا دن اپنے دامن میں ڈھیروں خوشیاں سمیٹے طلوع ہوتا ہے۔
مسلمانوں کے تہوار بھی عبدیت کا مظہر ہوتے ہیں۔ عید کی صبح کا نور اور تقدس ہی الگ ہوتا ہے۔ نئے اجلے کپڑے پہنے مرد اور ان کی انگلیاں تھامے ہنستے کھلکھلاتے بچے اللہ کے حضور شکر ادا کرنے کے لیے عید گاہ کا رخ کرتے ہیں۔
گھروں میں بھی ایک رونق کا سماں ہوتا ہے۔ خوب صورت ڈیزائن کے دلکش رنگوں کے ملبوسات، خوب صورت مہندی سے سجے ہاتھ اور ہاتھوں میں کھنکتی چوڑیاں اور کچن سے اٹھتی خوشبوئیں۔
مہمانوں کی آمد و رفت اور ان کی خاطر داری، عید کے سارے رنگ دلکش ہیں۔
قارئین کے ساتھ ہمارا محبت اور اپنائیت کا رشتہ ہے۔ خوشیوں میں اپنے شریک نہ ہوں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے قارئین کی شمولیت کے لیے ہم نے سروے ترتیب دیا ہے۔

1۔ کسی ایسی خوش گوار عید کا احوال جو آج بھی ذہن کے پردوں پر نقش ہے۔
2۔ عید کی تیاریوں میں سرفہرست کون سی چیز ہوتی ہے۔ اچھے پکوان۔ احباب کی تواضع یا کپڑے، جوتے اور میک اپ کی اشیا پہلے کیا خریدتی ہیں۔
3۔ گزشتہ سالوں میں بڑھتی ہوئی مہنگائی نے ہر چیز کو متاثر کیا ہے۔ ویسے بھی زندگی دھوپ چھاؤں کا کھیل ہے۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ آپ مہنگائی یا کسی اور وجہ کے سبب اپنے یا اپنے بچوں کے لیے عید کا اہتمام نہ کرسکیں۔
4۔ عید کے موقع پر خاص طور پر اپنے لیے کیا اہتمام کرتی ہیں۔
5۔ کوئی ایسی ڈش جو عید کے دن آپ کے گھر لازمی بنتی ہو۔

رضوانہ وقاص...... کرلاں ہری پور

آپ ہر بار اتنے اچھے سوال پوچھتی ہیں جواب حاضر ہیں۔
1۔ کیا بات پوچھ لی آپ نے، عید تو بچپن کی ہوتی تھیں۔ جب پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ صبح سویرے اٹھنا۔ پہلے امی سے ضد کر کے کپڑے بنوانا۔ امی مجھے ایسے کپڑے چاہئیں۔ جب کپڑے آجاتے پھر ڈیزائن بنوانا۔ ڈیزائن کے بغیر کپڑے ہی نہیں پہنتی تھی۔ کپڑوں کے ساتھ میچنگ ہار کانٹے۔ ہیئر بینڈ چوڑیاں۔
تو جب کپڑے سل کر آجاتے تو بار بار پہن کر چیک کرنا کیسے ہیں۔ اور مہندی لگانا۔ پھر عید کی صبح سویرے اٹھ کر سب سے پہلے تیار ہونے کی جلدی۔ سب کے ساتھ عید ملنے جانا۔ صائمہ پھپھو زاد کزن کا انتظار سریاں سے آنا ہوتا تھا۔ جی ماموں۔ مطلب پیار کا نام ویسے عبدالطیف ماموں امی کے بھی ماموں میرے ماموں، پھوپھا بھی۔ تو جی ماموں کہتے۔ آ گئی ہے دیر نہیں کرنا شام تک گھر جلدی چلی جانا۔ سب کے گھروں میں عید ملنے جانا اپنی پرائمری

ٹیچر کو ملنے جانا۔ پھر بابا لوگوں کے گھر۔ نام ان کا فیض عالم ہم انہیں ماسٹر بابا ہی بولتے تھے۔ ایک روپیہ عیدی دیتے بولتے بانٹ لینا ہے آپس میں، مغرب سے پہلے گھر واپسی نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھار رک جاتی صائمہ رات تو دوسرے دن اس کے ساتھ جاتی۔ عید کی چھٹیوں تک پھپھو کے گھر ہی رہتی۔ وہ عیدیں مزے کی تھیں، اب کیا عیدیں ہیں۔ لکھنے بیٹھ جاؤں تو بہت زیادہ ہو جائیں گی باتیں پھر آپ جگہ نہیں دیں گی۔

2۔ عید کی تیاریوں میں سب سے پہلے کپڑے اور جوتے ہوتے تھے۔ میک اپ سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ سوائے مہندی اور چوڑیوں کے۔ اور اچھے اچھے کھانے کہ عید کے دن جو عید ملنے آئے تو اس کی اچھے سے تواضع کرنا کہ مہمان آئیں ان کی خدمت میں کوئی کمی نہ رہے۔

3۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی نے ہر چیز کو متاثر کیا ہے۔ اپنے کپڑے بنوانے کا دل نہیں کرتا۔ لیکن بچوں کی تیاری میں کمی نہیں کرتی۔ کپڑے جوتے بچے اپنی پسند کے لینے جاتے ہیں۔ اپنے پاپا کے ساتھ احمد کو جو کچھ لا دوں، وہ نہیں بولتا۔ عباس تو ماشاء اللہ شان دار کپڑے، جوتے پسند کرتا ہے۔ اور ارسلان بھی۔ عالیان کی چیزیں عباس کو پسند آ جاتی ہیں۔ وہ لے لیتا ہے اور عالیان رونا شروع ہو جاتا ہے۔ اب میرے بچے ہی میری عید ہیں۔ اللہ پاک صحت و تندرستی والی لمبی زندگی دیں آمین اور مؤذن ابھی چھوٹا ہے۔ لیکن نخرے اس کے بھی بہت ہیں۔

4۔ عید کے موقع پر کپڑے لازمی ہونے چاہئیں۔ جوتے اب پہن نہیں سکتی۔ مہندی اور چوڑیاں لازمی ہونی چاہئیں۔ اس مرتبہ مجھے شاہ زیب نے اپنے بیٹے کے ہونے کے کپڑے آٹھویں روزے کو دیے۔ اب عید کے لیے سلواؤں گی۔ ان شاء اللہ۔

5۔ سویاں لازمی بنتی ہیں۔ دیسی سویاں جو گھر میں بناتے ہیں۔ عید کے دن امی صبح پہلے وہ بناتی ہیں۔ پھر چنا چاٹ لازمی بنتی ہے۔

صائمہ گل...... مردان

سروے کے جوابات لیے حاضر خدمت ہوں۔ مزے کی بات بتاتی چلوں کہ مارکیٹ میں ابھی رسالہ آیا نہیں موبائل میں سروے کے سوالات پڑھے سوچا رسالہ تو پتا نہیں کب آئے سروے میں تو شرکت کر لی جائے۔

پہلے تو میری طرف سے آپ کو اور تمام پڑھنے والوں کو ایڈوانس عید مبارک!

1۔ ہمارے لیے تو ہر وہ عید یادگار تھی جس میں امی تھیں ابا تھے، بہنوں سے بڑھ کر پیار کرنے والی بھابھی ماہ گل اور ابا جیسا پیار دینے والے بڑے بھائی جان تھے۔

عید کے دوسرے دن ہم پانچوں بہنیں امی کے گھر اکٹھے ہوتیں۔ بھابیوں کے ساتھ کبھی روایتی نند بھاوج والی چپقلش نہ ہوئی ہمیشہ دوستانہ ماحول رہا۔ بھابیوں پر کام کا بوجھ نہ ہو سب بہنیں مل بانٹ کر کام کرتیں۔ بڑی باجی شمیم امی کے ساتھ دیگر آنے والوں مہمانوں کو کمپنی دیتیں۔ باجی ناہید بڑی بھابھی کے ساتھ مل کر کچن کی چوکی سنبھال لیتیں کہ ماشاء اللہ چار بھائیوں اور پانچ بہنوں کی فیملیز اکٹھی ہوتیں تو چالیس پچاس بندوں کا کھانا بنانا ہوتا تھا۔

شاہین باجی اور تقویم بھابھی مشین لگا لیتیں کہ بچے چھوٹے تھے جلدی کپڑے گندے کر لیتے۔ ساجدہ آپی اور چھوٹی بھابیاں باتوں باتوں میں برتن دھو لیتیں۔ ہمیں چونکہ سب سے چھوٹا اور لاڈلا ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ ”آہم“ تو ہم ینگ پارٹی یعنی ہم عمر بھانجے بھتیجوں کے ساتھ مل کر کیرم اور لڈو کھیلتے۔ امی کے ہاتھ کا بنا شیر خورما اور گرما گرم پوری انجوائے کرتے۔

بڑی عید پر مرد حضرات جن میں بہنوئی عامر بھائی اور ہمارے میاں صاحب پیش پیش ہوتے

بار بی کیو رکھ لیتے۔ رات گئے تک جاگتے نئے پرانے قصے چھیڑتے۔ پھر یوں ہوا کہ وقت نے کروٹ لی۔ ابا پھر بڑے بھائی تیسرے نمبر والی پیاری بھابھی اور جولائی 2024 میں امی نے بھی آنکھیں موندلیں۔

خزاں چھا گئی باغ اجڑ گیا۔
وہ محفلیں وہ رونقیں خواب ہوئیں۔
اب وہ آنکھوں کے شگوفے ہیں نہ چہروں کے گلاب
اک اداسی ہے کہ مٹتی ہی نہیں
اتنی بے رنگ ہے اب رنگ کی خوگر آنکھیں
جیسے اس شہر تمنا سے کوئی ربط نہ تھا جیسے دیکھا تھا سراب
دیکھ لیتا ہوں اگر کوئی شناسا چہرہ
اک لمحے کے لیے دیکھ کر رک جاتا ہوں
سوچتا ہوں کہ بڑھوں اور کوئی بات کروں
مگر اس شخص کی مانوس گریزاں نظریں مجھ کو احساس دلاتی ہیں
کہ اب اس کے لیے میں بھی انجان ہوں
اک بے نام تماشائی ہوں
راہ چلتے ہوئے دوسرے لوگوں کی طرح

2۔میک اپ کی اشیاء کو اسکپ کر کے باقی تمام چیزیں ہی اہم اور ضروری ہیں۔ میاں صاحب اور بچوں کے لیے رمضان سے پہلے پہلے شاپنگ کر لیتی ہوں کہ روزے کی حالت میں بازار کے چکر نہیں لگتے۔ اگر ضرورت ہو تو نئے بیڈ شیٹس پردے وغیرہ لے لیتی ہوں۔ ورنہ نہیں جیسے ابھی کل نیا ٹی سیٹ لیا ہے عید کے لیے۔ باقی پردے اور بیڈ شیٹس وغیرہ نئے رکھے ہیں۔ اس کے علاوہ پودوں کی کانٹ چھانٹ کرنا نئی پھلواری لگانا گملوں کو پینٹ کرنا یہ سب عید کی تیاریوں میں شامل ہیں۔

مہمانوں کی تواضع کی اصل فکر مجھے ہی ہوتی ہے...... کہ ماشاء اللہ بھرا پرا سسرال ہے چھ نندیں ایک جیٹھ ایک دیور ان کے بچے چونکہ بے بے ہمارے ساتھ ہوتی ہیں تو سب بے بے سے ملنے آتے ہیں۔ چائے کولڈ ڈرنک اور کھانے کا مینیو پہلے سے ترتیب دیتی ہوں کہ بعد میں الجھن نہ ہو۔

3۔اس ذات کریم کا بڑا اکرم ہے کہ مہنگائی نے اس معاملے میں کبھی پریشان نہیں کیا کہ ہمیشہ بجٹ دیکھ کر تیاری کی کبھی اسراف نہیں کیا۔ جہاں ایک جوڑے سے کام چل جاتا گنجائش کے باوجود دوسرا نہیں لیا بلکہ اسی رقم سے اپنے آس پاس مستحق لوگوں کا خیال رکھا۔

4۔عید کے لیے ہماری خصوصی تیاری تو یہ ہوتی ہے کہ شاپنگ پر جاؤں تو سب سے پہلے اپنا سوٹ لیتی ہوں ''ہائے ہمارا بچپنا ہاہاہا'' پھر نیٹ میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر خوب صورت ڈیزائن کے ساتھ بنواتی ہوں۔ ساتھ میں میچنگ چوڑیاں، جوتے اور مہندی بھی، بھئی عید تو انعام ہے اللہ کا ہمارے لیے، اسے بھرپور تیاری کے ساتھ خوشی منانا چاہیے۔

بعض بہنیں گھر اور بچوں میں الجھ کر اپنی تیاری گول کر جاتی ہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ذمہ داریاں اپنی جگہ مگر خود کو فراموش نہ کریں۔ تھوڑی سی توجہ اور وقت اپنے لیے بھی نکالا کریں۔

5۔بہت کوشش کے باوجود امی جیسا شیر خورمہ اور پوری نہیں بنا سکتی۔ ہاں میرے ہاتھ کا بنا فروٹ ٹرائفل اور زردہ سب کو بہت پسند ہے۔ اس لیے عید پر یہ دونوں چیزیں لازمی بنتی ہیں۔ ساتھ میں چکن کڑاہی اور بیف پلاؤ بھی عید کے دن ڈائننگ ٹیبل پر اشتہا انگیز خوشبوؤں کے ساتھ جلوہ افروز ہوتی ہے۔

زرینہ خانم لغاری......مظفر گڑھ

1۔خوش گوار عیدیں تو بچپن کی ہوتی تھیں ہم گاؤں میں اپنے دادا دادی، تایا تائی لوگوں کے گھر

جا کر عید کرتے جب تک دادا دادی زندہ تھے، ہم گاؤں جاتے تھے یعنی اپنے ددھیال جاتے وہاں راہٹ چلتے ہوئے دیکھتے تھے، گنے گڑ کا موسم ہوتا تو خوب گنے کھاتے رس پیتے گرم گرم تازہ بنا گڑ کھاتے۔اب وہ عیدیں خواب ہو گئیں۔

2۔عید کی تیاریوں میں سرفہرست تو کپڑوں کا سوچا جاتا ہے مرد حضرات کہتے ہیں کسی دور پرے محلے والے کی شادی کی خبر سن کر خواتین کو کپڑوں کی فکر لگ جاتی ہے۔یہ تو پھر عید ہے سال کے بعد آتی ہے روزے رکھنے تراویح پڑھ کر تو ہم نئے کپڑوں کے حق دار بن جاتے ہیں۔

ویسے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے مسلمانوں عید کے دن بہترین کپڑے پہنو، بعض خواتین کہتی ہیں بھئی ہم کیا کپڑے بنائیں عید تو بچوں کی ہوتی ہے، یہ نظریہ غلط ہے عید سب کی ہوتی ہے ہمیں اللہ کا حکم ماننا فرض بنتا ہے۔اچھے پکوان بھی ماشاءاللہ بنتے ہیں۔

3۔مہنگائی کا پوچھو ہی نہ ہم تنخواہ دار طبقہ تو پس کر رہ گیا ہے تنخواہ تو وہیں رکی ہوئی ہے، مہنگائی پہلے آسمان سے باتیں کرتی تھی اب تو آسمان کو کراس کر گئی ہے شاید ساتویں آسمان تک جانا چاہتی ہے۔اللہ توفیق دیتا ہے تو اہتمام کر ہی لیتے ہیں برانڈڈ کپڑوں کے بجائے کچھ کم قیمت کپڑے خرید لیے جاتے ہیں۔

4۔یہ عید چونکہ میٹھی ہوتی ہے ہر گھر میں میٹھی ڈش بنتی ہے، ہمارے گھر صبح سویرے سویاں بنتی ہیں پھر خاص طور پر دہی بھلے بنائے جاتے ہیں، میٹھا کھانے کے بعد مہمان اور گھر والے دہی بھلے رغبت سے کھاتے ہیں۔بوتلیں چائے وائے تو چلتی ہی ہیں۔

5۔سویاں۔دہی بھلے کے علاوہ مٹن پلاؤ ضرور بنایا جاتا ہے۔کبھی کبھی سویوں کے زردہ کے بجائے چاولوں کا زردہ بھی بنا لیا جاتا ہے پیٹ صاحب کی خدمت جو کرنی ہوتی ہے۔

☆☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ
بساط دل	آمنہ ریاض
درد موسم	راحت جبیں
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان
شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چودھری
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار
پھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار
میں سے عورت	غزالہ عزیز
دل اُسے ڈھونڈ لایا	آسیہ رزاقی
بکھرنا جائیں خواب	آسیہ رزاقی
زخم کو ضد تھی مسیحائی سے	فوزیہ یاسمین
اماوس کا چاند	بشریٰ سعید
رنگ خوشبو ہوا بادل	افشاں آفریدی
درد کے فاصلے	رفیعہ جمیل
آج گگن پر چاند نہیں	رفیعہ جمیل
درد کی منزل	رفیعہ جمیل
میرے دل میرے مسافر	نسیم سحر قریشی
تیری راہ میں رُل گئی	میمونہ خورشید علی
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ۔37۔اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32216361

دستک دستک دستک

شاہین رشید

نازش جہانگیر

”کیا حال ہیں؟“

”الحمدللہ۔“

”رمضان اور عید کیسی گزری؟“

”بہت اچھی اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ ”روزے“ بہت آسان تھے۔ موسم بھی اچھا تھا لہذا پتا نہیں چلا اور رمضان المبارک گزر گیا۔“

”آج کل کیا مصروفیات ہیں ڈراموں کے حوالے سے؟“

”الحمدللہ بہترین...... مجھے لگتا ہے کہ میرے جو دو تین پروجیکٹ مکمل ہیں وہ ایک ساتھ یا تھوڑے گیپ سے آگے پیچھے چلیں گے۔“

”گڈ...... ابھی تو آپ منظر سے بالکل غائب ہیں؟“

”یہی تو...... جب آن ایر آتے ہیں تو سب یہی کہتے ہیں کہ بڑا کام کر رہی ہو ایک کے بعد ایک ڈرامہ آ رہا ہے۔“

”ویسے گیپ دینا چاہیے؟“

”بالکل دینا چاہیے...... تاکہ لوگ انتظار تو کریں اور کسی ڈرامے میں ہمارا نام دیکھ کر یہ ضرور کہیں کہ ”نازش“ ہے تو ڈراما ضرور اچھا ہوگا۔“

”لڑکیاں چاہے ہاؤس ہولڈ ہوں یا شوبز کی۔ سب کو ان کی شادی کی بہت فکر ہوتی ہے۔ ایک جی ٹی وی کے انٹرویو میں آپ نے کہا کہ ابھی شادی نہیں کرنی...... کیوں؟“

”نہیں میں نے یہ نہیں کہا کہ ابھی شادی کیوں کروں۔ میں نے یہ کہا کہ جب ہر کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے وقت مقرر کر رکھا ہے تو میری شادی کے لیے بھی ہوگا۔ میں کیوں فکر میں مبتلا ہو جاؤں کہ ہائے کب ہوگی؟ کیوں نہیں ہو رہی۔ وغیرہ وغیرہ۔“

”بالکل...... لوگوں کی تو عادت ہوتی ہے، دوسروں کے لیے پریشان ہونے کی؟“

”بالکل ٹھیک کہا آپ نے...... اور ایک اور بات بھی میں نے کہی تھی کہ آپ جس سے بھی شادی کریں، اس کے لیے آپ ایک دوسرے کو سمجھیں یہ نہیں کہ پسند آیا یا آئی اور شادی کا فیصلہ کر لیا۔ یہ ساری زندگی کا معاملہ ہوتا ہے سوچ سمجھ کر کریں اور جس کے ساتھ دل مطمئن ہو اس کے ساتھ کریں۔“

”جوڑ آسمانوں پر لکھا جا چکا ہوتا ہے۔ اس کو مانتی ہیں؟“

”بالکل مانتی ہوں۔ جوڑ آسمانوں پر لکھا ہوتا ہے جب نصیب میں ہوگا ہو جائے گی۔“

”چلیں...... شکریہ آپ کا بات کرنے کا۔“

فاطمہ آفندی

”کیا حال ہیں؟“

''اللہ کا شکر ہے۔''

''آج کل نظر نہیں آرہیں؟''

''تھوڑا گیپ دیا ہے۔ مسلسل کام نہیں کر سکتی گھر کی بہت ذمہ داریاں ہیں اور پھر اچھے پروجیکٹس کا بھی انتظار کرتی ہوں۔''

''ہاں ...... ڈرامے جن میں آپ کام کرتی ہیں ، بہت بہترین، حقیقت کے بہت قریب ہوتے ہیں آپ ایک بہترین اداکارہ ہیں؟''

''بہت شکریہ یہ میری ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ کم کام کروں لیکن اچھے سبجیکٹ پہ بنے ڈراموں میں کام کروں۔''

''گھر میں آپ کی والدہ بہترین پرفارمر ہیں۔ ان کو دیکھ کر آپ کو اس فیلڈ میں آنے کا شوق ہوا ہو گا؟''

''سچ بتاؤں ...... اور یہ بات کافی لوگوں کو بتا چکی ہوں کہ مجھے اداکاری کا بالکل بھی شوق نہیں تھا۔ نہ بچپن میں اور نہ ہی بڑے ہو کر...... لیکن میری امی کی خواہش تھی کہ میں اس فیلڈ میں آؤں۔ تو بس انہی کے کہنے پر اس فیلڈ میں آئی۔''

''گڈ...... مشکل تو نہیں ہوئی ہو گی؟ اور کیوں نہیں آنا چاہتی تھیں؟''

''اس لیے کہ مجھے شوق ہی نہیں تھا اس فیلڈ میں آنے کا اور پھر میں تھوڑی شرمیلی بھی تھی اور سوچتی تھی کہ اتنے لوگوں میں کیسے اداکاری کر پاؤں گی۔ اور امی مجھ میں خود اعتمادی لانے کے لیے ہی کہتی تھیں کہ شوبز میں آجاؤ اور مشکل تو کوئی نہیں ہوئی...... اور ایسا نہیں ہے کہ امی کی سفارش سے اس فیلڈ میں آئی بلکہ باقاعدہ آڈیشن دے کر آئی۔''

''پہلا کام کیا کیا؟...... ماڈلنگ یا ڈراما؟''

''ڈرامے کے لیے تو کم عمر تھی۔ البتہ ایک ''ببل گم'' کے کمرشل کے لیے مجھے منتخب کیا گیا۔ میں اور میری بہن جب آڈیشن کے لیے گئے تو میں نے تو بالوں میں بہت سارا تیل لگا کر بالوں کو چپڑ لیا تا کہ وہ ہمیں کہیں کہ...... بی بی کیا اتنا تیل لگا کر آ گئی ہو۔ جاؤ سر کو دھو کر آؤ۔'' مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ کیونکہ انہیں اپنے ببل گم کے لیے ایسی ہی لڑکی کی ضرورت تھی۔ سو میں کامیاب ہو گئی اور دلچسپ بات یہ کہ سین بھی ایک ہی ٹیک میں او کے ہو گیا۔

''پھر جھجک کچھ کم ہوئی؟''

''ہاں ...... کم ہوئی اس طرح کہ جب ایک ہی ٹیک میں سین او کے ہوا اور کمرشل بھی پاپولر ہوا۔ تو اندازہ ہوا کہ یہ کام کچھ بہت زیادہ مشکل نہیں ہے اور پھر سب لوگ بہت اچھے ہیں پیار محبت سے بات کرتے ہیں تو مجھے آفر آئی تو ضرور کروں گی۔''

''اور آج آپ ایک کامیاب فنکارہ ہیں؟''

''الحمد للہ۔''

''کتنے ڈرامے، کتنے کمرشل کر چکی ہو؟''

''کچھ اندازہ نہیں ...... کافی سارے کر چکی ہوں۔''

''چلیں ٹھیک ہے ان شاء اللہ پھر بات کریں گے؟''

''ضرور۔''

☆☆

معروف ڈرامہ نگار

ظفر معراج سے ملاقات

شاہین رشید

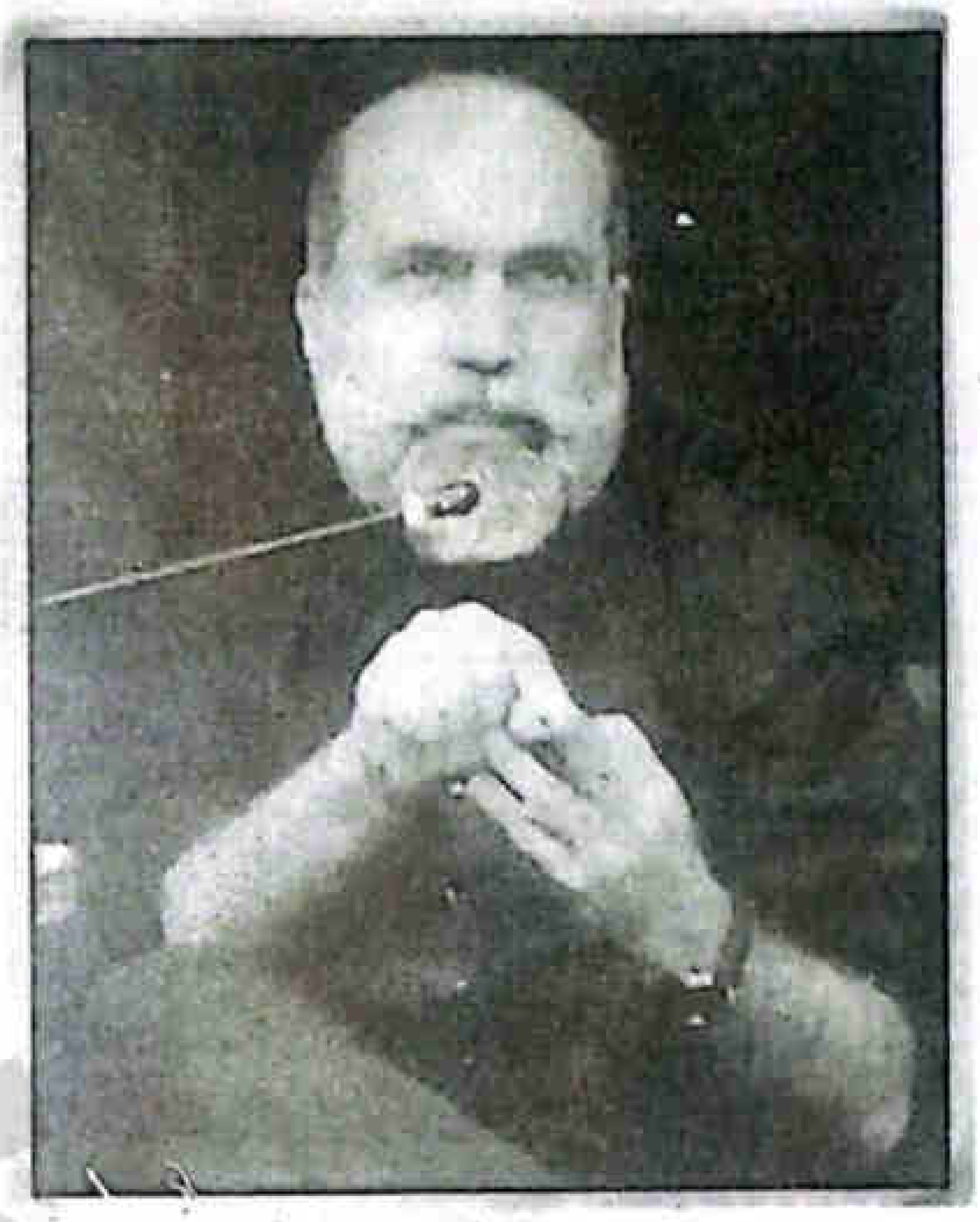

"کابلی پلاؤ۔ دل والی گلی۔ من جوگی" اور اس جیسے بہترین شاہکار کے تخلیق کار ظفر معراج صاحب ہیں ان کا شمار ملک کے بہترین لکھاری اور بہترین ڈرامہ نگار میں ہوتا ہے۔ تقریباً ساٹھ، ستر سیریلز اور سیریز لکھ چکے ہیں ان کی تحریروں میں پاکستان کی ثقافت کا رنگ جھلکتا ہے۔

"کیسے مزاج ہیں؟"

"الحمدللہ۔"

"ڈرامہ لکھنے کا رجحان کیسے ہوا؟"

"لکھنا اور کچھ تخلیق کرنا سب قدرتی ہوتا ہے۔ یہ سیکھا نہیں جا سکتا کہ کسی سے ڈرامہ لکھنا سیکھ لیا۔ البتہ ڈرامے کا اسکرپٹ لکھنا سیکھا جاتا ہے۔ تو بات یہ ہے کہ میں ریڈیو کے لیے اسکرپٹ لکھا کرتا تھا اور افسانہ نگاری کا شوق یا صلاحیت قدرت کی عطا کردہ نعمت تھی اور "روزنامہ جنگ کوئٹہ" میں میرے افسانے بھی شائع ہوا کرتے تھے۔

تو میرے لکھنے کے فن کو "بہرام غوری" ڈاکٹر تاج رئیسانی اور افضل مراد صاحب نے جانچا اور انہیں میرے اندر ایک ڈرامہ رائٹر نظر آیا اور انہوں نے ہی مجھے راغب کیا کہ میں پی ٹی وی کے لیے لکھوں۔ ان دنوں پرائیویٹ چینلز کا کوئی تصور نہیں تھا۔ چنانچہ پی ٹی وی گیا، حوصلہ افزائی ملی تو "براہوی شاعری" "کونٹ" کے پس منظر میں ایک ڈرامہ لکھا جو کہ میرا پہلا ڈرامہ تھا اسے قیوم بیدار صاحب نے پروڈیوس کیا تھا۔

میرا پہلا اردو کھیل جو کہ طویل دورانیے کا کھیل تھا، طارق معراج صاحب نے پروڈیوس کیا اور اس کا نام "امربیل" تھا پھر عطااللہ بلوچ نے بلوچی سیریل "شانتل" کے نام سے لکھوایا جسے بعد میں اردو میں بھی پروڈیوس کیا گیا اور اسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ دوست محمد کشکوری کے لیے سیریل "سفر" لکھا......

ان ہی دنوں زی ٹی وی انڈین چینل کے لیے "اجنبی" لکھا اور یوں لکھنے کا سلسلہ چلتا رہا طارق معراج صاحب کے ساتھ ستارے ملے اور کام بڑھتے ہی چلے گئے۔ مصروفیات بڑھتی ہی چلی گئیں۔ اور پھر 2000ء آ گیا اور میں، حسام قاضی، عطااللہ بلوچ اور فاروق مینگل کو کام کے سلسلے میں کراچی شفٹ ہونا پڑا۔ پرائیویٹ چینلز کا اجراء بھی شروع ہو چکا تھا۔"

"آپ نے غیر ملکی چینلز کے لیے بھی کام کیا، اس کے بارے میں بھی بتایئے؟"

"میں نے انڈین فلم انڈسٹری کے لیے بھی کام

کیا۔ بلکہ اس انڈسٹری کے ساتھ کافی ٹائم منسلک بھی رہا۔ "زی فائیو" کے لیے کام کیا، زی ٹی وی کے لیے "اجنبی" لکھا، جسے طاہر بخاری نے پروڈیوس کیا۔ چینل فور کے لیے جمیل دہلوی کے ساتھ کام کیا۔ زیبا بختیار کے ساتھ مل کر ملائیشا سے ڈرامہ سیریل "مسوری" کیا "مقدس" ڈرامہ پاکستان اور ملائیشا کے تعاون سے کیا جو کہ ہماری ثقافت پر تھا "مراکو" میں بھی کام کیا جبکہ امریکہ میں ایک دوست، رزاق بلوچ کے ساتھ نہ صرف شوز کیے بلکہ کہانیاں بھی ڈیویلپ کیں۔"

"جس طرح گلوکار کو اپنی آواز کو مزید نکھارنے کے لیے ٹریننگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا لکھاری کو بھی ایسی کوئی ضرورت ہوتی ہے؟"

"بالکل ہوتی ہے اور میں نے ملائیشین یونی ورسٹی سے ایکسیلینسی میں اور اسکرپٹ رائٹنگ میں تین ماہ کا کورس کیا ہے۔"

"پھر چینلز آتے گئے 2000ء کے بعد کام تو بڑھتا چلا گیا ہوگا۔ کام میں فرق بھی لگا ہوگا؟"

"بالکل فرق لگا اور بہت نمایاں لگا۔ چینلز آنے کے بعد ڈرامہ پرائیویٹ تو ہوا ساتھ ہی کمرشلائز بھی ہوگیا۔ میں تقریباً دس سال تک پی ٹی وی سے وابستہ رہا۔ پی ٹی وی ڈرامے کا میکنزم بہت طاقت ور ہوا کرتا تھا۔ اور ڈرامہ ایک مربوط نظام سے ہوتا ہوا نکلتا تھا۔ ڈائریکٹر سے لے کر "بوم آپریٹر" تک اس کا حصہ ہوتے تھے، ڈرامہ لمحہ بہ لمحہ مانیٹر ہوا کرتا تھا۔ ایک اداکار دوسرے اداکار کے لیے مطلوبہ کردار کی نشان دہی کرتا تھا۔ کسی بھی سبجیکٹ کا مارکیٹنگ سے تعلق نہیں ہوتا تھا۔ ڈرامہ بنانے کے بعد بیچنے کے لیے پیش کیا جاتا تھا مگر اب...... پہلے سے ہی بیچنے اور سرمایہ کاری کرنے والے کا خیال رکھا جاتا ہے فوری طور پر مارکیٹ میں ان ہونے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ پرائیویٹ پروڈکشنز کے طور پر بھی ڈرامے کا اعتبار اور مقصد حاصل ہوسکتا ہے، اگر ایک مربوط نظام اپنا لیا جائے تو اس طرح اس کی اہمیت اور وقعت

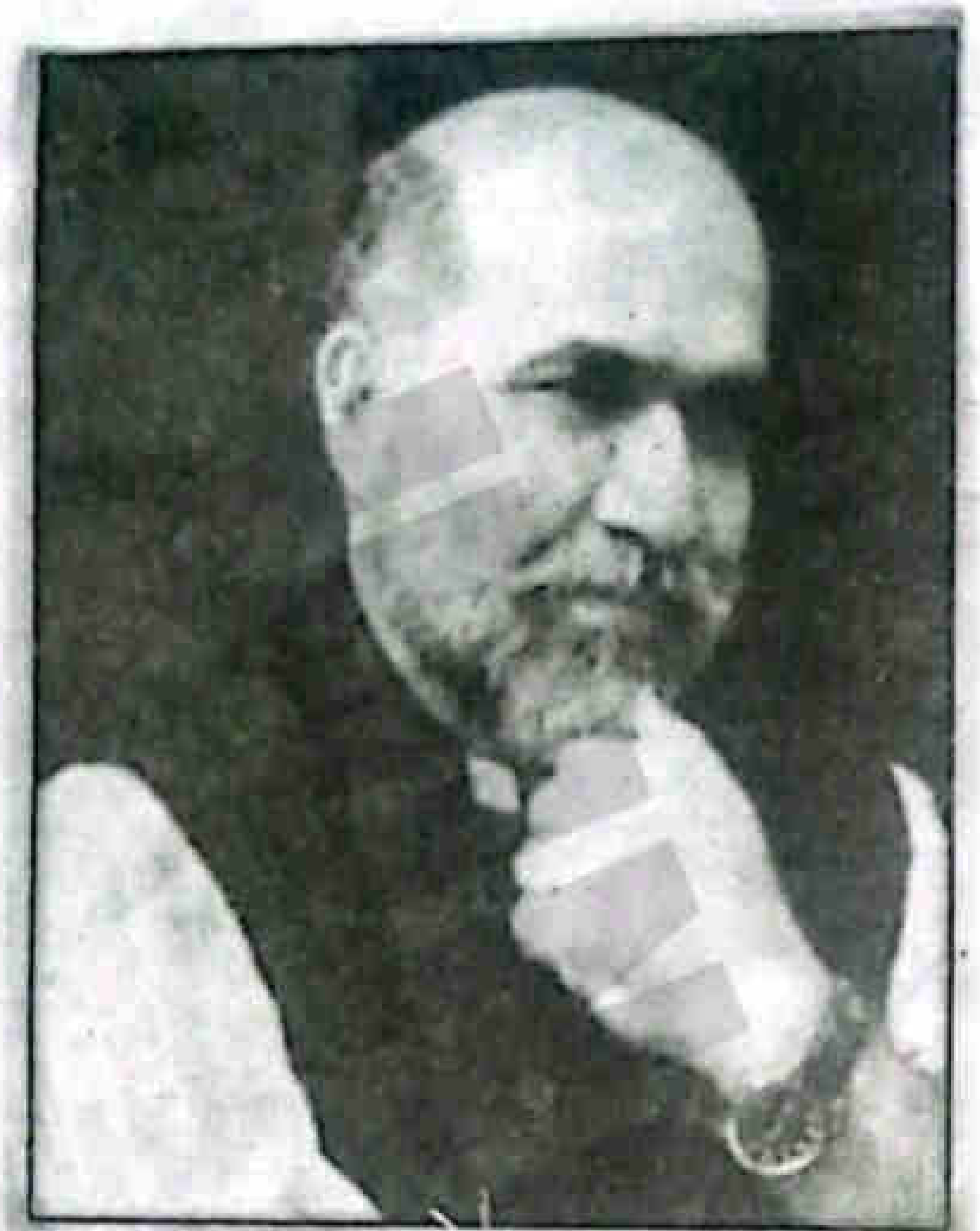

بڑھے گی کم نہیں ہوگی۔"

"آپ کی تحریر انفرادیت لیے ہوئے ہوتی ہے کیا کہیں گے اپنی لکھائی کے بارے میں؟"

"میں اپنے ڈراموں کے بارے میں یہ ضرور کہوں گا کہ میں انسان کے بارے میں زیادہ سوچتا ہوں اور اسی لیے میں ان کے لیے لکھتا بھی ہوں۔ ڈرامہ سیریل "شاٹل" ایک خانہ بدوش کی کہانی بھی اور میرا تعلق بھی خانہ بدوش سے ہے۔ اسی طرح "گوادر" کے مسائل، مشکلات اور مچھیروں کے شب و روز پر ایک سیریل "دروازہ" لکھا ایک سیریل "لیاری ایکسپریس" میں گدھا گاڑی ریس کے لوگوں پر لکھا "کاروکاری" کے موضوع پر لکھا اور اس میں عورت کی بے بسی اور بے توقیری دکھائی۔ "کابلی پلاؤ" میں چاروں صوبوں کی منظر کشی کی میں نے۔ دراصل میں نے خود کو کسی زبان اور کلچر کا پابند نہیں کیا، مجھے کھل کر لکھنے میں مزہ آتا ہے تاکہ میری تحریر کا ہر رنگ نمایاں ہو شاید اسی لیے میری تحریروں کو پسند کیا جاتا ہے۔

مجھ سے اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ اچھی تحریر لکھنے کے لیے کیا کرنا ضروری ہے۔ تو میں یہی کہتا ہوں کہ مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے۔ محنت کو اپنا شعار بنا

لیں۔ آپ کو بتاؤں کہ زمانہ طالب علمی میں اپنے بزرگوں سے کہانیاں کہنے اور کہانیاں لکھنے کا ہنر سیکھا ......نامور رائٹرز کو بہت پڑھا اور بچپن سے پڑھا۔ ان میں ''چیخوف۔ ٹالسٹائی۔ دوستوفیسکی'' میری بنیادی تربیت میں روسی لٹریچر اور دیگر کلاسیکل کتب کا بہت عمل دخل ہے۔

اردو رائٹرز میں ''منٹو۔ کرشن چندر'' اور ''بیدی'' کو بہت پڑھا ہے......ایک بات اور کہ اچھا لکھنے کے لیے عام آدمی سے قربت بہت ضروری ہے۔''

''آپ کے ڈرامہ سیریل ''کابلی پلاؤ'' اگرچہ نومولود چینل سے پیش کیا گیا مگر شہرت بہت ملی...... اس کی وجہ؟''

''کہانی اچھی ہو، پروڈکشن اور ڈائریکشن اچھی ہو تو کہانی کہیں بھی ہو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کروالیتی ہے۔ ''کابلی پلاؤ'' نام میں انفرادیت پھر یہ کہانی بتیس سال (تقریباً) پرانی ہے لیکن میرے ذہن میں زندہ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں کچھ دنوں کے لیے تبلیغی جماعت کے ساتھ گیا تھا تو ایک شخص نے بھرے ہجوم میں اپنی ''بیوہ'' بہن کے لیے رشتے کا مطالبہ کیا تھا۔ بس وہ کہانی میرے ذہن و دماغ میں پکتی بھی رہی اور زندہ بھی رہی۔ موقع ملا تو لکھ دیا۔ اندازہ نہیں تھا کہ اتنی شہرت ملے گی۔''

''آپ صاحب کتاب بھی ہیں؟''

''بالکل ہوں......ڈراموں پر مبنی کتاب بھی زیر طبع ہے۔ ایک ناول بھی لکھ رہا ہوں اور میں ''براہوی'' زبان میں لکھے گئے افسانوں کی کتاب بھی مارکیٹ میں لانا چاہتا ہوں۔''

''پرفارمنگ آرٹ کے لیے ''ناپا'' نے جنم لیا۔ جبکہ پی ٹی وی تو خود ایک اکیڈمی تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے دیگر اداروں کی ضرورت بھی کیا؟''

''پرفارمنگ آرٹ کے لیے تو جتنے بھی ادارے ہوں اچھا ہے کیونکہ ہمارے ملک میں ٹیلنٹ بہت ہے اور ٹیلنٹ کو نکھارنے کے لیے اداروں کا ہونا بہت ضروری ہے۔

جہاں تک پی ٹی وی کی بات ہے تو ہم نے دیگر اداروں کی طرح اس ادارے کو بھی تباہ و برباد کر دیا ہے، ہمارا ہر اچھا ادارہ سیاست کا شکار ہو جاتا ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی کو جس بھونڈے انداز میں تباہ و برباد کیا گیا ہے یہ ایک طرح سے قومی امانت میں خیانت ہے پی ٹی وی نے ایک زمانے میں ڈراموں، موسیقی، مذاکروں اور مشاعروں کے ذریعے عوام میں قربت اور شعور اجاگر کرنے کی کوشش کی اور عوام کو ان کے مسائل سے آگاہ کیا لوگ ایک دوسرے کو سمجھ رہے تھے۔

پی ٹی وی کے خوب صورت پرائم ٹائم نے عوام کو وقت کا پابند کر دیا تھا...... آپ دیکھیں دوسرے ممالک کی فلم انڈسٹری اور ڈرامہ انڈسٹری کتنی ترقی کر رہی ہے اور ہم کہاں کھڑے ہیں۔ ہمارے یہاں تو فلم اور سینما پر بھی زوال آیا ہوا ہے اگرچہ حالات پہلے سے بہتر ہیں لیکن اتنے نہیں کہ فخر یہ ذکر کیا جا سکے۔ میرے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے مگر اس کا فائدہ نہیں ہے۔''

''آپ نے حکومت پاکستان یا حکومت وقت سے کبھی بات کی موقع ملا آپ کو؟''

''بالکل ملا...... ہم نے مختلف فورمز کے تحت وزرائے اعظم سمیت دیگر ارباب اختیار سے درخواست کی ہے کہ اس صورت حال کا جائزہ لیں اور اس ادارے کو تباہ و برباد کرنے والوں کے عزائم معلوم کریں۔ پر دیکھیں کتنی شنوائی ہوتی ہے۔''

''چلیں جی باتیں تو بہت ہو گئیں......اب کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟''

''میں اگست 1968ء میں کوئٹہ میں پیدا ہوا۔ ہمارا آبائی علاقہ ''پنج پائی'' ہے دادا سید محمد مراد زمین دار تھے میرے نانا حاجی نیک محمد علیزئی قبائلی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کے عالم بھی تھے، وہ حافظ، سعدی اور رومی کو پڑھا کرتے تھے جبکہ نانی کے بھائی حاجی خوشی محمد فارسی اور براہوی کے شاعر

تھے۔انہوں نے قصیدہ بردہ شریف کا براہوی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔

آباؤاجداد زمین دار تھے۔ لیکن میرے والد صاحب سید محمد معراج کو گاڑی چلانے کا بہت شوق تھا اور وہ اسی شوق کی خاطر ملک بھر میں گاڑی دوڑا۔تے پھرے۔کوئٹہ اور مستونگ کے درمیان ایک بس چلا کرتی تھی وہ اس بس کے ڈرائیور بننے پر بہت خوش تھے۔

خیر......مستونگ میں نانی نے پرورش کی، گرلز پرائمری اسکول (کوایجوکیشن) کلی شیخاں میں داخلہ ہوا......گو کہ لڑکوں کے اسکول بھی تھے مگر نانی کی خواہش تھی کہ میں کوایجوکیشن میں تعلیم حاصل کروں......میں کلاس فورتھ میں تھا کہ نانی کی طبیعت خراب ہونے کے سبب ہمیں کوئٹہ شفٹ ہونا پڑا۔وہاں ''سر کی کلاں'' پرائمری اسکول میں داخلہ لیا جو ہمارے گھر سے چند میل دور ہی کوئی دو تین میل دور تھا اور میں پیدل آیا جایا کرتا تھا۔اس اسکول میں بہت شفیق اور بہت ہی قابل اساتذہ تھے۔ میٹرک میں نے ہیلپرز اسکول سیٹلائیٹ ٹاؤن لاہور سے کیا۔جس کے پرنسپل کراچی سے تعلق رکھنے والے رشید الحق تھے۔فیڈرل گورنمنٹ کالج سے ایف ایس سی کیا۔اور پھر بلوچستان انجینئرنگ یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی ڈگری لی۔

ہم چار بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ چھوٹا بھائی منظور واپڈا میں ''آراو'' آفس میں ہے۔جاوید ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ لسبیلہ یونی ورسٹی میں ہے جبکہ طارق بھائی الیکٹرونک انجینئر ہیں اور پولی ٹیکنیک کالج میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔

شادی بھی ہوئی الحمدللہ......اور ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں ماشاء اللہ سے۔ بیٹے کا نام ''مراد معراج'' ہے پھر ''دعا معراج'' ہے پھر مہر وبیا معراج'' ہےاور آخری آنسہ معراج ہے۔

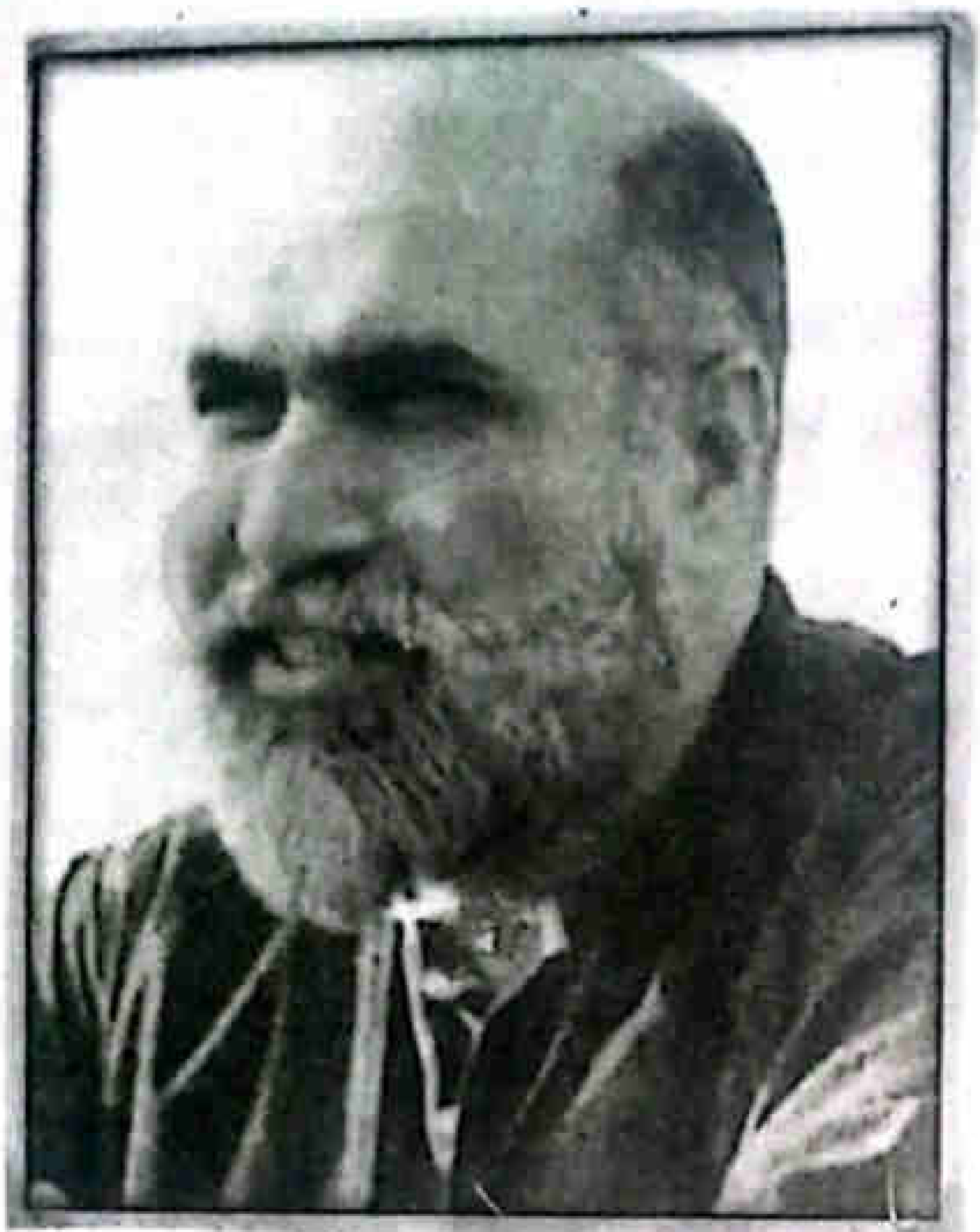

میرے بچوں میں بیٹے کو گائیکی اور اداکاری کا شوق ہے۔''آنسہ'' باقاعدہ لکھتی ہے۔دعا کو مطالعہ کا زیادہ شوق ہے جبکہ مہر وبیا اسٹوری ٹیلنگ میں مہارت رکھتی ہے۔''

''گھومنے پھرنے کا شوق ہے؟ آپ نے ایک انٹرویو میں کہا کہ مجھے ''آوارگی'' کا شوق ہے۔کچھ بتائیں گے اس بارے میں؟''

''بالکل میں نے کہا تھا کہ مجھے آوارگی کا شوق ہے۔میں اپنے ملک کے علاوہ امریکہ، روس تھائی لینڈ، سعودی عرب، مراکو، ملائیشیا، انڈیا، سنگاپور وغیرہ وغیرہ گھوم چکا ہوں......مجھے پہاڑوں پر چڑھنا، ریگستان اور سمندروں کے نظارے دیکھنا بہت پسند ہے۔''

''سنا ہے آپ نے اداکاری بھی کی، مطلب کیمرے کے آگے۔آف کیمرا تو ہر کوئی اداکار ہوتا ہے؟''

''فنون لطیفہ سے وابستہ ہر شخص اداکار ہوتا ہے۔ایک اچھا ڈائریکٹر اور ایک اچھا رائٹر اپنے اندر کے چھپے اداکار کو ہی کیمرے میں اور تحریر میں لاتے ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی ہم نے ظفر معراج صاحب سے شکریہ کے ساتھ اجازت چاہی۔

☆☆

خط آپ کے

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:shuaa@khawateendigest.com

رضوانہ وقاص نے کرالاں ہری پور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

شعاع ملا 4 تاریخ جمعے والے دن۔ ہنستی مسکراتی ماڈل بہت اچھی لگی۔ میں بھی اسی طرح تیار ہوئی ہوں صرف سرخی نہیں لگائی۔ "حمد و نعت" پڑھی، "پیارے نبی کی پیاری باتیں" بہت ہی اچھی اور بہت ہی پیاری، انہیں پڑھ کر بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ "تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔" زیڈ خان کا پڑھا۔ پتا ہے۔ بس اپنے اپنے دکھ اپنی اپنی پریشانیاں۔ اللہ پاک سے دعا ہے۔ سب کی مشکلیں آسان کریں (آمین)

"روشن ہے صبح عید" سب رائٹر کو پڑھا اور سب کو پڑھ کر اچھا لگا۔ دستک میں عروج بنت ارسلان کو پڑھا ضرور ہے۔ لیکن ڈرامے کا نہیں پتا، نہیں دیکھا۔ "خط آپ کے" نہ پڑھوں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

میں نے خط لکھا تھا لیکن اس دفعہ پتا نہیں لیٹ ہو گیا یا کیا مسئلہ ہوا ہے۔ نہیں آیا میرا خط جن جن کے مجھے فون آئے تھے سب کا لکھا تھا۔ چلیں اب اس شمارے کے ذریعے ہی میری بہنیں مجھ سے فون پر بات کر رہی ہیں۔ اچھا لگتا ہے اور اب میرا دل کرتا ہے زندگی میں ایک بار ان سے ملاقات بھی ہو جائے (آمین)

مجھے فون زیادہ ان بہنوں، دوستوں اور آنٹیوں کے آئے جو پرچے پڑھتی ہیں۔ لیکن خط نہیں لکھتیں۔ سب کا بہت بہت شکریہ آپ سب نے مجھ سے بات کی۔ اچھا لگا۔ ایک دو بہنوں نے گوشی جمال کا پوچھا اور اگر وہ نمبر دیں تو بات ہو جائے اور ثمینہ اکرام کا کہ وہ خط لکھتی تھیں اب نہیں لکھتیں۔ اور مطیرہ کا پوچھا ہے ضرور بتانا ہے۔ شکریہ۔ اور میرے لیے دعا کرتی ہیں شکریہ جی سب کا دل سے۔ ام یلماز فورٹ عباس بھاول نگر سے آپ تک اگر میرا پیغام پہنچے تو مجھ سے ضرور رابطہ کریں۔ شکریہ میں نے فون نمبر اسی لیے دیا ہے۔ میری پیاری بہنیں۔ اتنی چاہ کرتی ہیں تو مجھ سے رابطہ کریں۔ "عید کے رنگ محبتوں کے سنگ" سب کا پڑھا۔ بہت اچھا لکھا سب نے۔ اب پہلے والی عیدیں کہاں۔ عیدیں تو بچپن کی ہوا کرتی تھیں۔ میں نے بھی لکھا تھا لیکن مجھے جگہ ہی نہیں ملی۔

"دکھاوے کی چوٹ" پلوشہ دوسروں کی چیزیں اسٹیٹس پر لگی ہوئی دیکھ کر بولتی تھی۔ میری عید اچھی نہیں آئی۔ لیکن شادی کے بعد شوہر پیار کرنے والا اور سسرال اتنی اچھی مل گئی۔ "واپسی" پڑھا جو لڑکیاں اپنی من مانی کرتی ہیں۔ والدین کا دل دکھاتی ہیں۔ وہ کیسے خوش رہ سکتی ہیں نور نے بھی ایسا ہی کیا، اب در در کی ٹھوکریں کھا رہی ہے۔

"ماء الملوک" نگہت آنٹی پلیز پلیز آزین کی غلط فہمی دور کریں۔ "رشتے سنبھال لینا۔" عروہ کی دادی کا عروہ کا ساتھ دینا اچھا لگا۔ "چاند رات" پڑھا فرخندہ بیگم جیسی بھی عورتیں ہوتی ہیں۔ جو اتنے اچھے رشتے کا انکار کر کے پھر کہتی ہیں کوئی اچھا رشتہ آ جائے۔

راشدہ بیگم ٹھیک ہے غریب لوگوں کو زکوٰۃ دینے آئی تھی تو غریب سمجھ کر نہ سہی رشتہ دار ہی سمجھ کر رضیہ کے بچوں کو تھوڑے پیسے دے جاتی، بچے خوش ہو جاتے۔ "عید تم سنگ" ماہی کی نند پر مجھے بہت غصہ آیا۔ جو اتنی اچھی بھابھی

ملی۔ اس کی قدر ہی نہیں کی۔ ہوتا ہے جو بھائی اور بھابھی اچھے ہوں ان کی کوئی تعریف نہیں کرتا۔ ماہی بھی میری طرح معصوم بھولی بھالی پھر ایسی بھابھی ہو، نند ہو باتیں سنی پڑتی ہیں۔ کیا کیا جائے۔ جواد کو بھی اب بیوی کی قدر آ ہی گئی۔ پیار ملا ہی دیا۔ بہنیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔ بھائیوں سے پیار کرنے والی اور بھائی بہنوں سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر بدگمان ہو جاتے ہیں۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ بہن ہم بھائیوں سے کتنا پیار کرتی ہیں۔ ''باتوں سے خوشبو آئے۔'' ساری باتوں سے خوشبو آ رہی تھی۔ ''اس ماہ کی مسکراہٹیں'' سب کو ہی پڑھ کر ہنسی آئی۔

جتنا پڑھا اس پر تبصرہ کر دیا کیونکہ میرے شوہر ٹورنامنٹ کروا رہے ہیں فون پر میچ بھی دیکھتی ہوں اللہ کرے خیریت سے ہو جائے ٹورنامنٹ (آمین)

پیاری رضوانہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا خط اور سروے اس وقت موصول ہوا، جب پرچا مکمل ہو کر بازار میں آ چکا تھا۔ اس لیے شامل نہ ہو سکا۔ کوئی بات نہیں ۔سروے کا بقیہ حصہ اس ماہ شائع ہے۔ اس میں آپ کا سروے بھی شامل ہے۔ اب عیدالاضحیٰ کے لیے آپ جلد سروے کے جواب بھجوائیں۔ تبصرے کا شکریہ، اللہ تعالیٰ آپ کے شوہر کے ٹورنامنٹ کو کامیابی عطا فرمائے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

فرخندہ سلیم ملتان سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

نخرے سے بیٹھی خوب صورت لباس میں ماڈل اور سرورق بہت ہی پیارا لگا جو عید کی مناسبت سے تھا اور واقعی شعاع خواتین کے سرورق اس بار تو عید کی خوشیوں کو دو کیا چار بالا کر رہے تھے۔

دھوپ دریچہ نیا خوب صورت ناول ہے جو شروع سے ہی پسند کیا جا رہا ہے اور میں بھی کرتی ہوں۔

ہالہ کا کردار بہت اچھا ہے وہیں حارث بھی مگر ایک التجا کہ کہانی میں مریم عزیز کہیں تو ہنسی مذاق یا شوخی ڈالیں کہ قسط وار ناول میں یہ ضروری ہوتا ہے تا کہ بیلنس رہے۔

نگہت سیما کی کہانی پسند ہے اور دیکھتے ہیں کہ زلل کس کے نام کی مہندی اپنے ہاتھوں میں لگائے گی زین یا شایان۔ مرتضیٰ شیطان کا بھتیجا ہے۔ خیر ہے اور سحرش میری ہم زاد ہے اور کہانی میں شوخی، اپنا پن اور دلچسپی سپنس سب ہے جیسے کسی مٹھائی میں سارے لوازمات ہوتے ہیں۔

عاصمہ فرحین کا افسانہ عید کی مناسبت سے اہم موضوع پر تھا جو عرق ریزی سے لکھا ہوا تھا اور واقعی منگنی شدہ لڑکیوں کو عیدی کا بہت ارمان ہوتا ہے مگر نمود و نمائش سے بھی بچنا چاہیے ہاں مگر مان بھی خاص چیز ہوتی ہے ایک خوشی۔

ام ہانی کی طویل کہانی کا پلاٹ اچھا لگا اور انداز بھی بہترین تھا، ہیرو کی ساس جو اس کی نیچر تھیں ان کا کردار بہت پسند آیا۔ ہر کہانی ہی عید نمبر کی وجہ سے خاص تھی۔

حنا بشریٰ کا افسانہ واپسی، ہمیشہ کی طرح سبق آموز تھا جس میں نور جیسی لڑکیوں کے لیے گہرا سبق تھا اور ایسی تحریریں تعمیری انداز میں قارئین کی مثبت ذہن سازی کرتی ہیں۔

حبیبہ شیراز کا ناول عید نمبر میں ٹاپ پر تھا جو شوخی سے بھرپور اپنے پن کی کہانی تھی۔ ماہی و شاہ ویز کی نوک جھوک اور رشتوں کے اپنے پن کی کہانی نے شعاع کا لطف دوبالا کیا۔ ویسے نئی لکھاری بہت اچھا اور خوب لکھ رہی ہیں اور بلاشبہ ساری آفس والیاں بھی خوب محنت سے ڈائجسٹ تیار کرتی ہیں۔

رشتے سنبھال کر رکھنا افسانہ سب سے زیادہ افسانوں میں پسند آیا وجہ اتنا اچھا پلاٹ تھا۔ دل کرے ہے ڈائجسٹ ان باؤلے مردوں کے منہ پر ماروں جو ڈائجسٹوں کو خراب سمجھتے ہیں پورا نہیں صرف افسانے ہی پڑھ لیں تو ان کو شاید عقل آ جائے کہ کتنی اچھی اصلاحی کہانیاں ہوتی ہیں جو ہم قارئین پڑھ کر ان مردوں کی زندگی کو سیٹ کرتی ہیں۔

ناولٹ چاند رات دلچسپی سے بھرپور تھا اور میری ہم نام فرخندہ ذرا کہانی میں باؤلی بنی ہوئی تھی جسے آخر میں عقل آئی شکر ہے۔ ریحانہ وقاص نے مختصر مگر پراثر افسانے میں گہرا سبق دیا جو پسند آیا۔

صائمہ نور کا گھریلو سا ناولٹ پڑھ کر سکون سا ہوا، صائمہ تمہیں طویل کہانی بھی لکھنی چاہیے۔

حمیرا شفیع تو ہمیشہ سے ہی عید اور سال نو کی مناسبت سے اچھا ہی لکھتی ہیں مگر نہ جانے کیوں کچھ یکسانیت ہو جاوے ہے یا ہم کا بس لگے ہے۔

معذرت اس بار تبصرہ ابلے ہوئے پھیکے چاولوں کی طرح ہے۔ بس اس بار موڈ ایسا ہی ہے ہاں سارے سلسلے عید نمبر کے پانچ کلو کی مٹھائی کے بڑے سائز کے گھر آئے اور اچانک ٹوکرے کی طرح لذیذ اور مزے دار تھے جنہیں پڑھ کر اچھا لگا۔ اگلے ماہ ذرا تیاری سے آؤں گی جوش وخروش سے۔

فرخندہ جی! آپ کا خیال غلط ہے تبصرہ پھیکے ابلے چاولوں کی طرح نہیں بلکہ چٹ پٹی مکس چاٹ کی طرح ہے۔ آپ کے تبصرے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے پڑھ کر لگتا ہے کہ دل سے اور پوری سچائی سے لکھا گیا ہے۔ کہانیوں پر آپ کی رائے بھی درست ہوتی ہے اور بڑی اپنائیت کا احساس ہے۔

عاصمہ اخلاق سعودی عرب سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

سب سے پہلے معذرت میں پچھلی بار اپنا نام لکھنا بھول گئی۔ اپریل کا شمارہ حسب سابق شان دار پہلی شعاع میں مدیرہ جی نے خوشی کا مفہوم اعلا لفظوں میں بیان کیا ،غزہ کے مسلمانوں کے لیے دل سے دعا گو ہوں۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح خوب صورت اور معلوماتی تھیں ،سروے عید کے رنگ محبتوں کے سنگ میں سب کے جوابات پسند آئے پر زینب نور کے جوابات کمال کے تھے۔

عاصمہ فرحین کا افسانہ "دکھاوے کی چوٹ" بڑی زور کی لگی۔ مادی چیزوں کی جگہ خالص رویوں کو دیکھنا چاہیے "واپسی" سبق آموز تحریر، والدین کا دل دکھا کے انسان کبھی خوش نہیں رہ سکتا، "رشتے سنبھال لینا" رشتے سنبھالنے کے لیے کوئی ایک نرمی دکھائے تو دوسرے کو خود بخود اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس ہو جاتا ہے بہت اچھی تحریر تھی۔ آج کے دور میں سبق کی اشد ضروری ہے۔ ویلڈن قرۃ العین جی، ریحانہ وقاص کا افسانہ مختصر مگر پر اثر۔ زکوٰۃ کے سب سے پہلے دار حق دار غریب رشتہ دار ہیں حمیرا شفیع کی تحریر زرنم بہت مزے کی تھی ہلکی پھلکی محبت کی کہانی رابیل نے سمجھ داری دکھا کر دو دلوں کو ملا دیا۔

ناولٹ "عید تم سنگ" بہت خوب صائمہ نور نے بہت اچھا لکھا۔ شکر ہے جواد کو عقل آ گئی۔ بوجھ بانٹ لیتے ہیں کافی منفرد کہانی تھی۔

پیاری عاصمہ! آپ کے افسانے ابھی پڑھے نہیں گئے۔ کوشش کریں گے جلد پڑھ کر آپ کو بتا دیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

انمول دعا عقیل نے کوٹ ادو سے لکھا ہے

ماڈل خوب صورت سا سوٹ پہنے پیاری لگ رہی تھی۔ عید کے حوالے سے بہترین ٹائٹل تھا۔ پہلی شعاع پڑھا اس کے بعد حمد و نعت پڑھی اور ایمان تازہ ہوا۔ اس کے بعد فوراً خط آپ کے پڑھے مگر اپنا خط نہ پا کر افسوس ہوا۔ بہت زیادہ۔ پہلا خط لکھا اور وہ ہی شائع نہ ہوا۔ دل تو ٹوٹ گیا ایک بار پھر سے امید جاگی کہ شاید اس بار شائع ہو جائے اس بار میں نے شعاع کے ساتھ ساتھ سلسلے میں بھی شرکت کی ہے۔ مجھے لکھنے کا بہت شوق ہے اس لیے ایک افسانہ لکھ لیا۔ ویسے میری دوست کہتی ہے کہ افسانہ لکھنے کے بھی پیسے ملتے ہیں کیا یہ سچ ہے؟ اب چلتے ہیں رسالے کی طرف تو زیڈ خان کا ناتا بہت پسند آیا۔ عید ملن ناول ٹاپ پر رہا۔ ماہی اور شاہ ویز کی اسٹوری اچھی لگی۔ ام ہانی کا ناول بھی زبردست تھا۔ ناولٹ چاندرات خوب صورت تحریر تھی۔ عید تم سنگ ، وہی ڈراموں والی اسٹوری نند بھاوج کی۔ افسانوں میں عاصمہ فرحین کا دکھاوے کی چوٹ پہلے نمبر پر رہا۔ زکوٰۃ سبق آموز افسانہ تھا جب میں نے اس کی رائٹر کا نام دیکھا تو مجھے لگا کہ یہ افسانہ رضوانہ وقاص ہری پور نے لکھا مگر یہ ریحانہ وقاص کا تھا۔ باقی افسانے بھی اچھے لگے خط آپ کے میں رضوانہ وقاص ہری پور کی کمی محسوس ہوئی بہت نیک دل ہیں۔ شکریہ باجی رضوانہ۔

ہمیں اگست 2024 اور ستمبر 2024 کے شعاع مل گئے بہت بہت شکریہ۔

شعاع کی جتنی تعریف کروں کم ہے سارا رسالہ عید

کے حوالے سے مزے دار تھا۔ آخر میں شاہین رشید سے درخواست ہے کہ "من مست ملنگ" ڈرامے کی رائٹر "نوراں مخدوم" اور اس ڈرامہ کی ہیروئن "سحر ہاشمی" کا انٹرویو لیں پلیز پلیز۔

انمول دعا! آپ کا خط تاخیر سے موصول ہونے کے باعث شامل نہ ہو سکا لیکن آپ کی یہ بات اچھی لگی کہ آپ نے ہمت نہیں ہاری اور ہمیں دوبارہ خط لکھا۔ آپ کی دوست نے درست کہا ہے جو کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ ان کا اعزازیہ پیش کیا جاتا ہے۔

زرینہ خانم لغاری نے مظفر گڑھ سے لکھا ہے

اپریل کا شمارہ ملا۔ سادہ سی تیار ہوئی ماڈل پیاری لگی فہرست پر نظر ڈالی دھوپ دریچہ کو پہلے کنگھالا کہانی تھوڑی سی آگے بڑھی کومل کی خوش فہمیوں پر ہنسی آئی حارث تو زیمل کو ملے گا کومل صاحبہ خوش ہولیں۔ ضامن کا کردار پسند آیا۔ پھپھو سے اور کزن سے پیار کرنے والا میرا بھتیجا محمد خان بھی ایسا نیک دل ہے اپنی پھپھوؤں سے ایسے ہی چاہت کرتا ہے۔ آپ بہنوں نے زیڈ خان کا ناتا پڑھا کیسا لگا اس دفعہ تو تمام شمارہ بے حد دل چسپ کہانیوں سے بھرا ہوا تھا۔ کبھی کبھی کسی شمارے میں کوئی کہانی ایسی نکل آتی ہے جو سر کے اوپر سے گزر جاتی ہے کبھی غیر دل چسپ کہانی بھی ہوتی ہے۔ پڑھ کر وقت کا زیاں لگتا ہے لیکن اپریل کا شمارہ لاجواب تھا۔ دکھاوے کی چوٹ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور تھے۔ اللہ بچائے۔

ام ہانی بوجھ بانٹ لیتے ہیں بہت اچھی کہانی تھی ویری گڈ۔

آج کل بھی دنیا میں ایسے مخلص اور احسان کرنے والوں کو یاد کرنے والے جیسے لوگ ہوتے ہیں۔ عشرت کا کردار بہت پسند آیا فجر ڈاکٹر بننا چاہتی تھی لیکن ہر ایک کی روزی رزق کا وسیلہ رب کریم بناتا ہے۔ اس کا رزق ایسے ہی لکھا تھا۔

سروے بہت خوب صورت تھا بہنوں کے جواب دل چسپ تھے میرا سروے آپ نے گول کر دیا۔ زیادتی کی۔ عید ملن ایک اور خوب صورت کہانی تھی پڑھ کر مزا آگیا یہ پتا تو ہوتا ہے کہ کچھ ہو جائے ہیرو ہیروئن مل کر رہیں گے لیکن تجسس ہوتا ہے اتنی مخالفت کے بعد ملن کیسے ہوگا، ماہ الملوک اب کم بخت اقبال پچھتا رہا ہے اب کیا فائدہ جب نہ ماسٹر صاحب رہے نہ زینب النساء زندہ ہے سزا تو اسے مل گئی ٹانگ ٹوٹ گئی۔

زین زل کو کسی طریقے سے ملا دیں ہمیں پتا ہوتا ہے یہ فرضی کہانیاں اور فرضی کردار ہیں لیکن ہم ان کے دکھ سکھ میں ایسے انوالو ہو جاتے ہیں کہ ہماری جان پہ بن جاتی ہے۔ رشتے سنبھال رکھنا بہترین کہانی تھی بعض بندے ہوتے ہیں ردا کی طرح اخلاق سے عاری اور دولت سے مغرور ہونے والے۔

چاند رات لاجواب کہانی تھی آخر حمیر اور زمنامل گئے ان کو قدرت نے ملا دیا خوشی ہے کہ حسیب بھی لوٹ آیا۔ زکوٰۃ اف چھوٹی سی پیاری سی سبق آموز کہانی ہماری بہن ریحانہ وقاص نے لکھی ہے بہت پسند آئی۔ ننھی سی کہانی میں بہت بڑا سبق تھا۔

اس دفعہ سروے میں خطوں میں رضوانہ وقاص، نوشی مغل، گوشی،، اقصیٰ شہزاد سب غائب تھیں کیا وجہ ہے۔ میری غیر حاضری کو جو بہنیں مس کرتی ہیں ان کا بہت شکریہ۔ ہاں رضوانہ وقاص بتائیں یہ آپ کے گاؤں کا نام کرلاں والا کیوں ہے۔ کرلی تو ہم چھپکلی کو کہتے ہیں کیا وہاں کرلیاں بہت ہیں۔ جواب ضرور دیں۔

عید تم سنگ بہت پیاری گھریلو کہانی تھی بعض بندے ہوتے ہیں انہیں گھر کا سکون راس نہیں آتا وہ فساد ہی ڈالے رکھتی ہیں۔ ان کے لیے کہا جاتا ہے ان کو رونے والی آواز پر نیند آتی ہے۔

عاصمہ آپا بھی — ایسی عورت تھیں بعض نندیں چاہتی ہیں سسرال کے ساتھ ساتھ میکے میں بھی ہمارا ہولڈ ہو۔ جواد جیسے شوہر بھی ناقابل برداشت ہوتے ہیں۔ بہن کی لگائی بجھائی میں آکر اتنی سگھڑ پیاری بیوی سے بدظن ہونے میں دو منٹ نہیں لگائے۔ بس ماہی نے اپنا دلہناپا پرے کر کے پہلے دن سب گھر والوں کو ناشتا بنا کر کھلایا۔ اس پر شرمندہ ہونے شکر گزار ہونے کے بجائے طعنہ

بقیہ صفحہ نمبر 205 پر

مریم عزیز

دھوپ دریچہ

لاہور کے ایک بڑے بزنس مین غلام عباس کی خوب صورت بیٹی یونی ورسٹی میں پڑھتی ہے جہاں ایک لڑکا ثاقب اس میں دلچسپی لیتا ہے ہالہ اسے نظر انداز کرتی ہے۔ غلام عباس کا بڑا بیٹا حارث بزنس میں باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس کی ناہید خالہ جو لاہور کے پسماندہ علاقے میں رہتی ہیں اپنی ماں کے کہنے پر ان کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہے ان کی بڑی بیٹی کومل حارث کے خواب دیکھتی ہے جبکہ حارث کی منگنی بچپن ہی میں اپنے مرحوم چچا ایاز کی بیٹی زیمل سے ہو چکی ہے۔ زیمل کی ماں فرحانہ کی شادی اس کے لالچی بھائی وحید نے عبدالقدوس سے کر دی تھی زیمل اپنے ماموں کے پاس رہتی تھی اس کے ماموں ممانی اس کی شادی پیسوں کے لالچ میں کسی غنڈے سے کرانا چاہتے تھے۔

بیرون ملک سے آئی شاہانہ اپنی بھتیجی زیمل کو غلام عباس کے گھر لے آتی ہیں۔ ضامن اور فرقان

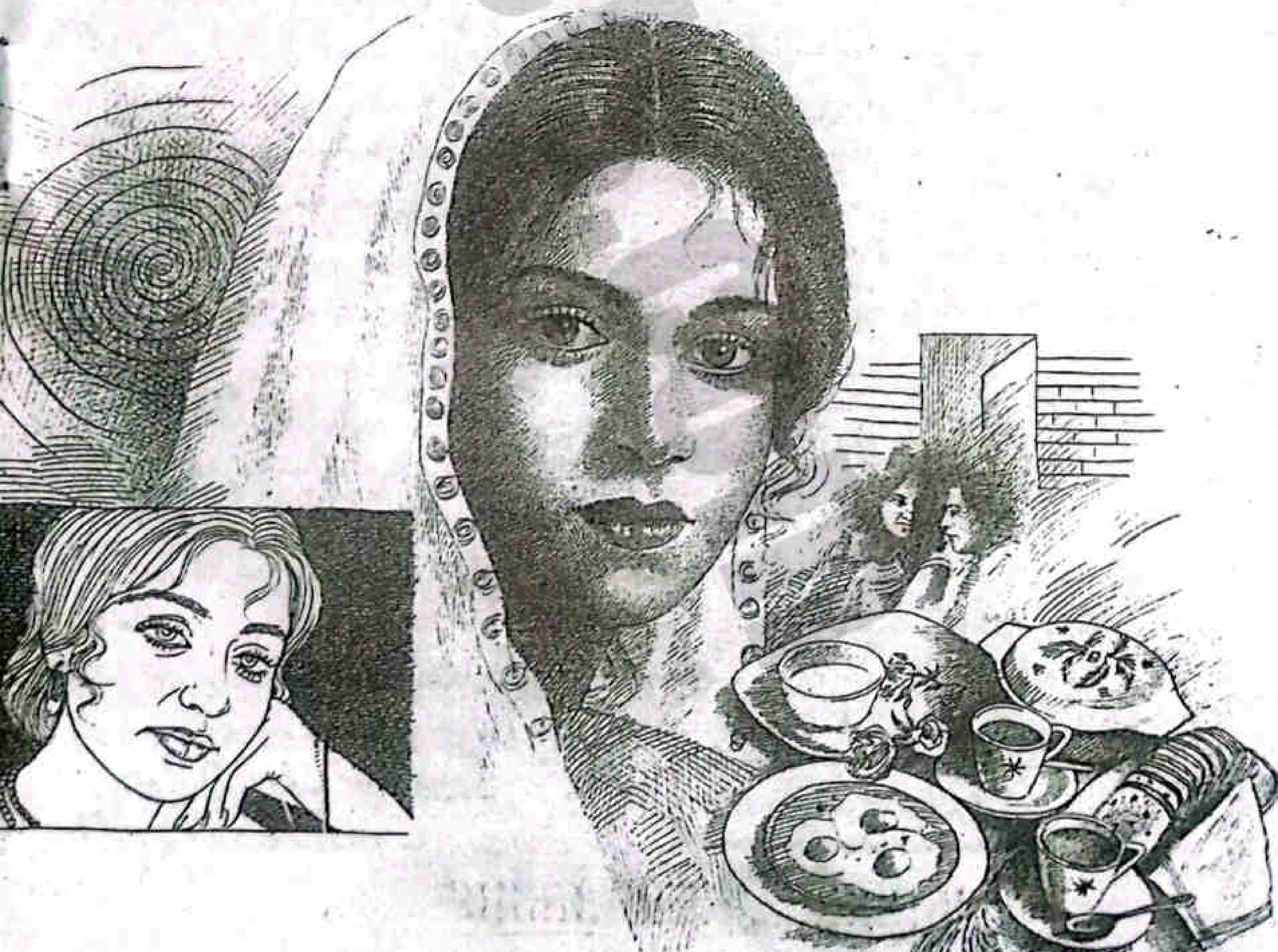

گہرے دوست ہیں ضامن کا باپ ہاشم اپنی بیوی شاہینہ سے دبتے ہیں جن کی کئی بہنیں کینیڈا میں رہتی ہیں۔ ضامن کی دوست علیزہ اس سے شادی کی خواہش مند ہے ایک فنکشن میں وہ ڈرنک کرتی ہے ضامن اس سے ناراض ہوتا ہے اور وہ معافی مانگتی ہے۔

کومل زیمل کے آنے پر خوف زدہ ہے وہ ہر حال میں حارث کو پانا چاہتی ہے اس کے لیے وہ نیند کی گولیاں کھالیتی ہے مجبوراً حارث اس کو شادی کے لیے اپنا پہلا آپشن بتاتا ہے۔

عالیہ حارث کو زیمل کے خلاف بھڑکاتی ہے۔

علیزہ کا کزن سمیر پاکستان سے امریکا جاتا ہے اسے علیزہ پسند آجاتی ہے۔ جو اس کی ماں کی بھی پسند ہے۔ یونی ورسٹی کے چیریٹی فنکشن میں فائن آرٹس کا پاسٹ لڑکا ثاقب کا ہاتھ دیکھ کر سچ بتاتا ہے۔ جسے ثاقب جھوٹ قرار دیتا ہے جبکہ ہالہ کو کسی سازش کا شکار بناتا ہے۔

ضامن کی پھوپھو اور ان کا بیٹا اسد امریکہ جاتے ہیں پھوپھو کو کینسر ہے اور وہ اپنے بھائی سے چھپاتی ہیں لیکن ضامن اسد سے اگلوالیتا ہے۔ زیمل کے ماموں وحید کے گھر اس کا نام نہاد منگیتر سردار اپنے غنڈوں کے ہمراہ زیمل کی تلاش میں آتا ہے۔

چھٹی قسط

وہ نیچے آئیں تو سٹنگ روم میں کوئی نہیں تھا البتہ کچن سے برتنوں کی آواز آرہی تھی، وہ دھیمے قدموں سے چلتی کچن کی طرف بڑھیں...... اندر ہاشم علی کو دیکھ کر وہ حیران ہوئیں اور ان کو پیاز کاٹتا دیکھ کر ان کی حیرت سوا ہوئی۔

''ہاشم بھائی......'' ان کی آواز پر وہ چونک کر مڑے اور انہیں دیکھ کر مسکرائے۔

''آؤ روبی بیٹھو۔''...... انہوں نے آگے بڑھ کر ڈائننگ ٹیبل کی کرسی ان کے لیے کھینچی، لیکن وہ اب تک کھڑی افسوس سے اپنے بھائی کو دیکھ رہی تھیں۔

''میں آملیٹ بنا رہا ہوں اور تمہارے لیے سیب کا فریش جوس نکالا ہے۔'' کہتے ہوئے مڑ کر انہیں دیکھا جو اب تک کھڑی تھیں۔

''بیٹھو نا کھڑی کیوں ہو۔''

''بھائی آپ کیوں ناشتا بنا رہے ہیں...... بھابھی کہاں ہیں؟''

''تمہاری بھابھی کی اس وقت کی کچھ اور...... مصروفیت ہیں جو وہ کسی حال میں ترک نہیں کرتی۔'' انہوں نے بات کو مزاحیہ انداز میں بیان کیا۔

''اب اس کے انتظار میں بھوکے تو نہیں رہ سکتے اور دوسری بات جتنا بد مزہ کھانا وہ بناتی ہے میں نہیں چاہتا اس کے ہاتھ کا کھانا کھا کر تمہارا معدہ متاثر ہو۔'' وہ بہت ہلکے پھلکے انداز میں بات کر رہے تھے، لیکن روبینہ کو اچھا نہیں لگا وہ آگے بڑھیں۔

''آپ چھوڑیں میں بناتی ہوں۔'' انہوں نے چھری ان کے ہاتھ سے لی۔

''پاگل ہو میں، تم سے کھانا بنواؤں گا۔''

''تو آپ کو کیا لگتا ہے میں آپ سے کھانا بنواؤں گی، میرے ہوتے ایسا نہیں ہوسکتا۔'' کہتے ہوئے انہوں نے پیاز والی ٹوکری بھی اپنی طرف کھسکائی۔

''بالکل نہیں تم بیٹھو۔ انہوں نے دوبارہ چھری ان کے ہاتھ سے لے لی۔

"بھائی، آج تو میں ہی بناؤں گی اور پلیز مجھے منع مت کرنا۔" وہ آنکھوں میں نمی لیے انہیں دیکھنے لگیں تو وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گئے۔

گرم گرم چائے، خوشبودار مرچوں اور دھنیے سے سجا آملیٹ، فرنچ ٹوسٹ، مالٹے اور سیب کے جوس کے جگ کچن میں داخل ہوتے ضامن نے حیرت سے ڈائننگ ٹیبل پر سجے لوازمات دیکھے، کرسیوں پر بیٹھے وہ دونوں بہن بھائی مگن انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ اس نے بغور اپنے باپ کا چہرہ دیکھا جو خوشی سے جگمگا رہا تھا۔ اس نے کتنے سالوں سے انہیں اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔

"ضامن" وہ جو بغور اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا، روبینہ کی آواز پر چونک کر سیدھا ہوا اور مسکراتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔

"میں کافی پینے آیا تھا لیکن اتنی زبردست خوشبو آرہی تھی۔" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے آملیٹ کو دیکھا۔

"یہ تمہاری پھوپھو نے بنایا ہے۔"

"وہ تو مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔" اس نے اپنی پلیٹ میں آملیٹ ڈالتے ہوئے کہا۔

"آج تم آفس نہیں گئے۔" اسے یوں ریلیکس دیکھ کر انہوں نے گھڑی پر نظر ڈالی جہاں نو بج رہے تھے۔

"نہیں آج میں نے آف کیا ہے تاکہ اپنی پھوپھو کے ساتھ ٹائم گزار سکوں۔"

"پھوپھو صدقے" روبینہ نے بے ساختہ دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام ماتھا چوما۔

"بھائی آپ کو یاد ہے بہت چھوٹا تھا جب پاکستان آیا تھا، تب بھی بڑا پیارا تھا اب تو ماشاء اللہ نظر نہیں ٹھہرتی، انگریز لگتا ہے۔" ان کے نزدیک شاید خوب صورتی کا معیار انگریز ہونا تھا ان کی اتنی تعریف پر وہ جھینپ گیا، اس کی جھینپی شکل دیکھ کر ہاشم علی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"میں مذاق نہیں کر رہی ضامن واقعی بہت خوب صورت ہے۔" اپنے بھائی کے ہنسنے پر وہ منہ پھلا کر بولیں۔

"ہاں بھئی میں کب تمہارے بھتیجے کی شان میں گستاخی کر رہا ہوں۔" وہ اب چائے کا کپ ہونٹوں سے لگائے مسکراتی نظروں سے ضامن کو دیکھ رہے تھے۔

"بھابھی کب تک آئیں گی۔" روبینہ کے پوچھنے پر ضامن نے باپ کو دیکھا۔

"اس کا کوئی فکس ٹائم نہیں جب دل کرے گا آجائے گی ہم ہیں نا یہاں تمہارے لیے۔"

"آپ کی مہربانی ہے بھائی، لیکن ہم ہوٹل رکتے تو اچھا تھا، ہماری وجہ سے بھابھی کو گھر سے باہر ٹائم گزارنا پڑ رہا ہے۔" وہ شرمندگی سے انگلیاں چٹخاتی بولیں تو ضامن نے پیار سے ان کے ہاتھ تھام کر انہیں انگلیاں چٹخانے سے روکا۔

"پھوپھو، آپ بالکل پریشان نہ ہوں ماما آپ کی وجہ سے باہر نہیں وہ اس ٹائم یوگا کی کلاس لینے جاتی ہیں، اور ہوٹل جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا آپ ہمارے لیے آئی ہیں تو اب سارا وقت ہمارے ساتھ گزاریں۔"

"لیکن بھائی، میں کچھ دن ہی ہوں تو آپ دفتر سے چھٹی کر کے اپنی روٹین خراب نہ کریں۔"

"تمہارا بھائی آزاد آدمی ہے نائن ٹو فائیو والا بندہ وہ تمہارے ساتھ بیٹھا ہے، میرے اسٹور اور گیس اسٹیشن پر بھروسے کے آدمی ہیں، میں اگر نہ بھی جاؤں تو پریشانی والی کوئی بات نہیں۔" ان کے تسلی دینے پر انہوں نے بھی مطمئن ہو کر چائے کا کپ اٹھا لیا، لیکن ہاشم علی نے روک دیا۔

"یہ جوس تمہارے لیے رکھا ہے یہ پیو۔" انہوں نے جگ سے سیب کا جوس ان کے گلاس میں انڈیلا۔

"نہیں بھائی، صبح چائے پینے کو دل کرتا ہے۔"

"پی لینا لیکن ابھی جوس پیو، حالت کیا بنائی ہوئی ہے تم نے اپنی، کتنی کمزور ہوگئی ہو، رنگ دیکھو کتنا کالا ہوگیا ہے، اور بال دیکھو اپنے کتنے کم ہوگئے ہیں، اتنے بال تھے تمہارے۔" ہاشم صاحب کے کہنے پر ضامن نے

دزدیدہ نظروں سے روبینہ کی طرف دیکھا جو سر جھکائے مسکرا دی تھیں۔
"عمر ہو گئی ہے بھائی، جوانی والی بات اب کہاں۔"
"اتنی بھی بوڑھی نہیں تم مجھ سے چھ سال چھوٹی ہو۔ اپنا خیال نہیں رکھتیں یا اظہر تنگ کرتا ہے۔" اب ان کا سوالیہ لہجہ سنجیدہ تھا۔
"سب ٹھیک ہے بھائی اور اظہر میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔"
"مجھے تو نہیں لگتا شکل سے ہی بیمار لگ رہی ہو۔" انہیں تسلی ہی نہیں ہو رہی تھی۔
"آپ مجھے بہت عرصہ بعد دیکھ رہے ہیں اس لیے آپ کو ایسا لگ رہا ہے۔ امی ابا جی کیا گئے آپ تو سب کو بھول گئے، صفدر بھائی نہیں رہے، لیکن میں جو تھی، مجھ سے ملنے آجاتے یا آپ میرے مرنے پر ہی آتے۔" ان کی بھرائی ہوئی آواز پر ہاشم علی نے دہل کر جبکہ ضامن نے گھبرا کر انہیں دیکھا۔
"اللہ نہ کرے پھوپھو، آپ کو کچھ ہو۔" اپنی کرسی سے اٹھ کر ان کے پاس آیا اور بازو کے گھیرے میں لے کر ان کے آنسو صاف کیے جبکہ ہاشم علی تو جیسے ان کی بات کے اثر سے نکل ہی نہیں پا رہے تھے۔ ضامن نے باپ کی طرف دیکھا جن کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔
"پھوپھو، آپ نے ڈیڈی کو بھی پریشان کر دیا۔" ضامن کے کہنے پر روبینہ نے تیزی سے آنسو صاف کر کے ہاشم علی کو دیکھا۔
"معاف کر دیں بھائی۔"
"ایسا مذاق میں بھی مت کہنا روبی! تم نہیں جانتیں میں کسی لمحے بھی امی، ابا جی، صفدر کو نہیں بھولا اور تمہارے لیے تو ہر پل دعا گو رہا ہوں۔"
"تو مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے تھے۔" وہ پھر رو پڑی تھیں۔ ضامن نے بے چارگی سے اپنی پھوپھو اور باپ کو دیکھا جو رو رہے تھے اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کس کو تسلی دے تب ہی اسد کچن میں داخل ہوا۔ لیکن یہ منظر دیکھ کر پریشان ہوتا وہیں رک گیا۔
"امی، آپ ٹھیک ہیں۔" پھر ایک دم تیزی سے چلتا ہوا روبینہ کے پاس آیا۔
"کیا ہو گیا ہے لڑکے، تم تو ایسے ماں کی طرف آئے ہو جیسے پتا نہیں کیا ہو گیا ہو۔ بہن بھائی برسوں بعد ملے ہیں، جذباتی ہو گئے ہیں۔" ہاشم علی نے نارمل ہوتے ہوئے اسد کو لتاڑا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔
"سب ٹھیک ہے" ضامن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔

☆☆☆

رات کا ایک بج رہا تھا کمرے میں دو نفوس موجود تھے لیکن اس کے باوجود کمرے میں اتنا سناٹا تھا کہ گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز سنائی دے رہی تھی، دل و دماغ میں اتنی سوچیں چل رہی تھیں کہ ڈر کے مارے پلکیں جھپکنا محال ہو رہا تھا۔
"کوثر" خاموش کمرے میں وحید کی آواز سنائی دی تو کوثر نے گردن موڑ کر اپنے شوہر کو دیکھا۔
"نمرہ اور ناجیہ کو کل اپنی بہن کے گھر بھیج دینا۔" کوثر نے اب چونک کر کروٹ بدل کر چہرے کا رخ اس کی طرف کیا۔
"اس سے کیا ہو گا۔"
"یہ مجھے نہیں پتا کیا ہو گا میں صرف ان کو محفوظ کرنا چاہتا ہوں۔" اس کے سوال پر وہ جھنجلا کر بولا۔
"اور ہمارا کیا۔" وہ پریشانی سے بولی۔ "کیا ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔" وحید نے کوئی جواب نہیں دیا وہ پرسوچ

نظروں سے چھت کو دیکھ رہا تھا۔
''پتا نہیں کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے تمہاری باتوں میں آ کر اس شخص سے رشتہ جوڑ لیا۔''
وحید کی جھنجلائی ہوئی آواز پر کوثر تلملا کر اٹھ بیٹھی۔
''میرے کہنے پر رشتہ جوڑا؟'' اس نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔
''اتنا امیر آدمی رشتہ لے کر آیا تھا اور وہ اتنے اثر ورسوخ والا تھا میں منع کر دیتی تو تم تو جیسے میرے کہنے پر منع کر دیتے؟''
''ہاں کر دیتا'' وحید بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔
''تو کر دیتے منع کیا، کیوں نہیں، اس نے تمہیں پیسوں کا لالچ دیا اور تم وہیں دم ہلانے لگے۔'' وہ ہاتھ نچا کر بولی۔
''تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں اکیلا یہ فیصلہ کرنے والا تھا تم نے مجھے اکسایا تھا کہ یہ پیسے ہماری بیٹیوں کے کام آئیں گے۔''
''ہاں غلط کیا کہا تھا کبھی اکٹھے چالیس لاکھ دیکھے ہیں تم نے۔'' کوثر نے طنزیہ انداز میں اسے دیکھا۔
''ایسے بیٹھے بٹھائے تمہاری یتیم بھانجی کا اتنا شاندار رشتہ آیا تھا راج کرتی وہاں جا کر اور کیا چاہیے تھا ہم نے تو اس کی بھلائی کی تھی، اور وہ اس کے تایا اور پھوپھی ساری عمر اس کا پتا نہیں کیا اب جب وہ سونا دینے والی مرغی بن گئی تھی تو اسے لینے آ گئے۔'' کوثر دانت پیس کر بولی۔
''پرانی باتیں چھوڑو کوثر! اب یہ بتاؤ کیا کروں کیسے اس مسئلے سے جان چھڑاؤں، تم جانتی ہو وہ سردار بہت ظالم آدمی ہے۔ اگر زمل اسے نہ ملی تو وہ ہمیں چھوڑے گا نہیں۔'' وحید کے لہجے میں بے بسی پریشانی محسوس کر کے کوثر سوچ میں پڑ گئی۔
''سردار اتنا امیر آدمی ہے، اسے لڑکیوں کی کیا کمی ہے، پتا نہیں اس زیمل میں اسے کیا نظر آیا عمر میں بھی اس سے آدھی ہے، نہ دولت جائیداد نہ آگے پیچھے کوئی، نہ بہت پڑھی لکھی، بس ایک شکل ہی اچھی ہے اسے تو اس سے زیادہ اچھی شکل کی لڑکیاں مل سکتی ہیں، پر زیمل ہی کیوں۔''
''لعنت بھیجو زیمل پر مجھے بتاؤ کیا کروں۔'' اب کہ وحید غصے سے بولا۔
''زیمل تو اسے دینی پڑے گی نہیں تو وہ ہمیں نہیں چھوڑے گا، تو ایسا کرو جا کر زیمل کو لے آؤ۔'' کوثر کے مشورے پر وہ اچھل ہی پڑا تھا۔
''تمہیں لگتا ہے بیوہ ہونے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہو رہا ہے۔'' انہوں نے ماتھے پر بل ڈال کر اپنی بیوی کو دیکھا۔
''ایسا کیا کہہ دیا میں نے۔'' کوثر حیران ہوئی۔
''غلام عباس کو بھنک بھی لگی کہ میں کس وجہ سے زیمل کو لے کر جا رہا ہوں وہ کھڑے کھڑے مجھے گولی مار دیں گے۔''
''پھر'' کوثر اب پریشانی سے بولی۔
''مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' اس نے زچ ہو کر اپنے بالوں کو مٹھیوں میں دبوچ لیا۔
''وحید، صبح تم عباس صاحب کو فون کرو اور اسے بتاؤ کہ یہ رشتہ بہت اچھا ہے، کوئی جہیز کی بھی ٹینشن نہیں اور سردار صاحب کی تعریفیں کر کے انہیں راضی کرنے کی کوشش کرو ہو سکتا ہے وہ مان جائیں۔'' وحید نے پرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔

''اور اگر وہ نہ مانے تو'' وحید نے کوثر کو دیکھا تو وہ کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتی رہی پھر گہرا سانس لیا۔

''پھر ہمیں یہاں سے بھاگنا پڑے گا جہاں وہ سردار ہمیں ڈھونڈ نہ سکے۔'' وحید نے گہرا سانس لیا۔ اور دوبارہ لیٹ گیا اب وہ صبح کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کیسے اور کن الفاظ میں وہ غلام عباس کو زیمل اور سردار کی شادی کے لیے قائل کر سکے گا۔

☆☆☆

فون کی مسلسل بجتی گھنٹی کو انہوں نے ناگواری سے سنا اور سامنے بیٹھے مسرور کو رکنے کا اشارہ کر کے ریسیور کان سے لگایا۔

''مسز بلال، میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے تو بار بار فون کرنے کا مقصد۔'' ان کا لہجہ روکھا اور سرد تھا۔

''آئی ایم سوری سر! لیکن کوئی وحید اصغر بار بار فون کر رہے ہیں، خود کو آپ کا رشتہ دار بتا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں ایمر جنسی ہے، بس اسی لیے آپ سے پوچھنا تھا کہ بات کروا دوں شاید ایمر جنسی ہے وہ کافی پریشان لگ رہے ہیں۔'' وہ بے چاری اس آدمی کی ہمدردی میں شاید اب اپنے باس کا عتاب سہنے والی تھی۔

''کیا وہ ابھی بھی لائن پر ہے۔'' کچھ دیر بعد ان کی سنجیدہ آواز سنائی دی۔

''جی سر لائن پر ہیں۔''

''پانچ منٹ تک ٹرانسفر کرنا اور ایک بات مسز بلال آئندہ اپنی سوچ اور اپنی ہمدردی اپنے تک محدود رکھیے گا۔ اور جو کام آپ سے کہا جائے اور جتنا کہا جائے بس اتنا ہی کیا کریں۔''

''سوری سر، آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔''

''مسرور تمہاری پریزینٹیشن اچھی ہے لیکن تم ایک بار حارث سے بھی ڈسکس کر لو۔''

''جی سر'' مسرور اپنا لیپ ٹاپ اٹھا کر آفس سے باہر نکل آیا۔ مسرور کے نکلتے ہی فون کی بیل پھر بج اٹھی تھی ،انہوں نے سر جھٹکا اور فون اٹھا لیا۔

''ہیلو'' ان کی بھاری اور رعب دار آواز پر وحید نے تھوک نگل کر کوثر کو دیکھا جو اشارے سے اسے بات کرنے کا حوصلہ دے رہی تھی۔

''السلام علیکم عباس بھائی، کیسے ہیں آپ۔'' اس نے گلہ کھنکھار کر اپنا جملہ پورا کیا۔

''میں ٹھیک ہوں بار بار کال کر رہے تھے خیریت ہے۔'' ان کے بے مروت انداز پر اس نے کوثر کی طرف دیکھا جسے اسپیکر سے عباس صاحب کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

''عباس بھائی، مجھے آپ سے ضروری بات کرنی تھی۔'' کہہ کر وہ خاموش ہوا اسے لگا وہ پوچھیں گے کیا ضروری بات، لیکن انہوں نے کچھ نہیں پوچھا تھا۔

''مجھے زیمل کے متعلق بات کرنی ہے۔'' وہ جو بے دھیانی سے فون کان سے لگائے کمپیوٹر اسکرین کی طرف دیکھ رہے تھے زیمل کے نام پر چونکے۔

''زیمل کے متعلق کیا بات کرنی ہے۔'' ان کا چونکنا ان دونوں نے بھی محسوس کیا تھا۔

''عباس بھائی! زیمل ہماری بیٹی کی طرح ہے، گیارہ سال وہ ہمارے ساتھ رہی ہے، ہم نے اسے ہمیشہ اپنی بیٹیوں نمرہ اور ناجیہ کی طرح سمجھا ہے، جب آپ لوگوں نے فرحانہ اور زیمل کی طرف سے منہ موڑ لیا تھا تب بس میں ہی تھا جس نے ان دونوں کو ساتھ رکھا تھا اور جب فرحانہ نے دوسری شادی کر لی اور زیمل کو یہاں بھیج دیا تب بھی میں نے اس کا سارا خرچہ اٹھایا۔''

"یہ داستان میں پہلے بھی سن چکا ہوں وحید، مدعے پر آؤ، اپنے احسانوں کے بدلے مجھ سے کیا چاہتے ہو۔"

"عباس بھائی، میں بس چاہتا ہوں آپ زیمل کو یہاں بھیج دیں" وحید کی بات پر غلام عباس کی آنکھیں سکڑ اور ماتھے پر لکیریں سی کھنچ گئی تھیں۔

"تم نے اتنی دیر اس کو اپنے پاس رکھا وحید! ابھی تمہارا دل نہیں بھرا۔" عباس صاحب کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"میں نے کہا نا آپ سے وہ میری بیٹیوں کی طرح ہے۔"

"ہنہ" غلام عباس نے طنزیہ انداز میں ہنکارا بھرا۔

"میں سب جانتا ہوں وحید! جو سلوک تم نے فرحانہ اور زیمل کے ساتھ کیا ہے، فرحانہ مجھے سب بتا چکی ہے اور زیمل کو رکھ کر تم نے احسان نہیں کیا بلکہ اس کے صدقے تم اور تمہارے گھر والے عیش کر رہے تھے، ابھی تم نے کہا نا کہ میں نے منہ موڑ لیا تھا لیکن یہ تمہاری غلط فہمی ہے، میں فرحانہ سے ناراض تھا لیکن میں زیمل اور فرحانہ سے متعلق ہر خبر رکھتا تھا اور فرحانہ سے ماہانہ ہزاروں جو تم وصول کرتے تھے، زیمل کی پڑھائی کپڑے اور کھانے کے لیے وہ پیسے میں فرحانہ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرتا تھا ہزاروں لے کر اگر چند ہزار تم نے زیمل پر جو خرچ کیے ہیں اس کی تفصیل بھی ہے میرے پاس وہ بھی بتاؤں یا اتنا بتانا تمہارے لیے کافی ہے۔" عباس صاحب کا سرد لہجہ ان دونوں کی بولتی بند کر چکا تھا۔

"میرے پاس اتنا فالتو ٹائم نہیں کہ تمہاری بے کار کہانیاں سنتا رہوں، سو سیدھی بات کرو، کتنے پیسے چاہئیں۔"

"پیسے نہیں چاہئیں۔" وہ بڑی مشکل سے بولا۔

ان کا صبر جواب دے گیا تھا۔

"ہم نے زیمل کی منگنی کی تھی یہاں پر...... لڑکا بہت اچھا ہے۔ بہت امیر اس نے بڑی چاہت سے زیمل کا رشتہ مانگا تھا، اب وہ شادی کرنا چاہتے ہیں، ان کے گھر والے شگن لانے والے ہیں، میں نے ان کو نہیں بتایا زیمل یہاں نہیں، اس سے پہلے وہ یہاں آئیں آپ برائے مہربانی زیمل کو یہاں بھیج دیں۔"

"بس" عباس صاحب کی برداشت یہیں تک تھی۔ انہوں نے غصے سے ہاتھ شیشے کی میز پر مارا جس کی آواز صاف فون کے اس پار وحید اور کوثر کو بھی سنائی دی تھی دونوں نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"خبردار آئندہ اپنی گندی زبان سے زیمل کا نام لیا۔ جس طرح تم نے اپنی بہن کو پیسوں کے عوض بیچا اسی طرح تم زیمل کے ساتھ کرنا چاہتے ہو۔" ان کی آواز اونچی ہو گئی تھی۔

"عباس بھائی، میں کیوں اس کا برا چاہوں گا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں رشتہ بہت اچھا ہے، میں نے کوئی سودا نہیں کیا میں بس زیمل کی بھلائی چاہتا ہوں۔ سردار صاحب کے ساتھ وہ خوش رہے گی۔"

"بکواس بند کرو اپنی، تمہیں کوئی حق نہیں زیمل کے لیے کوئی بھی فیصلہ کرنے کا، اس کا باپ اس کے لیے فیصلہ کر کے گیا تھا۔ اب میں اس کا سرپرست ہوں، میرے گھر کی عزت ہے وہ، تمہاری ہمت بھی کیسے ہوئی مجھے فون کر کے یہ بکواس کرنے کی۔" طیش کے مارے وہ اپنی کرسی سے کھڑے ہو گئے تھے۔

"عباس بھائی! پلیز میری مجبوری سمجھیں آپ کو زیمل کی شادی کروا کے کیا ملے گا جبکہ آپ کے بیٹے کے لیے تو بڑے اعلیٰ خاندانوں کے رشتے مل جائیں گے لیکن اگر میں نے زیمل کا نکاح اس آدمی سے نہ کروایا تو وہ مجھے اور میرے گھر والوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

"اچھی بات ہے تم جیسا خود غرض اور مطلبی انسان اسی قابل ہے، آئندہ مجھے فون مت کرنا ورنہ وہ آدمی جو

کرے گا سو کرے گا لیکن اس سے پہلے میں تمہارا وہ حال کروں گا کہ خود کو پہچاننے کے قابل نہیں رہو گے۔"
کہنے کے ساتھ انہوں نے پٹخنے کے انداز میں ریسیور کریڈل پر رکھا اور اپنی مٹھیوں کو زور سے بھینچ کر خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔

☆☆☆

اس نے ریلنگ سے نیچے جھانک کر دیکھا ٹی وی لاؤنج سے ٹی وی کی آواز کے ساتھ باتوں اور برتنوں کی آواز کے ساتھ چائے کی خوشبو بھی آ رہی تھی۔ اس نے ہاتھوں سے بالوں کو سنوارا اور کلائی میں پڑے ہیر بینڈ کو نکال کر بالوں کی پونی بناتی تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں اترتے لاؤنج میں آ گئی جہاں رضا صاحب کے ساتھ ظہیر کو دیکھ کر ایک پل کے لیے اس کے قدم رکے لیکن اگلے ہی پل وہ اسے مکمل اگنور کیے رضا صاحب کی طرف بڑھی۔

"ہیلو پاپا" اس کی آواز پر انہوں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا تب تک وہ ان کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی، انہوں نے اسے بازوؤں کے حلقے میں لے کر اس کا ماتھا چوما۔

"کیسی ہے میری بیٹی۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ اپنی بتائیں؟"

"تمہارے سامنے ہوں۔" ان کے مسکرا کر کہنے پر اس نے بغور ان کا چہرہ دیکھا جو پہلے کی نسبت کافی فریش اور خوش نظر آ رہے تھے۔

"بڑی دیر لگا دی آپ نے آنے میں، ایک ہفتے کا کہا تھا آپ نے پندرہ دن لگا دیے۔" وہ منہ پھلا کر شکوہ کرنے لگی تو اس کا چہرہ دیکھ کر وہ کھل کر ہنسے، ظہیر بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا جو اسے اگنور کر رہی تھی۔

"تو میری بیٹی ناراض ہے۔" انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"ناراض نہیں ہوں پاپا لیکن میں اکیلی تھی آپ کو پتا ہونا چاہیے تھا۔" اب کہ اس کا انداز سنجیدہ تھا اور اس کا لہجہ محسوس کر کے رضا صاحب الرٹ ہو کر سیدھے ہوئے۔

"سوری بیٹا! مجھے یہی لگا تھا کام ایک ہفتے کا ہو گا لیکن میٹنگ کرتے سارا کام سمیٹتے دس دن لگ گئے لیکن میں تمہاری پھوپھو سے کہہ کر گیا تھا چکر لگا لیا کریں، کیوں ظہیر آپا کو لے کر نہیں آئے۔" وہ جو مکمل طور پر فائزہ کو دیکھنے میں مصروف تھا رضا صاحب کے اچانک سوال پر گڑبڑا کر انہیں دیکھنے لگا۔

"میں ایک دو دفعہ امی کو لے کر آیا تھا لیکن فائزہ یونیورسٹی میں تھی اور شام کو ابو آ جاتے ہیں، ابو کی عادت تو آپ جانتے ہیں اسی لیے امی شام سے پہلے گھر چلی جاتی تھیں۔ اور میں نے نرگس کو بھی کہا تھا سارا دن یہیں رہے بلکہ رات کو بھی یہیں سو جایا کرے وہ بھی چلی جاتی تھی؟" وہ اب اس کے لیے پریشان ہو رہے تھے۔

"نرگس آنٹی تھیں یہاں پاپا۔" فائزہ اب بیزاری سے بولی اسے ان کی ضرورت تھی اور وہ اپنی جگہ اور لوگوں سے پر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تب ہی خوشبوؤں کا تیز جھونکا لاؤنج میں آیا تو اس سمیت سب کی نظریں دروازے کی جانب اٹھ گئیں جہاں سے عشنا آ رہی تھی، بلیک اور گولڈن امتزاج کی ساڑھی میں اس کا خوب صورت سراپا غضب ڈھا رہا تھا، چہرہ پہلے ہی خوب صورت تھا اور اس پر سلیقے سے کیے گئے میک اپ نے خوب صورتی کو چار چاند لگا دیے تھے وہ مسکراتی ہوئی رضا صاحب کی طرف بڑھی جن کی نظریں اس پر سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔

فائزہ نے ایک نظر باپ کا چہرہ دیکھا جو سب بھلائے والہانہ انداز میں عشنا کو دیکھ رہے تھے، وہ غیر محسوس طریقے سے ان کے بازو کے حلقے سے نکل کر کچھ فاصلے پر جا کر بیٹھ گئی۔

''او فائزہ کیسی ہوبنی۔'' وہ مسکرا کر اس کی طرف بڑھی اور نرمی سے اس کا گال چھوا۔
''میں کب سے تمہارے اٹھنے کا انتظار کر رہی تھی۔'' وہ رضا صاحب کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بڑے انداز سے بولی۔
''اچھا لیکن میں تو آپ کے اٹھنے کا انتظار کر رہی تھی۔ صبح نرگس نے بتایا آپ لوگ آچکے ہیں دوپہر تک انتظار کرتی رہی کوئی باہر نہیں نکلا اب شام کو پاپا کی آواز آئی تو میں یہاں آگئی۔'' وہ پوری کوشش کر رہی تھی اس کا لہجہ ہموار رہے اس میں کمی یا دکھ کا عنصر تک نہ ملے۔
''ہوسکتا ہے ڈیئر! فلائیٹ لیٹ تھی آ کر سو گئے، میں تو اٹھ گئی تھی تمہارے پاپا نے ہی باہر آنے میں دیر کی۔'' اس نے مسکرا کر رضا صاحب کو دیکھا جنہوں نے جز بز ہو کر پہلو بدلا۔
''آپ تیار نہیں ہوئے راشدی صاحب کی طرف جانا ہے۔''
''ہاں بس ظہیر آ گیا تھا تو اس سے بات کرنے لگا۔'' ان کے کہنے پر وہ ظہیر کی طرف یوں مڑی جیسے ابھی ابھی اسے دیکھا ہو۔
''کیسے ہو ظہیر! باجی کشور کیسی ہیں۔''
''سب ٹھیک ہیں آپ بتائیں اتنے دن لگا دیے۔''
''اتنے دن کہاں دس دن ہی ہوئے ہیں، میں تو ابھی اور رہنا چاہتی تھی لیکن رضا ہی نہیں مانے، کام تو رضا کا تین دن میں ختم ہو گیا تھا تو پہلے ہم لندن گھومے اور وہاں سے دوبئی اور دوبئی سے ملائیشیا کا پروگرام تھا لیکن رضا کو جلدی تھی واپس آنے کی، حالانکہ میں نے کہا بھی پیچھے کون ہے ہمارا انتظار کرنے والا۔ دو سال ہونے کو ہیں ہماری شادی کو اور ہم ہنی مون پر بھی نہیں گئے تھے میں نے رضا سے کہا اب باہر نکلے ہیں تو انجوائے کرتے ہیں۔'' وہ مزے سے تفصیل بتا رہی تھی جبکہ رضا صاحب بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے، انہوں نے دزدیدہ نظروں سے فائزہ کا چہرہ دیکھا جو دھواں دھواں ہو رہا تھا۔
''میں چینج کر کے آتا ہوں۔'' وہ جلدی سے اٹھے اور تیز تیز قدموں سے چلتے اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔
''فائزہ، تم چل رہی ہو۔'' عشنا نے بس ایک سوال کیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی جواب اس کی منشا کے مطابق ہوگا۔
''نہیں آپ لوگ انجوائے کریں۔'' کہہ کر اس نے ٹی وی ریموٹ اٹھالیا اور نظریں اسکرین پر جمادیں۔
''ظہیر، تم تو چل رہے ہونا۔'' وہ کھڑے ہوتے بولی۔
''ہاں میں چل رہا ہوں۔''
''ٹھیک ہے میں ذرا رضا کو دیکھ لوں۔'' وہ نزاکت سے پلو سمیٹ کر لمبی ہیل پر ٹک ٹک کرتی کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ لاؤنج میں اب صرف ٹی وی کی آواز تھی۔
''فائزہ'' ظہیر کی ملتجی آواز پر اس نے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔
''ناراض ہو''
''میں ناراض نہیں۔'' وہ ریموٹ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔
''فائزہ ایم سوری میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا، میں میٹنگ میں تھا میرے ذہن سے نکل گیا کہ مجھے تمہیں پک کرنا ہے۔''
''تمہیں سوری کی ضرورت نہیں میں اب ان باتوں کی عادی ہوتی جا رہی ہوں۔''

کہہ کر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی جبکہ وہ کتنی دیر تک سیڑھیوں کی طرف دیکھتا رہا جہاں سے وہ گئی تھی کمرے تک آتے آتے آنکھوں میں جمع آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر گالوں پر بہہ نکلے تھے لیکن اگلے ہی پل اس نے سختی سے گالوں پر بہتے آنسوؤں کو بے دردی سے صاف کیا۔ آنسو کمزور کرتے ہیں اور اسے کمزور نہیں بننا تھا پچھلے کچھ سالوں سے اسے عادت ہوگئی تھی آنسو پی کر مسکرانے کی، اس کے جاننے والوں کو یہی پتا تھا فائزہ بہادر ہے لا پرواہ ہے، منہ پھٹ ہے۔ اس نے خود پر ایک لبادہ اوڑھ رکھا تھا اور اب تک بڑی کامیابی سے وہ اپنی اصل شخصیت کو چھپائے ہوئی تھی۔ اس کی زندگی میں چند گنے چنے لوگ تھے جن سے اس کی توقعات وابستہ تھیں جن سے وہ محبت کی متقاضی تھی، ایک اس کے پاپا تھے اور ایک اس کا کزن اس کا بچپن کا دوست اور شاید مستقبل کا ساتھی ظہیر لیکن افسوس اس کی زندگی کے یہ دونوں اہم شخص بھی اسے پہچاننے اور سمجھنے میں ناکام تھے۔

☆☆☆

''زیمل کے آنے سے کتنی رونق ہوگئی ہے۔'' نفیسہ نے پیار سے زیمل کو دیکھا جو کتاب پر نظریں جھکائے بڑے انہماک سے ہالہ کو سن رہی تھی، شاہانہ بھی ان تینوں پر نظریں جمائے بیٹھی تھیں جو تین گہری سہیلیوں کی طرح گروپ میں بیٹھیں راز و نیاز کر رہی تھیں۔

''پہلی ساس دیکھ رہی ہوں جو اپنی ہونے والی بہو پر واری صدقے جا رہی ہے۔'' شاہانہ کے شرارتی انداز پر وہ کھل کر مسکرائیں۔

''ماؤں کو سالوں لگتے ہیں اپنے لیے چاند جیسی بہو لانے کے لیے، مجھے تو گھر بیٹھے بٹھائے شہزادیوں جیسی بہو مل گئی، لگتا ہی نہیں وہ ابھی ابھی اس گھر میں آئی ہے لگتا ہے سالوں سے یہیں تھی، ایسا گھل مل گئی ہے۔''

اب کہ ان کے ساتھ شاہانہ نے بھی پیار سے اسے دیکھا جو اب اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے ہالہ کو دیکھ رہی تھی۔

''کیا ایسا ہو سکتا ہے۔'' اس کے چہرے پر کشمکش کی کیفیت تھی۔

''کیوں گڑیا تمہیں کوئی شک ہے۔'' بوا کو اس کی کشمکش پسند نہیں آئی وہ تینوں مل کر ایک رومانوی ناول پر بات چیت کر رہے تھے جسے ہالہ پڑھ رہی تھی اور زیمل اور بوا سن رہی تھیں۔

''مجھے نہیں لگتا ایسی محبت ہوتی ہے۔'' زیمل نے بے یقینی سے سر ہلایا۔

''محبت ہوتی ہے لیکن یوں کوئی اپنا گھر بار سب کچھ ایک لڑکی کے لیے نہیں چھوڑتا اس کی خاطر وہ انجان ملک میں آ کر رہنے لگا ایسا کون کرتا ہے۔'' یہ تبصرہ ہالہ کی طرف سے آیا تھا۔

''اس لڑکے نے اس لڑکی کے لیے نہیں بلکہ اس محبت کی خاطر سب چھوڑا جو اسے اس لڑکی سے تھی، محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے یہ انسان سے وہ بھی کروا لیتی ہے جس کا تصور بھی اس کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔'' اب کے بوا نے اپنا فلسفہ بیان کیا۔

''لیکن مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ پہلے ہیرو کو ہیروئن سے اتنی نفرت تھی پھر محبت کیسے ہوگئی مجھے نہیں لگتا نفرت محبت میں بدل سکتی ہے۔'' زیمل کو ہیرو کی محبت ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

''نفرت کے بعد جو محبت ہوتی ہے وہ زیادہ گہری محبت ہوتی ہے۔''

''بوا، آپ محبت کے بارے میں اتنا کیسے جانتی ہیں کیا آپ نے بھی کبھی کسی سے محبت کی ہے۔'' اب کہ ہالہ نے آنکھیں چھوٹی کر کے ان کا جائزہ لیا۔

''ہک ہاہ'' انہوں نے افسوس سے گہری سانس لی ''حسرت ہی رہی میری، بڑا شوق تھا مجھے کہ کوئی مجھے بھی چاہے..... میرے لیے گھر بار چھوڑ دے، میری محبت میں گانے گائے کوئی شعر و شاعری کرے میرے حسن میں

زمین آسمان ایک کرے اور میں دوپٹے کا پلو انگلیوں میں لپیٹ کر کبھی منہ پھیر کر شرماؤں، لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔" آخر میں انہوں نے منہ بنایا تو وہ چاروں کھلکھلا کر ہنس دیں۔

"لیکن یہ محبت بھری باتیں کتابوں میں اچھی لگتی ہیں پریکٹیکل لائف اس سے بہت مختلف ہے، محبت وہی ہوتی ہے جو محرم سے ہو، محرم کے علاوہ کسی سے محبت کا ہونا انسان کو رسوائی کے سوا کچھ نہیں دیتا۔"

شاہانہ کی سنجیدہ آواز پر ان دونوں کے ساتھ انوری بوا نے بھی شاہانہ کو دیکھا، ان تینوں کے بغور دیکھنے پر وہ ہنس پڑیں۔

"مجھے گھور کیوں رہی ہو تم تینوں، غلط کہا ہے کیا میں نے؟" ان کے سوالیہ انداز پر زیمل اور ہالہ نے سر نفی میں ہلایا جبکہ بوا نے افسوس سے سر جھٹکا۔

"ثابت کر دیا تم نے شاہانہ تم عباس کی بہن ہو، خشک اور محبت سے الرجک وہ بچیاں بیٹھ کر مذاق کر رہی تھیں اور تم نے اپنا وعظ شروع کر دیا۔"

"انوری! شاہانہ نے غلط نہیں کہا، وہ بچیاں ہیں ایسی باتیں ان کے لیے ٹھیک نہیں۔"

"حد کرتی ہو نفیسہ! ماشاء اللہ پڑھی لکھی، سمجھ دار بچیاں ہیں، پتا ہے انہیں کیا غلط ہے کیا صحیح۔ اور محبت کا صرف نام بدنام ہے۔ اگر قسمت میں رسوائی لکھی ہو تو اچھے اچھوں کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔" ان کی بات پر ہالہ اور زیمل نے سر ہلایا جبکہ شاہانہ اور نفیسہ کا رنگ ایک پل کے لیے بدلا تھا۔

☆☆☆

وحید اصغر کے فون کے بعد ان کا موڈ اتنا آف ہو گیا تھا کہ وہ مزید کوئی کام نہیں کر سکے تھے، وکیل کے ساتھ ان کی میٹنگ تھی وہ بھی انہوں نے کینسل کر دی، وہ اٹھ رہے تھے جب ان کا موبائل بجا، آنے والی کال فرحانہ کی تھی۔ فرحانہ نے آج سے پہلے کبھی انہیں کال نہیں کی تھی اس لیے وہ حیران ہونے سے زیادہ پریشان ہوئے تھے۔

"ہیلو"

"السلام علیکم بھیا۔"

"وعلیکم السلام کیسی ہو فرحانہ"

"میں ٹھیک ہوں، بھیا زیمل کی بڑی یاد آ رہی تھی، پر میرے پاس گھر کا، بھابھی کسی کا نمبر نہیں تھا اس لیے آپ کو کال کی۔" "ہوں" انہوں نے گہرا سانس لیا۔

"میں ابھی آفس میں ہوں، گھر کے لیے نکل رہا ہوں، گھر جا کر زیمل سے بات کرواتا ہوں۔"

"جی" فون ابھی بھی آن تھا لیکن دوسری طرف خاموشی تھی جیسے وہ بات کرنے نہ کرنے کی کشمکش میں مبتلا ہو۔

"فرحانہ کوئی بات کرنی ہے۔" آخر انہوں نے خود ہی پوچھ لیا۔ "زیمل آپ کے پاس ہے مجھے اس کی خیریت کی پوری تسلی ہے لیکن اس کے باوجود میں پریشان ہو گئی ہوں، دو دن پہلے کچھ لوگ عبدالقدوس کے پاس آئے تھے وہ زیمل کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔"

"کون لوگ تھے۔" عباس صاحب کے ماتھے پر بل پڑے۔

"میں نہیں جانتی وہ کون لوگ تھے لیکن وہ زیمل کی یہاں موجودگی کے بارے میں جاننا چاہ رہے تھے مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ایسا کون ہو سکتا ہے جو زیمل کے بارے میں جاننا چاہ رہا ہے، لیکن کل جب وحید بھائی کا فون آیا تو مجھے سمجھ میں آ گئی، وہ مجھے کہہ رہے تھے کہ میں آپ کو فون کر کے کہوں زیمل کو واپس بھیج دیں، مجھے

اب سمجھ میں آ رہی ہے یہ اسی آدمی کے لوگ ہوں گے جس کے ساتھ وحید بھائی زیمل کی شادی کروانا چاہ رہے تھے، ہماری طرف سے انکار ہوگیا ہے۔ تو وہ آدمی زیمل کی جان نہیں چھوڑ رہا، اس کا پیچھا کرتے کرتے یہاں تک آ گیا، مجھے بہت پریشانی ہو رہی ہے، بھیا، اگر وہ وہاں آپ کے گھر تک پہنچ گیا تو۔"

آواز سے ان کی پریشانی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"کسی کی اتنی جرات نہیں کہ میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں گھس سکے، وحید کا مجھے بھی فون آیا تھا اس کی طبیعت تو میں نے صاف کر دی ہے، امید تو یہی ہے کہ اسے سمجھ آ گئی ہوگی، دوسرا ایسے ہی کوئی منہ اٹھا کر نہ کسی کے گھر میں گھس سکتا ہے اور نہ زبردستی کسی سے رشتہ جوڑ سکتا ہے، تمہیں زیمل کے حوالے سے پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں، وہ بالکل ٹھیک ہے اور محفوظ ہے۔"

"مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے، زیمل آپ کے پاس ہے اسی لیے تو رات کو بے فکر ہو کر سوتی ہوں، لیکن ماں ہوں نا۔ دل پریشان ہو جاتا ہے اس کے سر پر باپ کا سایہ نہیں تھا تو اس نے بہت کچھ برداشت کیا ہے، میرے سامنے لوگ اس کو مار بھی دیتے تھے تو میں کچھ کر نہیں پاتی تھی اب اگر آپ نہ آتے تو شاید میں زیمل کو کھو دیتی کیونکہ وحید بھائی تو میری بیٹی کا معاوضہ تک تو لے چکے تھے۔" ان کا نم لہجہ آخر میں تلخ ہو گیا تو عباس صاحب کے ہونٹ بھینچ گئے۔

"تم پریشان نہ ہو اور تسلی رکھو میں گھر جا کر زیمل سے بات کرواتا ہوں۔" الوداعی کلمات کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا، ان کے ماتھے پر شکنیں تھیں۔

"کون تھا وہ آدمی۔" وہ اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتے تھے پر سوچ رہے تھے۔

☆☆☆

دروازہ کھولتے ہی بریانی کی خوشبو نے ان کا استقبال کیا۔ ضامن نے گہرا سانس لے کر خوشبو کو اپنے اندر اتارا جبکہ فرقان تیزی سے جوتے اتارتے کچن کی طرف بھاگا۔ ہاتھ میں پکڑے شاپرز اس نے کاؤنٹر پر رکھے اور تیزی سے دیگچی کا ڈھکن اٹھایا، چاولوں پر سنہری پیاز، ہری مرچوں اور دھنیے کی تہہ سجی تھی۔

"بیٹا ڈھکن رکھ دو، بریانی دم پر رکھی ہے۔" پیچھے سے آتی روبینہ کی آواز پر فرقان ڈھکن رکھ کر تیزی سے پلٹا۔

"سوری آنٹی! خوشبو اتنی اچھی آ رہی تھی صبر ہی نہیں ہوا۔" وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔

"بس دس منٹ اور پھر کھانا لگا دوں گی۔" تب ہی ضامن بھی اندر داخل ہوا۔

"پھوپھو، آپ اکیلی ہی کام کر رہی ہیں۔" اس نے پریشانی سے انہیں دیکھا۔

"نہیں بیٹا اسد، اور ہاشم بھائی میرے ساتھ تھے ابھی بیک یارڈ گئے ہیں، بس بریانی دم پر رکھی تھی اس لیے میں یہاں موجود ہوں۔"

"ماما گھر پر ہیں۔" وہ سنجیدگی سے پوچھتا فریج کی طرف بڑھا۔

"ہاں بھابھی اوپر ہیں تمہاری خالہ آئی ہیں۔" آئس کریم کے باکس فریج میں رکھ کر وہ ان کی طرف پلٹا۔

"میری کوئی ہیلپ چاہیے۔"

"نہیں بیٹا، سب تیار ہے، بس برتن باہر رکھنے ہیں، بھائی کہہ رہے ہیں کھانا باہر لان میں کھائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ سر ہلاتا فرقان کی طرف مڑا جو کٹا ہوا بادام پستہ پھانک رہا تھا۔

"صبر نہیں تم میں۔" ضامن نے اس کے ہاتھ پر چپت لگا کر اسے روکا تو فرقان نے برا سا منہ بنا کر ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"آنٹی بریانی کے علاوہ اور کیا بنا ہے۔" فرقان نے کاؤنٹر پر رکھی دیگچیوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آلو، گوشت، شامی کباب اور میٹھے میں کھیر۔"

"واؤ" فرقان نے چٹخارا لیا۔ "خوشبو تو بہت اچھی آ رہی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے ہاتھ میں ذائقہ ہوگا۔"

"مجھے پتا نہیں تھا تم اتنے بھوکے ہو، صبح سے یہیں براجمان ہو، ندیدوں کی طرح ہر چیز پر نظر رکھ کر بیٹھے ہو۔" ضامن کے کہنے پر اس نے برا مانے بغیر سر ہلایا۔

"گھر کا اتنا مزے کا کھانا کبھی کبھی نصیب ہوتا ہے اور میں یہ موقع کسی صورت مس نہیں کرنا چاہتا۔"

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے گھر میں تمہیں کھانے کو نہیں ملتا۔"

"ملتا ہے لیکن کبھی کبھی وہ بھی بس گزارے لائق، میری ممی بہت اچھی کک نہیں ہیں۔" اس نے بے چارہ سا منہ بنا کر روبینہ کو دیکھا جو پہلے ہی دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"کھانا بس تیار ہے تم جاتے ہوئے بھی لے کر جانا میں سب چیزیں پیک کر دوں گی۔"

"یو آر گریٹ آنٹی" فرقان بے ساختہ خوش ہوتے ہوئے بولا اس کی بچوں والی حرکتیں دیکھ کر ضامن نے مسکرا کر سر جھٹکا۔

"میں ذرا انکل سے مل کر آتا ہوں۔" وہ سلاد والی پلیٹ سے کھیرا اٹھا کر منہ میں ڈالتے کچن کے گلاس ڈور کو دھکیلتا باہر نکل گیا۔

"کیا بات ہے پھوپھو، پریشان لگ رہی ہیں۔" وہ جو پر سوچ انداز میں ٹیبل کی سطح کو گھور رہی تھیں چونک کر ضامن کو دیکھا۔

"بیٹا، میں نے فرقان کو کہہ دیا کہ میں اسے کھانا پیک کر دوں گی، میرے ذہن سے ہی نکل گیا میں یہاں مہمان ہوں اور کوئی بھی چیز استعمال کرنے سے پہلے مجھے بھابھی سے پوچھنا چاہیے، میں ان کی اجازت کے بغیر نہیں دے سکتی۔" وہ شرمندگی سے اپنے ہونٹ چبانے لگیں۔

"کیا ہو گیا ہے پھوپھو، یہ آپ کا ہی گھر ہے آپ جیسا چاہیں ویسا کر سکتی ہیں، کھانا آپ نے بنایا ہے آپ کی مرضی آپ اسے جس کو مرضی دیں۔" وہ ان کا ہاتھ تھام کر اتنی محبت سے بولا کہ ان کی آنکھیں نم ہو گئیں انہوں نے بے ساختہ اس کا ماتھا چوما۔

"خوش رہو اللہ تمہاری عمر دراز کرے اور رزق میں برکت دے۔ ہاشم بھائی سچ میں بہت قسمت والے ہیں جن کو تم جیسا فرماں بردار پیار کرنے والا بیٹا ملا۔"

"اور میں بھی بہت لکی ہوں کہ میری پھوپھو اتنی پیاری ہیں۔" اس نے جواباً ان کا منہ چوما تو وہ ہنس پڑیں اور ان کو دیکھ کر وہ بھی ہنس پڑا، اندر داخل ہوتے ہاشم علی نے سامنے کا منظر دیکھا تو دل میں جیسے سکون سا اترا تھا، بہن کو خوش دیکھ کر انہیں بے ساختہ اپنے بیٹے پر پیار آیا تھا۔

اندر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی جس میں سب سے اونچی آواز شاہینہ کی تھی وہ جانتے تھے یقیناً وہ ان کی بہن کے خلاف بات کر رہی تھی۔ انہوں نے گہرا سانس لے کر دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی اندر خاموشی چھا گئی تھی۔ انہیں دیکھ کر شاہینہ نے ناراضی سے منہ موڑ لیا جبکہ مشی انہیں دیکھ کر مسکرا دی۔

"بچے سب کھانے پر تم دونوں کا انتظار کر رہے ہیں۔" ہاشم علی کی بات پر شاہینہ نے تیزی سے گردن گھمائی۔

"انتظار کرنے کی ضرورت تھی جہاں سارے کچن پر تمہاری بہن نے قبضہ کر رکھا ہے وہاں کھانا بھی تم سب مل کر کھا لیتے۔" شاہینہ کی تیز آواز پر مشی نے افسوس سے سر جھٹکا۔

"اتنا سمجھانے کے باوجود مرغے کی وہی ایک ٹانگ۔"

''گھر بھی تمہارا اور کچن بھی تمہارا میری بہن یہاں مہمان ہے یہ اس کی مہربانی ہے کہ اس نے ہم سب کے لیے اتنا اچھا کھانا بنایا حالانکہ میزبان ہونے کے ناتے یہ تمہارا فرض تھا کہ تم اس کی مہمان نوازی کرتیں۔''

''ہنہ'' ہاشم علی کے کہنے پر انہوں نے نخوت سے ہنکارا ابھرا۔

''بن بلائی مہمان میں اگر چپ ہوں تو میری چپ کا ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ۔'' ان کے کہنے پر ہاشم علی نے افسوس سے سر ہلا کر مشی کو دیکھا۔

''مشی، اسے سمجھاؤ کچھ۔''

''وہ کیوں سمجھائے گی۔ سمجھنے کی ضرورت تمہیں اور تمہارے بیٹے کو ہے۔''

''مشی، تم کھانے کے لیے آجاؤ۔'' کہہ کر وہ رکے نہیں تھے۔

''شاہینہ تم اتنی ضدی کب سے ہوگئی ہو، میں سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہوں پر تمہاری سمجھ میں ہی نہیں آرہا، کیوں فضول کی ضد باندھ کر اپنے گھر کا ماحول خراب کررہی ہو، کچھ حاصل نہیں ہونے والا اس سب سے، روبی آپا نے وقت پر واپس جانا ہے ایک ہفتہ گزر گیا ہے مزید ایک ہفتہ ہے وہ بھی گزر جائے گا۔ لیکن تم ہاشم بھائی کا دل خود سے خراب کررہی ہو اور ضامن کا بھی۔''

''پلیز مشی! تم جاؤ مجھے بھوک نہیں'' مشی کچھ دیر اسے گھورتی رہی پھر پیر پٹختی کمرے سے باہر نکل گئی۔

''بھابھی نہیں آئیں۔'' مشی کے بیٹھتے ہی روبینہ نے سوالیہ نظروں سے گلاس ڈور کی طرف دیکھا۔

''شاہینہ کے سر میں درد تھا آرام کررہی ہے ہم شروع کرتے ہیں، خوشبو تو بہت اچھی آرہی ہے۔'' وہ مسکرا کر کہتی ڈش سے چاول نکالنے لگی ضامن نے ہاشم علی کی طرف دیکھا جو ہونٹ بھینچے اپنی پلیٹ میں سالن نکال رہے تھے۔ روبینہ نے باری باری سب کی شکلیں دیکھیں اور کھڑی ہوگئیں۔

''تم کہاں جارہی ہو۔'' ہاشم علی نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''آپ لوگ شروع کریں میں بھابھی کو دیکھ کر آتی ہوں۔'' اب مشی نے اضطرابی انداز میں ہاشم علی کی طرف دیکھا۔

''روبی، تم کھانا شروع کرو وہ خود ہی آجائے گی۔''

''آتی ہوں بھائی، آپ شروع کریں۔'' وہ مزید کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گئیں ضامن نے دوبارہ نظر ہاشم علی پر ڈالی جو پریشان نظر آرہے تھے وہ بھی ایکسیوز کرتا روبینہ کے پیچھے گیا تھا۔

دروازے پر دستک دے کر وہ اندر داخل ہوئیں شاہینہ جو منتظر تھیں ہاشم علی کی، روبینہ کو دیکھ کر بڑے بے ساختہ انداز میں ان کا منہ بنا تھا روبینہ نے بغور ان کے بگڑے تیور دیکھے اس کے باوجود وہ اندر آگئیں۔

''بھابھی! کھانے پر سب آپ کا انتظار کررہے ہیں۔''

''میں بتا چکی ہوں مجھے بھوک نہیں۔'' ان کے مطابق اس جواب کے بعد روبینہ کو چلے جانا چاہیے تھا لیکن ان کی توقع کے برعکس وہ ان کے سامنے آکر بیٹھ گئیں۔

''بھابھی، میں جانتی ہوں میرے یہاں آنے سے آپ خوش نہیں، میں کبھی بھی آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی، یہاں آنا میرے لیے آسان نہیں تھا لیکن زندگی کا بھروسہ نہیں، پتا نہیں کتنی سانسیں باقی رہ گئی ہیں، میرا دنیا میں اب ایک ہی رشتہ بچا ہے میرا بھائی...... سالوں سے اس سے ملی نہیں تھی، دل بڑا بے چین تھا، ایسا لگتا تھا کہ اب نہ ملی تو شاید پھر کبھی نہ مل سکوں۔''

کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی تو وہ رک کر آنسو صاف کرنے لگیں ان کے رونے پر شاہینہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"بھائی کو مل لیا آپ کو، ضامن کو دیکھ لیا۔ اب سکون ہے میں بس چند دن جو یہاں ہوں ہر پل بھائی کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں پھر پتا نہیں دوبارہ مل سکوں یا نہیں...... بس آپ سے ایک گزارش تھی ماضی میں جو بھی ہوا، امی ابو کی طرف سے یا میری طرف سے آپ کو جو بھی تکلیف پہنچی ہے اس کے لیے ہمیں معاف کردیں، میں یہ نہیں کہتی امی کی غلطی نہیں تھی لیکن ساری غلطی ان کی بھی نہیں تھی۔ پر جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے پاس ہماری دعاؤں کے علاوہ کچھ نہیں بچتا، جبکہ زندہ انسان کے پاس تو ہر پل موقع ہوتا ہے نیک عمل کرکے اللہ کی خوشنودی کا حق دار بننے کا، آپ اپنا دل بڑا کرکے سب کو معاف کردیں اور میری طرف سے اپنا دل صاف کرلیں میرے لیے آپ بہت محترم ہیں۔"

شاہینہ کو اب سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیسے ری ایکٹ کریں۔ کب سے باہر سنتا ضامن دروازہ کھول کر اندر آگیا۔

"پھوپھو، کھانا ٹھنڈا ہورہا ہے۔" اس نے روبینہ کو مخاطب کیا تھا۔ شاہینہ نے ترچھی نظر سے ضامن کا سنجیدہ چہرہ دیکھا۔

"چلو روبی، میں بھی چلتی ہوں مشی بتارہی تھی بریانی اور کباب بنے ہیں اور بریانی تو میری فیورٹ ہے۔" وہ بولتی ہوئی اپنے سلیپر پہن رہی تھیں جبکہ روبی حیرت سے اپنی بھابھی کے پل میں تولہ پل میں ماشہ مزاج کو دیکھ رہی تھیں لیکن جو بھی تھا لگتا تھا ان کی بھابھی نے اپنا دل بڑا کرکے معاف کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

☆☆☆

کوثر نے جھنجلاہٹ کے ساتھ بیگ کی زپ بند کی اور ایک طائرانہ نظر سارے کمرے پر ڈالی، ساتھ ایک کیفیت دکھ اور غصے کی تھی بھرا پرا گھر بار چھوڑ کر جانا اتنا آسان تو نہیں تھا۔

"رکھ لیا سب کچھ۔" وحید عجلت بھرے انداز میں اندر داخل ہوا تو کوثر نے غصے سے اسے دیکھا۔

"اتنے سے بیگ میں سب کچھ کیسے رکھ سکتی ہوں، تمہاری بہن تو منحوس تھی ہی لیکن بھانجی اس سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ نہ وہ اس سردار کی نظر میں آتی اور نہ یوں ہمیں دربدر ہونا پڑتا، خود جا کر اپنے اس کروڑپتی تایا کے محل میں راج کررہی ہوگی اور ہم اس کی وجہ سے ذلیل ہورہے ہیں پتا نہیں ہم نے کون سا گناہ کیا ہے۔ جس کی وجہ سے یوں مصیبت میں پڑگئے ہیں۔"

اللہ سے یہ شکوہ کرتے ہوئے وہ بھول گئی کیسے اس نے ایک یتیم پر زندگی تنگ کی ہوئی تھی۔ وحید الماری سے بچا کچا سامان نکال رہا تھا، اس کی دہائی پر پلٹ کر اسے دیکھا۔

"اپنی لالچ کی بات نہ کرنا جس کی وجہ سے یہ دن دیکھنا پڑا ہے وہ تم ہی تھیں نا جس نے مجھے سردار سے پیسے مانگنے کو کہا تھا۔"

"ہاں تو غلط کیا کہا تھا تمہارے فائدے کے لیے کہا تھا۔" وہ بجائے شرمندہ ہونے کے الٹا چمک کر بولی۔

"ابھی اس بحث کا فائدہ نہیں جتنا سمیٹ سکتی ہو سمیٹو، ساجد اپنی سوزوکی لے کر آتا ہوگا، ہمیں دن نکلنے سے پہلے یہاں سے نکلنا ہوگا۔" وہ بیگ گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر نکلا اور اس کے پیچھے بڑبڑاتی ہوئی کوثر۔

"سنو" بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے وحید نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"ہم کب تک واپس آئیں گے۔" وحید نے ماتھے پر بل ڈال کر ناگواری سے اسے گھورا۔

"الٹے سوال کرکے میرا دماغ خراب نہ کرو کوثر! حالات تمہارے سامنے ہیں، مجھے کیا پتا معاملہ کب تک ٹھنڈا ہوتا ہے، جب تک سردار کو دوسری لڑکی نہیں مل جاتی یا زیمل کی شادی نہیں ہوجاتی تب تک ہمیں چھپ کر ہی رہنا ہوگا۔"

"یا اللہ ہم پر رحم کر۔" کوثر نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور سر پر چادر ٹھیک کرتی وحید کے پیچھے آئی جو بیرونی دروازہ کھول رہا تھا لیکن دروازہ کھلتے ہی دونوں میاں بیوی کے ہاتھ میں پکڑے بیگ چھوٹ کر زمین پر گرے تھے انہیں بالکل امید نہیں تھی رات کے دو بجے جب آدمی دنیا سو رہی ہوتی ہے سردار اپنے آدمیوں سمیت اس کے گھر کے دروازے کے آگے کھڑا ہوگا۔

☆☆☆

بارش کے بعد موسم خوش گوار ہوگیا تھا۔ وہ چھت پر آگئیں جہاں تیز چلتی ٹھنڈی ہوا انہیں سکون دے رہی تھی۔ قدیم طرز پر بنا لیکن جدید سہولتوں سے مزین یہ گھر وسیع رقبے پر پھیلا تھا۔ جس میں تین خاندان آباد تھے۔ اس کی ساس اور ان کے ساتھ اس کی بیوہ نند اور اس کے دو بچے...... دوسرے پورشن میں اس کے جیٹھ ان کی بیوی اور بچے اور اوپر والے پورشن میں وہ ان کا شوہر اور بیٹی...... ان کے شوہر مقصود زیادہ تر شہر سے یا ملک سے باہر آتے جاتے رہتے تھے گھر ان کا قیام کم ہوتا تھا جبکہ ان کا لاڈلہ چھیتا بیٹا، ان سے دور دوسرے شہر میں تعلیم کے سلسلے میں گیا تھا۔

کوئی بھی اس کے حق میں نہیں تھا کہ ثاقب اتنی دور جا کر پڑھے یہاں بھی بہت سی اچھی اچھی یونی ورسٹیاں تھیں...... ثاقب بھی ان سے خاص طور پر اپنی ماں سے دور جانا نہیں چاہتا تھا لیکن ان کی ضد کے آگے کسی کی نہیں چلی سب کتنی دیر ان سے ناراض رہے۔ انہیں بے حس، سنگ دل، کٹھور پتا نہیں کیا کیا لقب ملے لیکن یہ وہ ہی جانتی تھیں، کیسے اپنے دل پر پتھر رکھ کر انہوں نے اپنے بیٹے کو خود سے دور کیا ہے۔ دنیا اور گھر والوں کے لیے وہ تعلیم کے حصول کے لیے اپنوں سے دور گیا تھا جبکہ حقیقت میں وہاں جانا کیوں ضروری تھا یہ صرف وہ اور ثاقب ہی جانتے تھے۔

"ممی" چہل قدمی کے ساتھ ان کا دماغ بھی مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا جب کنزہ کی آواز پر وہ چونکیں۔

"پاپا آئے ہیں۔" کنزہ کی بات پر وہ حیران ہوئیں کیونکہ مقصود اتنی جلدی واپس نہیں آتے تھے۔ "کہیں ثاقب کی کوئی شکایت تو نہیں آئی۔" اس خیال کے آتے ہی وہ پریشانی سے تیز تیز چلتی سیڑھیوں کی طرف بڑھیں...... راہداری کے کونے پر کھڑے ہو کر انہوں نے اپنی سانسوں اور حواسوں کو بحال کیا کہ اگر کچھ گڑبڑ ہوئی ہوتو وہ اس بگڑی سچویشن کو سنبھالنے کے لیے بالکل تیار تھیں...... بالوں کو ہاتھوں سے سنوار کر چہرے پر مسکراہٹ لیے وہ لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ جہاں مقصود صاحب ریلیکس انداز میں صوفے پر بیٹھے تھے۔ "السلام علیکم!" وہ سلام کرتی چند قدم آگے بڑھیں۔

"وعلیکم السلام" انہوں نے سنجیدہ انداز میں جواب دیتے غور سے انہیں دیکھا وہ بھی غور سے ان کی جانب دیکھتیں کچھ اخذ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں "مجھے دیکھ کر پریشان لگ رہی ہو۔" ان کے تیکھے انداز پر وہ الرٹ ہوئیں۔

☆☆☆

"سردار صاحب" اس کے منہ سے سرگوشی کے انداز میں نکلا۔ اور ڈر کے مارے وہ الٹے قدم پیچھے ہٹا۔

"بھاگنے کی تیاری تھی وحید اصغر" وہ کروفر سے چلتا اس کے بالکل سامنے آ کر کھڑا ہوا۔

"نہیں سردار صاحب، میری ساس بہت بیمار ہے، اس کی عیادت کے لیے جا رہے تھے۔" وہ گھگھیا کر بولا وہ کتنی دیر وحید کی شکل دیکھتا رہا۔

"میری منگیتر کہاں ہے؟" وہی سوال جس سے وہ دونوں میاں بیوی بھاگ رہے تھے۔ وحید نے بے ساختہ تھوک نگل کر خود کو آنے والے حالات کے لیے تیار کیا۔

''سرکار میں نہیں جانتا وہ اس وقت کہاں ہے میرا اس کی ماں سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔'' اگلے ہی پل اس کے منہ پر پڑنے والا طمانچہ اتنا زوردار تھا کہ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گرا تھا۔

''اتنے دن سے میں خود پر ضبط کیے صرف منہ سے بات کر رہا تھا تو تمہاری اتنی جرأت ہو گئی کہ مجھ سے جھوٹ بولو اور یہاں سے فرار ہو جاؤ تمہیں لگتا ہے مجھے دھوکا دینا اتنا آسان ہے یا تمہیں لگتا ہے ایسی کوئی جگہ ہے جہاں تم چھپ جاؤ اور میں ڈھونڈ نہ سکوں، جب تک مجھے زیمل مل نہیں جاتی میں تمہاری سانسیں تم پر تنگ کر دوں گا بتاؤ مجھے کہاں ہے وہ، ورنہ یہیں تمہاری قبر بنا دوں گا۔'' اسے گریبان سے دبوچ ایک جھٹکے سے اٹھا لیا گیا تھا۔ اس کے مضبوط ڈیل ڈول کے آگے وحید کا منحنی سا وجود بہت کمزور لگ رہا تھا۔

''سردار صاحب، رحم کریں میں نہیں جانتا وہ کہاں ہے؟'' سردار صاحب نے گہرا سانس لے کر اسے چھوڑ دیا تو وحید نے حیرت سے اسے دیکھا لیکن یہ حیرت ایک لمحے کے لیے تھی کیونکہ اس کے اگلے اشارے پر اس کے گارڈ بری طرح اسے لاتوں اور گھونسوں سے مار رہے تھے۔ کوثر جو بھی سی سائیڈ پر کھڑی تھی تیزی سے سردار کی طرف بڑھی اور اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''صاحب، اسے معاف کر دیں میں بتاتی ہوں زیمل کہاں ہے۔'' کوثر کی آواز پر مار کھاتے وحید نے زور سے آنکھیں بند کیں۔

''وہ اپنے تایا کے گھر ہے لاہور میں رہتے ہیں وہ، ہم نے بہت کوشش کی اسے یہاں لانے کی لیکن اس کے تایا کے آگے ہمارا بس نہیں چلا وہ جلد ہی زیمل کی شادی کروانے والے ہیں۔'' وہ جو دانت پر دانت جمائے وحید پر نظریں جمائے کوثر کی بات سن رہا تھا آخری جملے پر اس نے چونک کر کوثر کو دیکھا۔

''کیا کہا'' اسے لگا اس نے غلط سنا ہے۔

''وہ اس کی شادی کروانے والے ہیں۔'' وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

''میری منگیتر کی شادی وہ کیسے کسی اور سے کروا سکتا ہے۔'' وہ اتنی زور سے بولا کہ کوثر ڈر کے مارے دور پیچھے ہٹی۔

''سردار، وہ ان کی بھتیجی کے ساتھ ان کے بیٹے کی منگیتر بھی ہے، بچپن سے۔'' سردار نے نفی سے سر ہلایا۔

'وہ میری ہے بس۔'' وہ بارعب انداز میں بولا۔

''صاحب، روکیں انہیں مر جائے گا وہ۔'' کوثر نے ہاتھ جوڑ کر سردار سے التجا کی تو اس نے طیش بھری نظروں سے وحید کو دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے اپنے گارڈ کو روکا لیکن تب تک وحید کی حالت کافی خراب ہو چکی تھی کوثر بھاگ کر زمین پر گرے نیم بے ہوش وحید کو دیکھنے لگی۔

''تم لوگ کہیں جانے کی غلطی بھی مت کرنا ورنہ اگلی دفعہ میرے گارڈز کی ٹانگیں نہیں بندوقیں بولیں گی...... نام، نمبر، اور ایڈریس دو میرے ہونے والے سسر کا، میں خود جا کر اپنی دلہن کو لے کر آؤں گا۔'' سردار کے کہنے پر کوثر نے روتے ہوئے اپنے پرس سے فون نکال کر نمبر اسے دیا۔

''میرے بندے تمہارے گھر کے باہر ہی کھڑے ہیں، بھاگنے کی سوچنا بھی مت۔'' کہہ کر وہ مڑ گیا اور اس کے پیچھے اس کے گارڈ بھی نکل گئے کب سے ضبط سے روتی کوثر نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا تھا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے اپنے پرسنل گارڈ کو وہ نمبر دیا۔

''کل صبح مجھے اس آدمی کی پوری تفصیل چاہیے۔''

''جی سردار صاحب، ہو جائے گا۔'' اس کے کہنے پر سردار کار کے شیشوں سے باہر دیکھنے لگا جہاں مکمل اندھیرے میں کہیں کہیں کوئی بلب روشن تھا۔

ساری رات اس نے بے چینی سے گزاری تھی، اپنی مضطرب کیفیت پر وہ خود بھی حیران تھا، پہلی دفعہ تھا کہ کوئی لڑکی اس قدر اس کے حواسوں پر سوار ہوئی تھی وہ تو تین چار ماہ بعد ہی کسی بھی لڑکی سے بیزار ہو جاتا تھا لیکن وہ لڑکی جس کو اس نے صرف دو دفعہ دیکھا تھا وہ کوشش کے باوجود اس کو اپنے دماغ سے نکالنے میں ناکام تھا، وہ پہلی لڑکی تھی جس کو اس نے نکاح میں لینا چاہا تھا ورنہ اس سے پہلے تو اسے ہر پسندیدہ لڑکی آسانی سے میسر آ جاتی تھی اسے تو بہت آسان لگا تھا اس لڑکی کا حصول، جس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ اس نے اس کے لالچی ماموں ممانی کو لاکھوں دے کر اپنے نام بھی کر لیا تھا پھر ایسا کون سا اس کا سرپرست پیدا ہو گیا تھا جس نے اس سے ٹکر لی تھی اور جس کا اتنا رعب تھا کہ وحید اصغر جیسا کمزور آدمی اس کی دہشت بھول گیا تھا اسے صبح کا انتظار تھا۔

فریش ہو کر وہ لاؤنج میں آیا تو ملازم صفائی میں مشغول تھا، وہ سر سے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے ڈائننگ روم کی طرف بڑھا جہاں اس کی ملازمہ ناشتا لگا رہی تھی۔ وہ اس وقت اپنے ذاتی فلیٹ میں تھا اس لیے اس کے علاوہ صرف اس کا اسٹاف تھا وہ ناشتا کر رہا تھا جب آہٹ پر ہاتھ روک کر پیچھے دیکھا جہاں اس کا پرسنل گارڈ کھڑا اس کے فری ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

''آؤ نبیل'' اس کے اشارہ کرنے پر وہ آگے آیا تو سردار نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے اسے بیٹھنے کو کہا۔

''ناشتا کرو۔''

''سر، کر چکا ہوں۔'' وہ مودب ہو کر بولا۔

''ہوں'' اس نے ہنکارا بھرا۔

''کیا رپورٹ ہے۔''

''سر، جو نمبر آپ نے دیا تھا وہ غلام عباس ہیں، وہ بہت فیس بزنس مین ہیں انٹرنیشنل لیول پر ان کا بزنس پھیلا ہے، دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے اس کے علاوہ مضبوط بیک گراؤنڈ والا جاگیردارانہ گھرانہ ہے ان کا۔ زیمل بی بی ان کے چھوٹے بھائی کی بیٹی ہیں۔''

''ہوں اس کے علاوہ اور کچھ'' نبیل نے ایک نظر اس کے بارعب سنجیدہ چہرے کو دیکھا۔

''غلام عباس کی پہنچ بہت اوپر تک ہے، سیکورٹی بھی ٹھیک ٹھاک ہے، زیمل بی بی کو وہاں سے نکالنا اتنا آسان نہیں، وہاں وہ خود زیمل بی بی کو آپ کے حوالے کر دیں تو معاملہ بگڑے بغیر سلجھ سکتا ہے۔'' نبیل کے کہنے پر وہ مبہم انداز میں مسکرایا۔

''میں جانتا ہوں کہ جب گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو انگلی کو کب اور کتنا ٹیڑھا کرنا ہے۔'' کہہ کر اس نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا جبکہ نبیل منتظر نظروں سے اسے دیکھتے نئے آرڈر کا منتظر تھا۔

☆☆☆

کار کے ہارن پر گیٹ کے اندر موجود گارڈ نے گیٹ کی کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا اور گاڑی اور گاڑی کا نمبر دیکھ کر اس نے گیٹ کھول دیا۔ کار اندر داخل ہوتے پورچ میں جا کر رکی۔ غلام عباس کے اترتے ہی ان کے گارڈ بھی اتر کے کھڑے ہو گئے۔ گیٹ پر موجود گارڈ کے سلام کرنے پر وہ سر ہلاتے مرکزی دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئے تو سامنے ہی لاؤنج میں موجود صوفے پر غیور صاحب بیٹھے یقیناً ان ہی کے منتظر تھے۔

''السلام علیکم''

''وعلیکم السلام''! آگے بڑھتے ان سے بغل گیر ہوئے۔

''خیریت تھی آپ نے اتنی ایمرجنسی میں مجھے ملنے کا کہا؟'' غیور صاحب نے بیٹھتے ہوئے بغور اپنے بھائی

کا چہرہ دیکھا۔
''ہاں سب خیریت ہے ویسے ہی تم سے ملنے کو دل تھا۔'' وہ ان کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ اپنے موبائل پر پتا نہیں کیا تلاش کر رہے تھے۔
''کچھ پریشان لگ رہے ہیں'' غیور صاحب کے کہنے پر انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔ کچھ دیر تذبذب کی کیفیت میں غیور صاحب کا چہرہ دیکھتے رہے کہ ان سے فرحانہ اور وحید کے فون کے متعلق بات کی جائے یا نہیں۔
''بھائی، مجھے بتائیں اگر کوئی مسئلہ ہے تو'' وہ عباس صاحب کے چہرے پر کشمکش کی کیفیت محسوس کرتے الرٹ ہو کر سیدھے بیٹھ گئے کیونکہ عباس صاحب کم چیزوں کو لے کر پریشان ہوتے تھے۔ اب اگر وہ پریشان ہیں تو ضرور کوئی بڑی بات تھی، غیور صاحب کے تجس انداز پر انہوں نے سر جھٹکا اور مسکرا کر انہیں دیکھا۔
''پریشانی والی کوئی بات نہیں بس تھک گیا تھا سوچا تم سے گپ شپ کرلوں موڈ ٹھیک ہو جائے گا۔'' ان کے ہلکے پھلکے انداز پر غیور صاحب بھی قدرے ریلیکس ہوئے۔
''فضیلت، چائے لے آؤ بھائی آ گئے ہیں۔'' انہوں نے کچن کی طرف منہ کر کے آواز لگائی اور دوبارہ عباس صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔
''آپ کی اچانک کال آئی تو میں تھوڑا پریشان ہو گیا کیونکہ اس سے پہلے مجھے محمد اکبر کی بھی کال آئی تھی۔'' انہوں نے اپنے وکیل کا نام لیا تو عباس صاحب نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔
''وہ کہہ رہا تھا آپ نے آج اسے ملنے بلایا تھا لیکن جب وہ آفس پہنچا تو آپ نے میٹنگ کینسل کر دی آپ تو کبھی ایسے نہیں کرتے تو وہ بھی تھوڑا پریشان ہو گیا تھا۔''
''بتایا تو ہے آج تھک گیا تھا دل ہی نہیں کر رہا تھا کوئی کام کرنے کا۔'' انہوں نے کہنے کے ساتھ اپنی دو انگلیوں سے اپنی کنپٹی کو دبایا۔
''فضیلت'' اب کے غیور صاحب تقریباً دہاڑے تھے۔ غلام عباس نے چونک کر ان کا غصیلہ چہرہ دیکھا۔
''کیوں اتنا غصہ کر رہے ہو۔''
''عجیب ڈھیٹ عورت ہے، کب کا اسے کہا ہوا ہے عباس بھائی آ رہے ہیں چائے تیار رکھنا، تین کام والی ساتھ کچن میں موجود ہیں لیکن اس کے باوجود وہی کاہلی'' ان کے لہجے میں غصے کے ساتھ تلخی تھی۔ اس سے پہلے عباس صاحب انہیں کچھ کہتے فضیلت لاؤنج میں داخل ہوئیں ان کے پیچھے ٹرالی گھسیٹتی ان کی کام والی تھی۔
''السلام علیکم عباس بھائی کیسے ہیں آپ؟''
''وعلیکم السلام الحمدللہ تم سناؤ۔''
''میں بھی ٹھیک ہوں، معذرت چاہتی ہوں چائے لانے میں دیر ہو گئی یہ شمشاد کی بیٹی ابھی ابھی کام پر آئی ہے اسے صحیح سے کام کرنا نہیں آتا کباب اور نگٹس فرائی کرنے سے زیادہ جلا کر سیاہ کر دیے تھے، انہیں دوبارہ فرائی کرنے میں ٹائم لگ گیا۔''
وہ اپنی صفائیاں دینے کی عادی نہیں تھیں۔ لیکن سامنے ان کے جیٹھ تھے جن سے وہ کیا سارا خاندان ڈرتا تھا۔ کہنے کے ساتھ انہوں نے دزدیدہ نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھا جو اب بھی ماتھے پر بل ڈالے انہیں گھور رہے تھے۔ چائے کی پیالی عباس کو پکڑا کر وہ غیور صاحب کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئیں۔
''بھابھی اور شاہانہ کو بھی لے آتے۔'' مسلسل خاموشی سے فضیلت کو اب الجھن ہونے لگی تھی اس لیے اس نے کچھ بات کرنے کے لیے جیٹھانی اور نند کا پوچھ لیا۔
''میں آفس سے سیدھا ادھر آ رہا ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے جواب دے کر چائے پینے لگے۔

"بھائی صاحب، کچھ لیں ساتھ۔" فضیلت کے کہنے پر انہوں نے ٹیبل کی طرف دیکھا جو مختلف چیزوں کے ساتھ بھری تھی انہیں بھوک نہیں تھی لیکن انکار کرنا انہیں مناسب نہیں لگا تو ایک کباب انہوں نے اپنی پلیٹ میں ڈال لیا۔

"بھائی، آپ نے بتایا ہی نہیں کہ آپ زیمل کو لے آئے ہیں۔" غیور صاحب کے کہنے پر غلام عباس نے گہرا سانس لیا۔

"کچھ عرصے بعد بھی تو اس نے آنا ہی تھا تو سوچا پہلے ہی لے آؤں۔"

"تو کیا آپ نے فرحانہ کو معاف کر دیا اب کیا ہمیں اسے ملنا جلنا پڑے گا۔" یہ سوال فضیلت کی طرف سے آیا تھا، غلام عباس نے جس طرح فضیلت کی طرف دیکھا تھا غیور صاحب کا دل چاہا اس عورت کا منہ توڑ دیں۔

"لڑائی تو اس سے پہلے بھی کوئی نہیں تھی غلط فہمی تھی ایک جواب دور ہو گئی ہے۔" عباس صاحب نے تحمل سے اس کا جواب دیا۔

"لیکن عباس بھائی، اس نے دوسری شادی کر لی ہم سے پوچھے بغیر حالانکہ ایاز نے اس کی خاطر ہمیں چھوڑ دیا اور اسے دیکھ لیں ایاز کے مرتے ہی کسی اور سے رشتہ جوڑ لیا" فضیلت کے کڑواہٹ بھرے انداز پر غیور صاحب نے دانت پیسے۔

"فضیلت، ایاز کی جب ڈیتھ ہوئی وہ بمشکل چونتیس سال کا تھا اور فرحانہ تیس کی بھی نہیں تھی شادی اس کا حق تھا، اس نے کی مجھے اس بات پر اعتراض نہیں تھا مجھے اعتراض اس بات پر تھا کہ وہ زیمل کو ساتھ لے گئی لیکن وہاں بھی میں نے اس لیے خاموشی اختیار کی کیونکہ ایک ماں بیٹی کی بہترین پرورش کر سکتی ہے، اب وہ سمجھدار ہو چکی ہے اور اس کا گھر بھی یہی ہے جو اس کے باپ کا گھر ہے جو اس کے شوہر کا گھر ہے۔" اب کے ان کا لہجہ سنجیدہ ہونے کے ساتھ دوٹوک بھی تھا۔

"فضیلت، کھانے کا انتظام دیکھو۔" ان کو مزید منہ کھولتا دیکھ کر غیور صاحب بولے۔

"نہیں غیور، کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

"کیوں بھائی، کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔"

"چائے کے ساتھ کباب اور کیک لے لیا، بس کافی ہے۔" وہ خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے بولے۔

"تو ابھی آپ نے زیمل کے بارے میں کیا سوچا ہے۔" غیور صاحب کے سوال پر عباس نے سنجیدگی سے انہیں دیکھا۔

"سوچنا کیا ہے فیصلہ تو ہو چکا ہے بس اب عمل کرنا ہے لیکن میں چاہتا تھا زیمل ایم اے نہیں تو گریجویشن تو کمپلیٹ کرے، باقی نفیس اور حارث سے مشورہ کروں گا اگر حارث ابھی تیار ہے تو ہالہ کے بعد ان کی شادی کر دیتے ہیں، پڑھائی ساتھ ساتھ جاری رہے گی۔"

"ہالہ" غیور صاحب نے چونک کر عباس صاحب کو دیکھا۔ "ہالہ تو سب سے چھوٹی ہے بھائی اور ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے۔"

"ہاں لیکن اگر اچھا رشتہ موجود ہو تو دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

"تو آپ کی نظر میں کوئی اچھا رشتہ ہے۔" غیور صاحب نے اضطرابی انداز میں پہلو بدلا خاموشی سے سنتی فضیلت نے اپنے شوہر کے بدلتے تاثرات کو بغور دیکھا تھا۔

"ہاں ان شاء اللہ کو جانتے ہو نا، سرجیکل انڈسٹری والے۔"

"جی" غیور صاحب نے سر ہلایا "ان کا بیٹا ہے، انجینئر ہے انہوں نے بات کی تھی لیکن باقاعدہ طور پر بات

نہیں ہوئی وہ اپنی فیملی کے ساتھ آنا چاہتے ہیں لیکن میں نے ابھی روک دیا ہے۔‘‘ غیور صاحب نے گہرا سانس لیا۔

’’بھائی، اتنی جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ٹھیک ہے رشتہ اچھا ہے ہمارے رشتے دار ہیں لیکن تھوڑا ٹھہر جائیں ابھی۔‘‘

’’ہاں میں نے ابھی سوچا ہے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔‘‘ عباس صاحب اپنی ادھیڑ بن میں تھے اس لیے غیور صاحب کے انداز پر غور نہیں کیا۔ لیکن فضیلت کو سب سمجھ آ رہی تھی وہ جو وحید اور فرحانہ کے فون کے بعد پریشان ہو گئے تھے یہاں آ کر تھوڑا ریلیکس ہو گئے تھے۔

’’اتنا کچھ بنا لیا اور نواب صاحب نے کچھ لیا ہی نہیں، دو گھنٹے کچن میں برباد کیے۔‘‘ وہ کیک، چاٹ، شامی کباب، نگٹس کو ایئر ٹائٹ باکس میں رکھنے کے ساتھ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہی تھیں کیونکہ کچن میں ان کے علاوہ دو ملازمائیں بھی موجود تھیں۔

’’ثریا، یہ سب ڈبے دیکھ کر رکھ لینا کون سے کیبنٹ میں اور کون سے فریج میں رکھنے ہیں، اور بھنڈی گوشت غیاث نہیں کھائے گا تو دال کے ساتھ چاول ابال لینا، جب بن جائیں تو مجھے بتا دینا۔‘‘

’’جی‘‘ ثریا سر ہلا کر سنک کی طرف مڑ گئی جہاں چائے کے برتن دھلنے والے تھے۔ فضیلت نے بیٹھتے ہوئے بغور اپنے شوہر کی شکل دیکھی۔

’’کیا بات ہے جب سے بھائی صاحب گئے ہیں آپ پریشان لگ رہے ہیں۔‘‘

’’پریشان تو نہیں لیکن کچھ سوچ رہا ہوں۔‘‘ وہ پرسوچ انداز میں ٹی وی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

’’ایسی بھی کیا بات ہے جو آپ اتنی گہری سوچ میں ڈوبے ہیں۔‘‘

’’بھائی، آج یونہی نہیں آئے مجھے لگتا ہے کوئی تو بات تھی، جو وہ آئے تھے لیکن یہاں آ کر ان کا ارادہ بدل گیا۔‘‘ وہ مسلسل سوچتے ہوئے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔

’’آپ تو ایسے پریشان ہو رہے ہیں جیسے وہ ساری دل کی باتیں ہمیشہ سے آپ سے کرتے رہے ہیں۔‘‘ وہ برا مانتے ہوئے بولیں۔

’’زیمل کی بات لے لیں کہاں سالوں شکل نہیں دیکھی، اچانک اسے لے آئے اور ہمیں بتانا ضروری نہیں سمجھا اور شاہانہ اسے بھی پتا تھا اس نے بھی آپ کو کچھ نہیں بتایا۔‘‘ غیور صاحب جو ابھی تک ادھیڑ بن میں تھے غصے سے فضیلت کو دیکھا۔

’’تمہاری زبان کبھی کنٹرول میں رہتی ہے یا نہیں، بھائی صاحب کے سامنے بھی جو تمہارے منہ میں آ رہا تھا بکتی جا رہی تھیں۔‘‘

’’میں آپ کی ہمدردی میں بھی بولوں تو بھی آپ کو میں ہی بری لگتی ہوں۔‘‘ وہ ناراضی سے بولیں۔

’’تم اپنی ہمدردی اپنے پاس ہی رکھا کرو۔ ضرورت نہیں مجھے۔‘‘ وہ سر جھٹک کر بولتے کھڑے ہو گئے۔

’’اب جا کہاں رہے ہیں، کھانا تیار ہے۔‘‘

’’حارب کو فون کرنا ہے، تم کھانا لگواؤ میں آتا ہوں۔‘‘

’’حارب کو کیوں فون کرنا ہے۔‘‘ غیور صاحب نے مڑ کر ابرو اچکائے۔

’’تم پاگل تو نہیں ہو گئیں فضیلت! کیسے فضول سوال کر رہی ہو اب اپنے بیٹے سے بات کرنے کے لیے مجھے کسی وجہ کی ضرورت ہو گی۔‘‘ کہہ کر وہ رکے نہیں جبکہ فضیلت کھڑے کھڑے تلملا اٹھی تھیں ’’چوتھی بیل پر فون اٹھا لیا گیا تھا۔

''ہیلوابا، خیریت اس ٹائم کال کی آپ نے۔''
''برخوردار، پہلے سلام کرتے ہیں پھر حال چال پوچھتے ہیں، گوروں کے دیس میں رہ کر اپنی روایات بھول گئے ہو۔'' غیور صاحب کی ملامت بھری آواز پر وہ ہنس پڑا تھا۔
''کچھ نہیں ابا، بس اچانک اس ٹائم آپ کی کال دیکھ کر تھوڑا حیران ہو گیا تھا۔''
''کیوں تم بزی ہو؟''
''نہیں اتنا خاص نہیں آپ بتائیں خیریت ہے سب۔''
''ہاں خیریت ہے بس تم سے کچھ مشورہ کرنا تھا۔''
''جی بتائیں۔'' ''آج تمہارے تایا آئے تھے، بتا رہے تھے وہ ہالہ کا رشتہ کرنے کا سوچ رہے ہیں۔'' حارب حیران ہوا وہ اسے یہ کیوں بتا رہے تھے۔
''سن رہے ہو حارب'' اس کی خاموشی پر زور سے بولے۔
''سن رہا ہوں ابا، یہ تو اچھی اور خوشی کی بات ہے، اس میں آپ مجھ سے کیا مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔''
''میں تمہاری مرضی جاننا چاہتا ہوں۔''
''میری مرضی'': وہ اب الجھا تھا۔
''ہاں میں ہالہ کو اپنی بہو بنانا چاہتا ہوں۔'' حارب کی الجھن جیسے دور ہوئی اس نے گہرا سانس لیا۔
''ابا میں نے دس سال یا اس سے بھی زائد عرصہ ہو گیا ہے ہالہ کو دیکھا بھی نہیں اور اگر دیکھا بھی ہوتا تو بھی مجھے ہالہ سے شادی نہیں کرنی مجھے کزن میرج میں کوئی انٹرسٹ نہیں۔''
''اس بات کا کیا مطلب ہے حارب'' غیور صاحب کی آواز بے حد سنجیدہ تھی۔
''کیا تم کسی اور میں انٹرسٹڈ ہو۔''
''نہیں فی الحال ایسی کوئی لڑکی نہیں جس کے لیے میں سیریس ہوں مجھے پتا ہے آپ کو یہ ڈر ہے میں یہاں سے کوئی انگریز نہ لے آؤں تو بے فکر رہیں، دوستی کے لیے یہاں کی لڑکیاں اچھی ہیں لیکن اپنے ہمسفر کے لیے میری سوچ وہی مشرقی ہے، پردہ دار، شریف، گھریلو۔''
''اگر یہی تمہارا شادی کے لیے معیار ہے تو ہالہ اس پر پوری اترتی ہے۔''
''ابا، اگر آپ کو ہالہ اتنی پسند تھی تو آپ غیاث سے کر دیتے، میرا خیال ہے غیاث اس رشتے سے خوش بھی ہوتا۔''
''غیاث تو خوش ہوتا لیکن کیا عباس بھائی خوش ہوتے؟ وہ اپنی اکلوتی لائق بیٹی کا رشتہ اس ایف اے پاس کو دیتے۔'' وہ ناراضی سے بولے۔
''تایا جی کا اسٹینڈرڈ تو ہمیشہ سے اونچا رہا ہے میرا نہیں خیال اپنی بیٹی کے معیار کا انہیں کوئی ملے گا۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔
''تم بلے بغیر جواب دے کر اچھا نہیں کر رہے۔ میں جانتا ہوں یہ سارا زہر تمہاری ماں نے بھرا ہے تمہارے دماغ میں، ہالہ سے شادی کر کے تمہیں ہی فائدہ ہوتا لیکن جیسی بد دماغ ماں ویسا بد دماغ بیٹا، تم بھی واپس آ کر اپنی ماں کے جاہل خاندان میں شادی کر لینا۔'' کہہ کر انہوں نے غصہ سے فون ہی بند کر دیا۔ غصے کے مارے ان کا برا حال تھا بس نہیں چل رہا تھا حارب کا حشر کر دیں۔ لیکن وہ جوان بیٹے کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے تھے، جانتے تھے وہ کتنا خودسر تھا زبردستی کرتے تو شاید مڑ کر واپس ہی نہ آتا۔

☆☆☆

ٹریڈمل سے اترتے ہی وہ بینچ پر بیٹھ گئی اور بوتل منہ سے لگا کر پانی کے بڑے گھونٹ لیے، تولیے سے منہ صاف کر کے اس نے بیگ سے شرٹ نکالی اور ٹی شرٹ کے اوپر پہن لی۔ تب ہی اس کے بیگ میں رکھا فون بج اٹھا۔ اسکرین پر ظہیر کا نام دیکھ کر اس نے گرین نشان پر انگلی رکھ کر کال ریسیو کر لی۔

''کہاں ہو'' اس نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

''جم میں ہوں کیوں سب ٹھیک ہے۔''

''ہاں سب ٹھیک ہے میں تمہیں لینے آیا تھا لیکن میم عشنا بتا رہی تھیں تم گھر نہیں۔'' فائزہ نے گہرا سانس لیا۔

''میں تھوڑی دیر میں گھر پہنچ جاؤں گی لیکن اتنا کون سا ضروری کام تھا جو تم اتنی ایمرجنسی میں مجھ سے ملنا چاہ رہے ہو۔'' وہ اب اپنا سامان سمیٹ رہی تھی۔

''امی نے کہا تمہیں لے آؤں، اداس ہیں تمہارے بغیر۔'' وہ جو دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی اور ظہیر کی طرف سے کسی رومانٹک جملے کی منتظر تھی دل مسوس کر رہ گئی۔

''ٹھیک ہے تم آدھے گھنٹے بعد مجھے گھر سے پک کر لینا۔'' کہہ کر اس نے فون بند کر دیا جب وہ گھر پہنچی رضا صاحب لان میں ہی بیٹھے تھے، وہ گاڑی سے اتر کر سیدھی ان کی طرف آ گئی۔

''گڈ ایوننگ پاپا''

''گڈ ایوننگ بچے'' انہوں نے مسکرا کر اس کا سر سہلایا تو وہ مسکراتی ہوئی ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''آج آپ گھر پر اکیلے؟'' اس نے اردگرد نظر ڈال کر پوچھا۔

''ہاں آج موڈ نہیں تھا آفس جانے کا اور عشنا اپنی ماں کی طرف گئی ہے۔''

''تم یونی ورسٹی نہیں گئیں۔'' انہوں نے اس کا حلیہ دیکھ کر پوچھا تو ان کی بے خبری پر وہ مسکرا کر رہ گئی۔

''آج کل چھٹیاں ہیں۔'' ''ہوں'' وہ ہنکارا بھر کر موبائل دیکھنے لگے۔ پاپا خالہ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں، ظہیر لینے آئے گا میں چلی جاؤں۔''

''ہاں فائزہ، اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے میں نے کبھی تمہیں روکا ہے کسی بات میں۔'' ان کی بات پر فائزہ نے گہرا سانس لیا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ، واقعی آپ نے مجھے کبھی کسی بات سے نہیں روکا چاہے وہ ٹھیک ہو یا نہیں۔'' اس کی بات پر انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا'' ان کی سنجیدگی پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''مذاق کر رہی تھی پاپا اچھا ایک اور بات تھی۔'' وہ کھڑے ہوتے بولی۔ ''فرائیڈے کو آپ میرے لیے ٹائم نکال سکتے ہیں۔'' رضا صاحب نے اب غور سے اپنی بیٹی کا چہرہ دیکھا۔

''کوئی خاص بات ہے۔''

''پاپا، میں آپ کے ساتھ ٹائم سپینڈ کرنا چاہتی ہوں صرف میں اور آپ..... کیا آپ مجھے اپنا کچھ ٹائم دے سکتے ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''میرا سارا وقت میری بیٹی کے لیے ہے۔'' ان کے کہنے پر وہ مسکرائی۔

''ٹھیک ہے پھر ریڈی رہیے گا۔ میں آپ کو وقت اور جگہ بتا دوں گی، دونوں باپ بیٹی شاندار سا ڈنر کریں گے۔'' وہ ایک دم بہت خوش ہو گئی تھی اور اسے یوں خوش دیکھ کر رضا صاحب کو اپنے دل میں سکون اترتا محسوس ہوا۔

☆☆☆

بالوں کو سیدھا کر کے اس نے کان کے اوپر سے بالوں کو تھوڑا اونچا کر کے کیچر لگایا اور تنقیدی نظر ڈال کر اس نے خود پر اسپرے کیا۔ دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی دروازہ کھول کر نرگس آنٹی اندر داخل ہوئیں۔

"بے بی، باہر ظہیر میاں آئے ہیں۔" ان کی اطلاع پر اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا اپنا کلچ اور موبائل اٹھایا۔ اور تیزی سے باہر نکلی۔

"پاپا گھر پر ہیں۔"

نہیں ابھی ابھی باہر نکلے ہیں۔"

"عشنا ان کے ساتھ ہے۔" وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر رہی تھی جبکہ نرگس بھی اس کے پیچھے آرہی تھیں۔

"نہیں وہ ابھی آئی ہیں موڈ کچھ خراب لگ رہا ہے۔" تیزی سے چلتی فائزہ بے ساختہ رکی تھی اس نے مڑ کر نرگس کو دیکھا تھا اور پھر سر جھٹک کر قدم بیرونی دروازے کی طرف بڑھا دیے۔ اس کے بیٹھنے پر ظہیر نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور کار اسٹارٹ کر دی مسلسل خاموشی پر فائزہ نے گہرا سانس لے کر چہرے کا رخ ظہیر کی طرف کیا۔

"پھوپھو نے اتنی اچانک بلایا خیریت تھی۔"

"امی نے نہیں بلایا۔"

"تو پھر" وہ حیران ہوئی۔

"میں نے جان بوجھ کر امی کا نام لیا اور ویسے تم سے ساتھ چلنے کا کہتا تو تم نے انکار کر دینا تھا۔" وہ سامنے دیکھتا بات کر رہا تھا، فائزہ جو اسے دیکھ رہی تھی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"تمہاری ناراضی اب بھی ختم نہیں ہوئی۔"

"میں ناراض نہیں۔" اس کے پوچھنے پر وہ آہستگی سے بولی۔

"تو پھر میری کالز اور میسجز کا جواب کیوں نہیں دے رہی تھیں۔"

"ظہیر تم جانتے ہو میری زندگی میں دو لوگ ہیں جن کا رویہ مجھے افیکٹ کرتا ہے ایک پاپا اور ایک تم، میں نے ممی کے بعد اپنی سالگرہ سیلیبریٹ کرنا چھوڑ دی تھی۔ لیکن تم نے کہا تم میرے ساتھ میری سالگرہ سیلیبریٹ کرنا چاہتے ہو، پاپا بھی پاکستان میں نہیں تھے صرف تمہاری خاطر میں نے اتنا اہتمام کیا، ساری شام تیار ہو کر تمہارا انتظار کرتی رہی، شام سے رات ہو گئی تم نہیں آئے اور نہ میرے کسی فون اور میسجز کا ریپلائے کیا، تم اندازہ کر سکتے ہو وہ پل میرے لیے کتنے اذیت ناک تھے ایک بار پھر تم نے اس دن سے جڑی میری تلخ یادوں کو تازہ کر دیا اور تم کہہ رہے ہو میں ناراضی بھی ظاہر نہ کروں اور سچ پوچھو تو میں ناراض ہوں بھی نہیں میں ہرٹ ہوئی ہوں۔"

وہ رونا نہیں چاہتی تھی پر آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں جنہیں وہ پلکیں جھپک جھپک کر روک رہی تھی۔

"آئی ایم سوری فائزہ، میں پہلے ہی تمہیں کہہ چکا ہوں میں تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ تمہاری خوشی کے لیے وہ شام سیلیبریٹ کرنا چاہتا تھا لیکن پتا نہیں کیسے میرے ذہن سے نکل گیا اور اسے میری بدقسمتی کہہ لو اس دن میرے موبائل کی بیٹری بھی ختم ہو گئی۔" اس کی وضاحت پر فائزہ نے گہرا سانس لیا۔

"اب اس وضاحت کا کوئی مطلب نہیں، ظہیر اس دن کے ساتھ ایک اور بری یاد جڑ چکی ہے۔" اب کی بار ظہیر کچھ نہیں بولا تھا۔

"یہ ہم کہاں جا رہے ہیں، گاڑی کو مختلف روٹ پر جاتے دیکھ کر وہ بے ساختہ بولی۔

"اس دن جو سیلیبریشن ادھوری رہ گئی تھی اس کو پورا کرنے۔"

"نہیں ابھی میرا موڈ نہیں تم پلیز مجھے گھر لے چلو میں خالہ سے ملنا چاہتی ہوں۔" اس کے کہنے پر ظہیر نے

ذرا کی ذرا گردن گھما کر اسے دیکھا اور اگلے ہی پل گاڑی کا رخ بدل چکا تھا۔
"کتنی کمزور ہو گئی ہو۔" کشور نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جانچتی نظروں سے اسے دیکھا۔
"خالہ آپ کو ایسا لگ رہا ہے ورنہ میں نے ویٹ گین کیا ہے۔"
خاک گین کیا ہے چہرہ دیکھو اپنا۔
"ارے سعدیہ لے بھی آؤ اب کب سے بہن سوکھے منہ بیٹھی ہے۔" وہ اونچی آواز میں بولیں۔
"آرہی ہوں امی۔" تب ہی سعدیہ ٹرے لیے اندر داخل ہوئی۔
"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم آج آنے والی ہو ورنہ تمہاری پسند کی چیزیں بناتی ابھی دہی بھلے اور کباب ہیں۔"
"وہ بسکٹ بھی تو رکھے تھے۔" کشور کے کہنے پر سعدیہ دوبارہ اٹھی تو فائزہ نے دوبارہ بٹھالیا۔
"امی روز تمہیں یاد کرتی ہیں۔" سعدیہ کے کہنے پر فائزہ نے مسکرا کر کشور کی طرف دیکھا۔
"خالہ، میں آپ کو اتنی یاد آتی ہوں تو گھر کیوں نہیں آتیں۔"
"اس گھر میں ہر طرف میری بہن کی یادیں بکھری ہیں دل ویسے ہی دکھتا ہے اور اوپر سے تمہارے باپ کی وہ نک چڑھی بیوی دیکھ کر تو میرا خون ہی کھول جاتا ہے، پتا نہیں تم کیسے اسے برداشت کرتی ہو۔" ان کے کہنے پر فائزہ نے بے ساختہ ہونٹ بھینچے۔
"چھوڑیں بھی امی۔" اس کا چہرہ دیکھ کر سعدیہ نے ماں کو مزید بات کرنے سے روکا۔
"چھوڑ کیسے دوں مجھے اندازہ ہے میری بچی کے دل پر کیا گزرتی ہوگی، جب وقت تھا تب تو رضا نے شادی کی نا اور اب اس عمر میں جب بیٹی کی شادی کی عمر ہو گئی ہے خود بیاہ رچا کر بیٹھ گیا ہے وہ بھی اپنے سے آدھی عمر کی لڑکی سے، اس عمر کا عشق بڑا خطرناک ہوتا ہے، تمہارا باپ تو اس لڑکی کے پیچھے بالکل باؤلا ہو گیا ہے، سب رشتے بھول گیا ہے، میں تو آتی نہیں تمہاری طرف پر رشتے داروں سے سننے کو ملتا رہتا ہے کیسے بے دریغ اس پر اور اس کے ٹٹ پونجیے خاندان پر پیسے لٹا رہا ہے۔"
ان کے لہجے میں اس کے باپ کے لیے ناراضی اور کڑواہٹ تھی جسے محسوس کر کے اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ ساتھ بیٹھی سعدیہ اور دور بیٹھے ظہیر نے اس کا موڈ آف ہوتا صاف محسوس کیا تھا
"امی، آپ کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی ہیں۔
فائزہ، آپ سے ملنے آئی ہیں اور آپ نے اس سے انکل کی برائیاں شروع کر دی ہیں۔"
ظہیر کے سنجیدہ انداز پر انہوں نے فائزہ کا چہرہ دیکھا۔
"بیٹا، میں تمہاری خالہ ہوں تمہاری ماں میری بہن ہی نہیں میری سہیلی بھی تھی اور تم میری بہن کی اکلوتی نشانی ہو، اس لیے ہر وقت فکر مند رہتی ہوں، لیکن جب سے رضا نے شادی کی ہے میری فکر پریشانی میں بدل گئی ہے۔" ان کے فکر مند لہجے پر فائزہ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر تھپتھپایا۔
"خالہ، پاپا بالکل پہلے کی طرح مجھ سے پیار بھی کرتے ہیں اور میرا خیال بھی رکھتے ہیں۔"
"اگر ایسا ہے تو بہت اچھی بات ہے لیکن پھر بھی تم آنکھیں اور کان کھلے رکھنا، پتا نہیں کس وقت جوان بیوی کا جادو سر چڑھ کر بولے اور اس کی آنکھوں پر پردہ پڑ جائے۔ وہ عورت تو کبھی نہیں چاہے گی کہ رضا تم پر دھیان دے، اس کا دھیان اپنی طرف کرنے کے لیے وہ ہر حربہ استعمال کرے گی، بس تم دھیان رکھنا کہیں ساری جائیداد اس عورت کے نام نہ کر دے۔" کشور بیگم کے کہنے پر سعدیہ نے ظہیر کی طرف دیکھا جو ماں کی باتوں پر جز بز ہو رہا تھا۔

"امی، بس کردیں، غلطی ہوگئی جو میں فائزہ کو یہاں لے آیا۔" وہ کھڑا ہوگیا۔
"چلو فائزہ تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔"
"ارے لڑکے، پاگل ہوگیا ہے ابھی تو آئی ہے میری بچی ڈھیر ساری باتیں کرنی ہیں جاؤ۔ سعدیہ رات کے لیے کچھ اچھا سا بنالو۔"
"نہیں خالہ، اس کی ضرورت نہیں۔"
"ضرورت کیوں نہیں کھانے کے بغیر جانے نہیں دوں گی۔"
"ٹھیک ہے آپ لوگ باتیں کریں میں کھانا باہر سے لے آتا ہوں۔" ظہیر نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور ایک نظر فائزہ پر ڈال کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

وہ گھر آئے تو لاؤنج میں مکمل خاموشی تھی۔ وہ متلاشی نظروں سے دیکھتے کچن کی طرف بڑھے جہاں نرگس موجود تھی آہٹ پر نرگس نے مڑ کر دیکھا۔
"سلام صاحب"
"وعلیکم السلام"
"گھر پر کوئی نہیں۔"
"عشنا بی بی اپنے کمرے میں ہیں اور فائزہ بے بی ظہیر میاں کے ساتھ ان کے گھر گئی ہیں۔"
"ہوں" ان کی تفصیل پر انہوں نے ہنکارا بھرا۔
"کھانا لگاؤں آپ کے لیے۔"
"عشنا نے کھالیا۔"
"جی انہوں نے کچھ باہر سے آرڈر کیا تھا۔" "ٹھیک ہے آپ جا کر اپنے کوارٹر میں آرام کریں اگر مجھے بھوک لگی تو میں خود لے لوں گا۔"
"جی بہتر" نرگس نے تابعداری سے سر ہلایا۔
دروازہ کھول کر اندر آئے تو نظر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے عشنا پر پڑی جو ہاتھ میں ریموٹ لیے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ ان پر ایک نظر ڈال کر اس نے چہرے کا رخ دوبارہ اسکرین کی طرف کر دیا۔ اس کے سرد تاثرات پر کچھ حیران ہوئے۔
"آنے سے پہلے بتا دیتیں خواہ مخواہ میرا چکر لگا۔" انہوں نے بیڈ کے دوسرے کونے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ لیکن وہاں پھر وہی سرد سی خاموشی تھی اور اپنی چہیتی بیوی کی خاموشی انہیں بہت چبھ رہی تھی۔
"کیا بات ہے طبیعت ٹھیک ہے تمہاری۔" رضا نے اب جوتے اتار کر ٹانگیں بیڈ پر رکھ کر رخ ان کی طرف موڑا۔
"طبیعت ٹھیک ہے میری موڈ خراب ہے میرا۔"
"کیوں میری جان کا موڈ کیوں خراب ہے۔" انہوں نے اب لاڈ سے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا۔
"آپ کی وجہ سے۔"
"ہیں" وہ حیران ہوئے۔ "میں نے کیا کیا ہے۔" انہوں نے سارے دن کی مصروفیات کو دماغ میں دہرایا کہیں کوئی قابل گرفت لمحہ نہیں آیا جہاں انہوں نے اپنی چہیتی بیوی کی کوئی فرمائش رد کی ہو، یا اس کی دل آزاری

کی ہو۔“

”بتاؤ میں نے ایسا کیا کیا ہے جس سے تمہارا موڈ خراب ہوا ہے۔“ وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولے۔

”آپ کو میری کوئی پروا نہیں اور نہ آپ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔“ اس کے نروٹھے انداز پر وہ کھل کر مسکرائے۔

”ایسی بات ہے تو میری جان بتائیں کیسے یہ خادم ثابت کرے کہ وہ اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا ہے۔“ رضا کے کہنے پر عشنا نے اپنی نظریں ان کی نظروں سے ملائیں۔

”آپ سے اگر میں کچھ مانگوں تو آپ انکار نہیں کریں گے۔“

”پہلے میں نے کبھی کہا ہے“ انہوں نے اب پیار سے اس کا گال سہلایا۔

”وعدہ کریں۔“

”وعدہ“ وہ اس کا ہاتھ دبا کر بولے۔

”مجھے میرا بچہ چاہیے......“ رضا صاحب ایک پل کے لیے سمجھ ہی نہیں سکے اور جب تو اس کے ہاتھ پر ان کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور ساتھ ہی نظروں کا زاویہ بھی بدل لیا جبکہ عشنا کے مارے غصے کے نتھنے پھول گئے تھے۔

”رضا“ اس نے ناراضی سے انہیں دیکھا جو اس سے نظریں چرا رہے تھے۔

”عشنا ہم اس بارے میں بات کر چکے ہیں۔“

”ہاں کر چکے ہیں لیکن میں ایک عورت ہوں مجھے بھی اپنے بچے کی چاہت ہوتی ہے آپ کی تو ایک بیٹی ہے پر میرا کیا......“

”وہ تمہاری بھی بیٹی ہے۔“

”ایسی بیٹی جسے بیٹی کہنا بھی عجیب لگتا ہے صرف چند سال چھوٹی ہے مجھ سے اور پھر میں نے اسے اپنی کوکھ سے تو جنم نہیں دیا۔“ اس کی بحث پر رضا جو اس کے قریب بیٹھے تھے تھوڑا سرک کے پیچھے ہو کر بیٹھ گئے۔

”مجھے پتا تھا آپ ایسے ہی ری ایکٹ کریں گیا اس لیے میں نے آپ سے وعدہ لیا تھا اب کیا آپ اپنے وعدے سے بھی مکر جائیں گے۔“ رضا صاحب نے بے ساختہ اپنی پیشانی مسلی۔

”عشنا سمجھنے کی کوشش کرو، اس عمر میں جب میری بیٹی شادی کے قابل ہے...... میں بچہ پیدا کرتا اچھا لگوں گا؟“ وہ زچ ہو کر بولے۔

”آپ کی بیٹی شادی کے قابل ہے، آپ کی عمر زیادہ ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے، میں تو صرف اکتیس کی ہوں، میں ماں بن سکتی ہوں تو میں کیوں اس خوشی سے محروم رہوں۔“ اس کی آواز، اب بھرا گئی تھی اس کے رونے پر رضا صاحب نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔

”عشنا میں نے شادی سے پہلے تمہیں بتا دیا تھا مجھے بچہ نہیں چاہیے اور تم نے اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔“

”ہاں تب مجھے لگتا تھا آپ مل جائیں یہی کافی ہے۔ میرے لیے......لیکن......اب میں خود کو ادھورا محسوس کرتی ہوں۔“ اب وہ باقاعدہ رونے لگی تھی جبکہ رضا صاحب اپنی جگہ پر گم صم پریشانی سے اس کا رونا سن رہے تھے۔ روتے ہوئے اس نے رضا صاحب کی طرف دیکھا جو یونہی خاموش بیٹھے تھے وہ روتے ہوئے کروٹ بدل کر لیٹ گئی اور ہاتھ بڑھا کر سائیڈ لیمپ بھی آف کر دیا، نیم تاریک روشنی اور خاموشی میں اس کے رونے کی آواز نمایاں ہو رہی تھی۔

”عشنا“ انہوں نے بے چینی سے آگے ہو کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا جسے اس نے جھٹک دیا۔ انہوں نے اب کی بار بازو سے تھام کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

"مشنا تم جانتی ہونا میں تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔
"تو میری بات کیوں نہیں مانتے۔" اس کے کہنے پر رضا صاحب نے اس کے چہرے پر پھیلے آنسو صاف کیے۔
"جیسے تم چاہو گی، ویسا ہی ہوگا۔" انہوں نے خود کو کہتے سنا تھا۔

☆☆☆

کاؤنٹر پر ادائیگی کر کے اس نے گروسری بیگز لیے اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ لیکن گلاس ڈور سے برستی بارش کو اس نے پہلے حیرانی اور پھر کوفت سے دیکھا۔ جب آدھے گھنٹے پہلے وہ اسٹور میں داخل ہوئی تھی۔ موسم ابر آلود ضرور تھا لیکن اس وقت بارش نہیں ہو رہی تھی اور اب اتنی تیز بارش اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ وہ کتنی دیر کھڑی بارش کے رکنے کا انتظار کرتی رہی لیکن جانتی تھی یہاں کھڑے رہنا فضول ہے۔" ہمت کر کے اس نے باہر کی طرف قدم بڑھائے، گاڑی اسٹور سے کچھ فاصلے پر پارک کی، وہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ کافی حد تک بھیگ گئی تھی۔
کار ان لاک کی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے اس نے ہاتھ میں پکڑے بیگز پچھلی سیٹ پر رکھے اور گہرا سانس لے کر کار اسٹارٹ کی۔ گھر پہنچتے پہنچتے بارش تیز ہو چکی تھی۔ کار پارک کر اس نے ایک ہاتھ سے گروسری بیگز اور دوسرے ہاتھ سے ہینڈ بیگ کو سر پر رکھا اور تقریباً بھاگتے ہوئے گھر کے دروازے تک پہنچی۔ باہر رک کر اس نے ڈور میٹ پر پاؤں رگڑ کر صاف کیے اور بیگ سے دروازے کی چابی نکال کر لاک کھولا۔ سامنے لاؤنج میں فرح اور مشتاق صاحب بیٹھے تھے۔
"گڈ ایوننگ" وہ مسکراتی ہوئی بیگز ٹیبل پر رکھ کر مشتاق صاحب کے ساتھ بیٹھ گئی۔
"آج دیر کر دی" وہ بیگ سے اپنا موبائل نکال رہی تھی جب اس نے فرح کو کہتے سنا۔
"اسٹور چلی گئی تھی واپسی پر بارش اتنی تیز تھی......بس......اسی لیے دیر ہو گئی۔ سونادیہ کہاں ہے؟" اس نے اردگرد نظریں دوڑاتے اپنی چھوٹی بہن کے بارے میں پوچھا۔
"اس کی کلاس فیلو کی برتھ ڈے ہے۔"
"کب تک آئے گی۔" اس نے پریشانی سے گھڑی کی طرف دیکھا۔
"تم کیوں پریشان ہو رہی ہو، مجھے بتا کر گئی ہے۔"
"پاپا، باہر موسم کافی خراب ہے۔" نعلیزہ کی بات پر وہ ہنس پڑے۔
"یہاں تو موسم اکثر ایسا ہی رہتا ہے، اس میں پریشانی والی کیا بات ہے۔"
"آپ کو اسے منع کرنا چاہیے تھا۔"
"وہ بچی نہیں ہے، کالج اسٹوڈنٹ ہے کیا اسے چھوٹی چھوٹی باتوں سے منع کرتا اچھا لگوں گا۔ کبھی منع کیا ہے میں نے" ان کے کہنے پر اس نے جز بز ہو کر پہلو بدلا۔
"پریشان نہ ہو میں خود اسے لینے جاؤں گا۔" اسے خاموش دیکھ کر وہ انہوں نے اسے تسلی دی تو وہ قدرے ریلیکس ہوئی پھر سر گھما کر اردگرد کا جائزہ لیا۔
"سمیر نہیں آیا ابھی تک۔"
"وہ تو آج آفس گیا ہی نہیں۔"
"کیوں" وہ حیران ہوئی۔
"رات کہہ رہا تھا سر میں درد ہے میں دیکھنے گئی تھی، بخار تھا، میں ناشتے کے ساتھ میڈیسن بھی دے آئی تھی۔ ابھی شاید سو رہا ہے۔" فرح کے کہنے پر اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔
"صبح آپ نے اسے دوائی دی اور اب شام ہو رہی ہے اور آپ کہہ رہی ہیں وہ ابھی سو رہا ہوگا حد ہے

ممی۔آپ کو کم از کم دیکھنا چاہیے تھا وہ ٹھیک ہے بھی یا نہیں......"

وہ ناراضی سے بولتی اٹھی اور سمیر کے کمرے کی طرف بڑھی پر ہلکی سی دستک دے کر اس دروازے کا ہینڈل گھمایا اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا دروازہ کھلنے پر سمیر نے بھی آنکھیں کھول کر دروازے کی جانب دیکھا ،دروازے میں علیزہ کو دیکھ کر اس کی نیم وا آنکھیں پوری کھل گئی تھیں۔

"جاگ رہے ہو" اس کی کھلی آنکھیں دیکھ کر وہ اندر آ گئی۔

"ممی بتا رہی تھیں تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔" اس کے اندر آنے پر سمیر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"صبح خراب تھی اب تو کافی بہتر ہے۔"

"لگ تو نہیں رہا۔" علیزہ نے اس کی اتری شکل بغور دیکھی تو اس کے منہ بنانے پر وہ مسکرایا۔

"اب مسکراتے رہو گے یا بتاؤ گے پرابلم کیا ہے؟"

"پرابلم کوئی نہیں شاید ٹھنڈ لگ گئی ہے۔کل صرف سوئیٹر پہن کر گیا تھا وہ شاید کافی نہیں تھا۔رات کو صرف سر درد تھا صبح بخار لگ رہا تھا تو آفس نہیں گیا۔" اس کے کہنے پر علیزہ نے آگے بڑھ کر اپنی ہتھیلی سے اس کے ماتھے کو چھوا وہ جو ابھی اس کے قریب آنے کو ہی محسوس کر رہا تھا اس کی ہتھیلی کے لمس پر ساکت سا ہوا۔

"تھوڑا گرم ہے لیکن زیادہ نہیں۔" اس کی حالت کے برعکس وہ نارمل انداز میں بات کر رہی تھی۔

"ایک تو تم پاکستانی نازک بہت ہوتے ہو،ذرا سی سردی برداشت نہیں ہوتی......" وہ جو یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا اس کے کہنے پر سر جھٹک کر اس کیفیت سے باہر نکلا۔

"پاکستانیوں کے بارے میں آپ کی سوچ بالکل غلط ہے محترمہ ہم جیسا پوری دنیا میں کوئی نہیں۔"

"ہاں اسی لیے جہاں پاکستانی جاتے ہیں کوئی نہ کوئی کارنامہ ضرور انجام دیتے ہیں۔" اس نے منہ بنا کر مذاق اڑایا......اس سے پہلے وہ کوئی شاندار بات کہتا اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"اب بستر کا پیچھا چھوڑو......فریش ہو جاؤ......میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔" کہتے ہوئے وہ دوبارہ مڑی۔

"ویسے......کھاؤ گے کیا"

"تم بناؤ گی۔" اس نے مسکرا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"ظاہر ہے میں پوچھ رہی ہوں تو میں ہی بناؤں گی۔"

"منہ کڑوا ہو رہا ہے کچھ میٹھا اور گرم کھانے کو دل کر رہا ہے۔"

"کافی بناؤں۔"

"نہیں"......سمیر نے بری سی شکل بنائی۔

"چائے دو چمچ چینی والی......اور فرنچ ٹوسٹ"

"کیا بات ہے بادشاہ سلامت۔" اس کے مینیو پر علیزہ نے ابرو اچکائے۔

"بیمار کی تیمارداری سے ثواب ملتا ہے۔" وہ مسکین سی شکل بنا کر بولا۔

"چلو تم بھی کیا یاد کرو گے کتنی اچھی لڑکی سے پالا پڑا تھا۔" کہہ کر وہ نکل گئی جبکہ وہ کتنی دیر مسکراتا ہوا دروازے کو دیکھتا رہا،فریش ہونے اور کپڑے چینج کرنے کے بعد جب وہ نیچے آئی تو فرح اور مشتاق ابھی تک لاؤنج میں بیٹھے تھے۔وہ ان کے پاس سے گزرتی کچن میں آ گئی......

اب وہ ایک چولہے پر ساس پین رکھے چائے بنا رہی تھی......دوسری طرف انڈے میں چینی ڈال کر اسے پھینٹ رہی تھی کچن میں داخل ہوتی فرح نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''یہ کیا کر رہی ہو علیزہ۔''
''چائے اور فرنچ ٹوس بنا رہی ہوں۔''
''مجھے کہہ دیتی ابھی ابھی تھکی ہوئی آئی ہو۔'' وہ اس کے قریب آ کر بولیں۔ ''لیکن...... تم تو چائے پیتی نہیں۔'' انہوں نے ابلتی چائے کو دیکھ کر علیزہ کو دیکھا۔
''اپنے لیے نہیں سمیر کے لیے بنا رہی ہوں...... اس کا چائے پینے کا دل کر رہا تھا۔'' فرح نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا جو مگن انداز میں بریڈ کو انڈے میں ڈپ کر رہی تھی...... کھنکھارنے کی آواز پر فرح اور علیزہ دونوں نے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سمیر کھڑا تھا۔
''تم کیوں آ گئے میں لا رہی تھی۔'' اسے دیکھ کر علیزہ بولی۔
''اب اتنا بھی بیمار نہیں کہ بستر پر پڑا رہوں...... صبح سے لیٹا ہوں، اکتا گیا ہوں......'' کہنے کے ساتھ وہ کچن میں رکھی کرسی پر بیٹھ گیا......
علیزہ اب کام کرنے کے ساتھ اس کے ساتھ باتیں بھی کر رہی تھی...... ان کو مصروف دیکھ کر فرح لاؤنج میں آ گئیں...... ٹی وی دیکھتے مشتاق صاحب نے سرسری نظر فرح پر ڈالی اور پھر حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگے جو مسکرا رہی تھیں۔
''کیا بات ہے کون سا لطیفہ یاد آ گیا ہے جو خود بخود مسکرا رہی ہو۔''
''لطیفہ نہیں...... پسندیدگی۔''
''پسندیدگی۔'' مشتاق صاحب نے حیرت سے دہرایا۔ ''ہوں...... آپ نے علیزہ کے رویے پر غور نہیں کیا...... سمیر سے اس کی کتنی دوستی ہو گئی ہے۔ خود کے لیے آج تک اس نے کچھ نہیں بنایا...... سمیر کے لیے چائے اور فرنچ ٹوس بنا رہی ہے آفس سے آ کر سیدھی اس کا پتا کرنے گئی...... اتنی پرواہ تو انسان اس کی کرتا ہے جیسے وہ پسند کرتا۔''
''تمہارا مطلب ہے علیزہ...... سمیر کو پسند کرتی ہے۔'' مشتاق صاحب کے کہنے پر فرح نے افسوس سے سر ہلایا۔
''تو میں کیا اتنی دیر سے فارسی میں بات کر رہی ہوں۔''
''اگر ایسی بات ہے تو بہت اچھا ہے...... سمیر اچھا لڑکا ہے مجھے پسند ہے۔''
''تو میں سلمٰی سے بات کروں۔'' وہ بے تابی سے بولیں۔
''نہیں ابھی نہیں...... پہلے علیزہ سے پوچھ لو۔''
''پوچھ کیا لوں صاف نظر آ رہا ہے۔''
''فرح'' انہوں نے تنبیہ انداز میں ان کا نام لیا۔
''جو کہا ہے وہی کرو...... علیزہ سے پوچھنا ضروری ہے اور بات صرف علیزہ کی نہیں...... سمیر کی بھی ہے۔ کیا یہ صرف دوستی ہے یا بقول تمہارے پسندیدگی ہے...... اور...... اگر یہ پسندیدگی اتنی ہے کہ وہ دونوں ساری زندگی ایک دوسرے کے ساتھ گزار سکیں...... یہ سب باتیں کلیئر ہونا ضروری ہیں۔
پہلے دونوں فریقوں کی مرضی پتا کرو پھر آگے بات کرو۔'' کہہ کر انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔
''میں نادیہ کو لینے جا رہا ہوں۔'' وہ اٹھ کر چلے گئے...... کچن سے ابھی تک علیزہ اور سمیر کی باتوں کی آواز آ رہی تھی جبکہ وہ باہر گومگو کی کیفیت میں بیٹھی تھیں۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

لبنیٰ آصف

ادھوری دعا

"امی! کیا پکایا ہے؟"
تھکی ہاری روزینہ اسکول سے گھر لوٹی تھی۔ اسکارف اور عبایا اتار کر پنکھے کی ٹھنڈی ہوا میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔ امی مسکرا کر بتانے لگیں۔

"آج بینگن کا بھرتا اور مونگ کی دال بنائی ہے۔" روزینہ کا منہ بن گیا۔

"کیا ہے امی! کچھ ڈھنگ کا پکا لیتیں۔ اسکول میں بچے دماغ کھا جاتے ہیں۔ گھر آؤ تو آپ یہ رنگ برنگے کھانے پکا لیتی ہیں۔"

"یہ کیا بات کی روزینہ! تم نے؟"

"بینگن کا بھرتا کتنے دنوں بعد پکایا ہے اتنی دور سے اچھے بینگن ڈھونڈ کر لائی پھر بڑے دل سے پکایا ہے۔ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آجاؤ۔ میں روٹی ڈالتی ہوں۔"

"امی! آپ آرام سے روٹی پکا لیں میں نماز پڑھ لوں۔ پھر دونوں ساتھ کھانا کھائیں گے۔ آپ کو بھوک تو نہیں لگ رہی؟"

"نہیں نہیں۔ تم نماز پڑھ لو تسلی سے۔"

روزینہ نماز سے فارغ ہوئی تو ماں نے جلدی سے دستر خوان لگایا۔ روزینہ بھی ٹھنڈے پانی کی بوتل اور گلاس لے آئی۔ دونوں ماں بیٹی کھانا کھانے لگیں۔

"امی! میں تو دعا کرتی ہوں میری جہاں شادی ہوناں وہ لوگ یہ بھرتے، دالیں اور سبزیاں نہ کھاتے ہو۔ وہاں روز نئے نئے کھانے پکتے ہوں۔ غریبوں والے کھانے نہ پکتے ہوں۔ قورمہ، بریانی، نہاری اور بہت سارے نئے نئے کھانے پکتے ہوں۔"

"کھانے کا مزہ تو سادہ کھانے میں ہے۔ مرغن

کھانے تو ایک سے دو ٹائم ہی کھا کر دل بھر جاتا ہے۔"

"امی! میرا دل نہیں بھرے گا۔"

"اچھا چلو ٹھیک ہے۔ جیسی دعا میری بیٹی مانگتی ہے اللہ اسے ویسا ہی سسرال دینا۔"

"آمین" کہہ روزینہ کھانا کھانے لگی۔

☆☆☆

کبھی کبھی قبولیت کے اوقات میں ہمارے منہ سے ایسی دعا نکلتی ہے جو قبولیت کا شرف بھی پا جاتی ہے۔

روزینہ کا بڑے اچھے گھرانے سے رشتہ آیا تھا۔ جیٹھ کی بیٹی کی شادی میں روزینہ کو دیکھا تھا۔ جیٹھ کے دوست کا بیٹا تھا۔ ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھی پوسٹ پر تھا۔ ایک بھائی بڑا شادی شدہ تھا۔

اس کا اپنا بچوں کے کپڑوں کا برانڈ تھا۔ بہن بھی ایک ہی تھی شادی دو سال پہلے ہوئی تھی۔ جٹھانی دوست کی بیوی اور بیٹی کے ساتھ آئیں تو رشتہ بھی ڈال گئیں اور اپنے ہاں لڑکا دیکھنے کی دعوت بھی دے گئیں۔

سطوت بیگم کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے اتنی اچانک روزینہ کا اتنا اچھا رشتہ آنے پر۔ پھر کہیں ڈر بھی کہ باپ ہے نہیں مگر جیٹھ جٹھانی ہر طرح کی گارنٹی لینے پر تیار کہ بہت سالوں سے جانتے ہیں دوست کی فیملی کو بھابھی بے فکر ہو کر ہاں کریں۔ ہم بیٹھے ہیں۔

یوں سطوت بیگم نے روزینہ کے رشتے کی ہامی بھر لی۔ چھ ماہ بعد کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ شادی کی تیاریاں کرتے بہت بار سطوت بیگم روزینہ سے کہتیں۔

"روزینہ تجھے بہت اچھا سسرال ملا ہے۔"

روزینہ بھی اس رشتے پر بہت خوش تھی۔ چھ مہینے تیاریاں کرتے اتنی جلدی گزرے کہ شادی کا دن آپہنچا۔ سطوت بیگم اکلوتی بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہوئیں اور روزینہ سسرال چلی۔

☆☆☆

شروع کے دلہناپے کے دن گھومنا پھرنا دعوتیں بڑی جٹھانی اور ساس کھانا پکاتیں باقی کے سب کاموں کے لیے ماسیاں تھیں۔

روزانہ طرح طرح کے کھانے میز کی زینت بنتے۔ ساس اور جٹھانی کے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت تھا۔ کھانے میں کوئی ایک چیز تو پکتی ہی نہیں تھی ورائٹی ہی ورائٹی۔

بقول میاں اور جیٹھ کے بندہ کماتا کیوں ہے ایک وقت کا کھانا تو کھاتے ہیں گھر میں۔ ساس بھی کہتیں۔

"اور کیا مرد کما کر آئیں تو ان کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھو۔"

انیلا کے دلہناپے کے دن ختم ہوئے تو ساس نے کھیر میں ہاتھ ڈلوایا۔ دعوت کا کھانا دونوں دیورانی اور جٹھانی نے مل کر کھانا بنایا۔ دعوت بخیر و عافیت ہوئی سب نے کھانے اور کھیر کی تعریف کی۔ روزینہ نے بھی بڑا دل لگا کر کھانا پکایا تھا۔ پھر جٹھانی تو ماہر تھیں۔ ان کی نگرانی ہی کافی تھی۔

کھیر پکوائی کے بعد باقاعدہ کچن میں روزینہ نے کھانا پکانے کے لیے قدم رکھے۔ ساس نے دونوں بہوؤں کے ایک ایک دن مقرر کر دیے۔ ایک دن ایک بہو کی باری دوسرے دن دوسری بہو کی باری ناشتا سب اپنے اپنے حساب سے خود ہی بناتے۔

دوپہر میں ایک دن پہلے کا کھانا روٹی، چاول بنا کر کھا لیا جاتا۔ رات میں تازہ کھانا بنتا۔ روزانہ کا مینیو ساس بتاتیں کہ آج کیا پکے گا؟

"کیا پکے گا نہیں بلکہ کیا کیا پکانا ہے۔"

روزینہ تو چند دنوں کی ڈیوٹی کے بعد ہی چکرا کر رہ گئی تھی۔ یوٹیوب سے ساس روزانہ کوئی نئی ترکیب گوشت یا چکن کی نکال کر دکھاتیں اور پکواتیں بھی۔

سادہ پلاؤ تو کوئی کھانا بھی نہیں۔ افغانی پلاؤ،

احمد آبادی پلاؤ، حیدر آبادی اور سالن میں بھی نئے نئے طرح کے سالن، بادامی چکن ود وائٹ گریوی، بھنا گوشت، نمکین گوشت، وائٹ قورمہ، حتیٰ کہ رائتے سلاد میں بھی کبھی لوکی کا رائتہ، کبھی آلو کا، کبھی رشین سلاد، حلیم، نہاری، پائے بھی ہر ہفتے کے مینیو میں شامل تھا۔ روپے پیسے کی کمی تھی نہیں۔ اسی لیے کھلے ہاتھ سے پکاؤ، پرفیکشن اتنی چاہیے ہوتی کہ ذرا سی بھی کمی کوتاہی، لاپروائی کوئی برداشت نہ کرتا ایسے لگتا سب کھانے کے لیے جیتے ہیں۔ ٹیسٹ پر تو کمپرومائز نند آنے سے پہلے ہی اپنے کھانے کا مینیو ساس کو لکھوادیتیں پھر وہ اپنی نگرانی میں بیٹی اور داماد کے پسند کے کھانے پکواتیں۔

جیٹھانی روزینہ کو بتانے لگیں "شروع شادی کے دنوں میں، میں بھی پریشان ہوجاتی تھی۔ اکیلے سب کچھ کرنا پھر آہستہ آہستہ ماحول اور چیزوں کے ساتھ سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ سب کچھ اچھا ہو تو کسی بھی ایک چیز کو تو برداشت کرنا پڑتا ہے۔"

انہوں نے بھی چھوٹے بچوں کے ساتھ بھی پکایا "پہلے ساس بھی ساتھ کروادیتی تھیں۔ پھر ماسی سب کچھ کاٹ دیتی سبزی وغیرہ اور اب تو تمہارے آنے سے بہت سہولت ہوگئی ہے۔ تم بھی تھوڑے دنوں میں عادی ہوجاؤ گی ابھی شروع کے دن ہیں ناں۔"

روزینہ ایک دن کا کھانا بنا کر اتنا تھک جاتی کہ دوسرے دن تک تھکن کا احساس رہتا کہ دوبارہ باری آجاتی کھانے پکا پکا کر روزینہ کا کھانے کو بھی دل نہ چاہتا۔

آج بڑے دن بعد روزینہ اماں کی طرف آئی تھی۔

"روزینہ بتا کیا کھانے کا دل چاہ رہا ہے۔ میں نے چکن میں مسالہ لگا کر میرینیٹ کرنے رکھا ہے حلیم پورا تیار کر کے فریزر میں رکھا ہے بس گرم کر کے بگھار لگانا ہے۔"

"امی! میرا دل بھر گیا ہے ان کھانوں سے دل چاہتا ہے کچھ سادہ سا کھاؤں۔"

"روزینہ یہ تو کہہ رہی ہے، یقین نہیں آرہا۔"

"ہاں امی! میں کہہ رہی ہوں۔ کبھی جن کھانوں کے لیے میں مرتی تھی۔ میرا روز مزے مزے کے طرح طرح کے کھانے کھانے کا دل کرتا تھا اب ان کھانوں کو پکا کر میں اتنا تھک جاتی ہوں کہ کھانے کا بھی دل نہیں چاہتا۔ امی واقعی میں ورائٹی والے مرغن کھانے بنانے میں کتنا وقت، محنت درکار ہوتی ہے۔ پھر روز کھائے بھی نہیں جاتے۔"

"امی! آج تو بینگن کا بھرتا اور پیلی والی دال بنانا میں دل بھر کر کھانا کھاؤں گی۔"

"کیا بات ہے روزینہ! تم خوش نہیں ہو۔"

"نہیں نہیں اماں! میں بہت خوش ہوں۔ اتنا خیال رکھنے والا محبت کرنے والا شوہر، گھر، گاڑی، روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں۔ سسرال میں کوئی روک ٹوک نہیں۔ لڑکیاں تو خواب دیکھتی ہیں ایسے سسرال کے امی! میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اللہ میاں سے دعا ہی ادھوری مانگی تھی کہ میرے سسرال میں نئے نئے طرح طرح کے کھانے پکتے ہوں۔ ورائٹی ہی ورائٹی ہو۔ دو تین طرح کے سالن ہوں۔ میٹھا ہو۔ روز پلاؤ بریانی ہو، کھانا بہت امیروں والا بنتا ہو۔ مگر امی! میں نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ یہ محنت طلب کھانے مجھے پکانے پڑیں گے۔ نہ ہی میں نے اللہ میاں سے اور کچھ کہا تھا۔ سو جو مانگا تھا مل گیا۔ پھر شکوہ کیسا۔ کاش میں پوری دعا مانگتی۔"

☆☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

فصل غم کا گوشوارہ

رضیہ جمیل

قیمت -/300 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

ماریہ غزال

ابھی کچھ دن لگیں گے

"امی! ایک کباب فرائی کرکے چیک کرلوں۔ ہوسکتا ہے نمک مرچ انیس بیس ہو تو پتا چل جائے گا۔"

ماہ رخ نے کباب بناتی ساس سے پوچھا، دراصل ماہ رخ کے گھر کا طریقہ ہی یہ تھا اور اس چکھنے کے چکر میں ماہ رخ مزے سے ایک آدھ کباب پہلے ہی نوش کرلیتی۔ اس کو شامی کباب بہت پسند تھے۔ ویسے تو اسے اپنی امی کے ہاتھ کے کباب پسند تھے مگر ساس کو بناتا دیکھ کر اسے لالچ نے آن دبوچا اور وہ کہے بنا نہ رہ سکی۔

"ہمارے گھر کے کبابوں میں انیس بیس نہیں ہوتا۔" اس کی بڑی نند جو کہ اپنے چچا کے یہاں بیاہی گئی تھی، اپنی ساس کے ساتھ آئی ہوئی تھی اور کل تک ماہ رخ کی ساس کا کباب بنانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کل ماہ رخ نے اپنی ساس سے شامی کباب بنانے کی اجازت چاہی تھی کیونکہ کل ہی ہفتہ بھر کا گوشت آیا تھا، سو اس نے سوچا کہ کباب ہی بنالے ویسے تو اس سے آج کل کچھ کھایا نہیں جاتا تھا مگر اس وقت ساس نے صفا چٹ انکار کردیا تھا کہ یہ سارا گوشت ہفتے بھر کا ہے۔ اضافی نہیں ہے۔

اور آج اپنی سمدھن و دیورانی پر اپنے کام کی دھاک بٹھانے کے لیے اس ہی گوشت میں سے ایک تھیلی نکال کر اب شامی کباب بنا رہی تھیں۔

صبح صبح بیٹی نے بتادیا تھا کہ وہ دوپہر تک آئے گی سو کھانے کی تیاری میں شامی کبابوں کو بنانا اور رکھنا ساس صاحبہ نے ضروری سمجھا، غالباً وہ اپنی دیورانی کو خاموشی سے پیغام دے رہی تھیں کہ ہم بھولا کر بالکل فارغ نہیں ہوگئے ہیں۔ اور بے وقوف ماہ رخ کو یہ چالاکیاں کہاں سمجھ آتی تھیں سو بدھو کی طرح پوچھ بیٹھی۔ کھانے پر ساس کے بجائے چچیا ساس نے دوسرا کباب بھی اس کی پلیٹ میں ڈالا۔

"ارے کھاؤ، ایسے وقت جو اچھا لگتا ہے وہ کھانا چاہیے ہماری تہمینہ کو اس حال میں صرف انڈے ہی اچھے لگتے تھے۔ میں تو دن بھر انڈے منگائی رہتی تھی۔"

اور تہمینہ ساس کی مبالغہ آرائی پر ششدر ہی رہ گئی۔ اس لمحہ ماہ رخ کو بھی کسی سنگین غلطی کا احساس ہوا۔ بہرحال منہ سے نکلی بات اور کمان سے نکلا تیر بھلا کہاں واپس ہوسکتے ہیں مگر رات کو کافی دیر بعد بجیر کمرے میں آئے تو ان کی گہری سنجیدگی نے اسے پریشان ہی کردیا۔ کافی دیر خاموشی سے موبائل میں لگے رہے۔ اب ماہ رخ کی بے چینی دیدنی تھی اور پھر اس بے صبری نے پوچھ ہی لیا۔

"خیریت آپ بہت چپ ہیں۔"

اس جملے پر بجیر نے اسے دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں۔ اور وہ میاں کو رام کرنے کا وظیفہ ہی سوچتی رہ گئی۔ دو دن ان کی بے اعتنائی سہنے کے بعد وہ دوبارہ ساری انا بالائے طاق رکھ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"سنیے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو بتادیجیے۔ ڈانٹ لیجیے مگر پلیز یہ خاموشی والی مار بہت سخت ہوتی ہے۔"

وہ سچ میں بلبلا اٹھی تھی۔ دو دن سے ساس نے بھی سیدھے منہ بات نہیں کی تھی اور میاں صاحب کی تیوری کے بل بھی دور نہیں ہورہے تھے۔

"تم اتنی بھوکی ندیدی ہو کہ بنتے سے شامی کباب کھانے ہیں پھر کھانے پر بھی دھڑا دھڑ کھاتے

چلے جانا ہے۔ مہمان چاہے کھائے نہ کھائے تمہارا پیٹ بھر جائے۔"

لیکچر شروع ہو گیا۔ اور اب کوئی دو گھنٹہ لگنا تھا اس سیشن کو مکمل ہونے میں تب کہیں جا کر ایک دو دن بعد تک اس کا مزاج ٹھکانے پر آنا تھا۔ ان کے مزاج کی درستی کے بعد ساس کے بگڑے زاویے درست کرنے میں مزید دو چار دن لگتے۔ اور پھر کوئی اگلا مسئلہ کھڑا ہو جانا تھا۔

وہ سر جھکائے ڈانٹ سنتے صرف آنسو بہانے اور یہی سب سوچتے ہوئے وقت گزار رہی تھی۔ بھلا کیا ضرورت تھی ایک سے زیادہ کباب کھانے کی اب وہ خود کو ملامت اور لیکچر کو وضاحت پیش کر رہی تھی۔ کہ امی نے خود کہا تھا جو کھانے کا دل ہو کھا لیا کرو۔ مگر وہاں بولنا فضول ہی تھا۔ سو ایک آدھ وضاحت کے بعد وہ خاموش ہی رہی کیونکہ اس کو پتا تھا وہ جتنا بولے گی اتنا پھنسے گی، البتہ رات دیر تک تکیہ بھگوتی رہی کہ اب صرف یہی تو اس کے اختیار میں تھا۔

☆☆☆

"ایک تو بھابی آپ کو بھی کوئی لڑکی ہی سمجھ میں نہیں آتی۔" سعدیہ خالہ نے چڑ کر کہا وہ اب تک کئی رشتے

دکھا چکی تھیں مگر کوئی بھی سجیر کی والدہ کو پسند نہیں آیا تھا۔ پھر ایک دن وہ برادری میں کسی کے چہلم میں گئیں، وہیں انہیں من موہنی سی ماہ رخ پسند آ گئی کم عمر، سفید ملائی جیسا رنگ روپ اور ادب تمیز والی یہ بچی تو ہر ایک کو ہی پہلی نظر میں بھا جاتی تھی تو انہیں کیوں نہ بھاتی، مگر وہ اپنی تائی امی کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ جو کہ اس کا حد سے زیادہ خیال رکھ رہی تھیں جیسے وہ کوئی چھوٹی سی بچی ہو۔

اور پھر سجیر کی امی نے جب اس کا جغرافیہ معلوم کیا تو پتا چلا، ان کے خاندان میں لڑکیاں نہیں بچتیں اس کی تین پھوپھیاں پیدائش کے دو سال کے اندر مر گئی تھیں۔ تایا تائی کے چار بیٹے ہی تھے۔ ماہ رخ کے دادا نے بڑی منتیں مانی تھیں تب جا کر ماہ رخ پیدا ہوئی تھی۔ ویسے تو ماہ رخ کے بعد ماہ نور بھی تھی مگر جو حیثیت ماہ رخ کی تھی۔ وہ کسی اور کی نہیں تھی۔ اس ہی لیے وہ قدرے لاابالی اور بے فکر سی تھی مگر سجیر کی والدہ تو اس کی صورت پر ایسی فدا ہوئیں کہ اگلے دو چار دن میں ان کے گھر رشتہ لے کر پہنچ گئیں۔

تایا کے بڑے اور منجھلے بیٹے کی شادی ہی ہو گئی تھی اور تیسرے سے امید تھی جو کہ گزشتہ سال اس نے ختم کر دی تھی یہ کہہ کر کہ وہ اپنی مرضی کی شادی کرے گا۔ اور چھوٹا بیٹا خود ماہ رخ سے سال بھر چھوٹا تھا اس لیے ماہ رخ کی والدہ نے فوراً رشتہ ٹھکرانا مناسب نہیں جانا، اوپر سے سجیر کی والدہ کا واری ہونا اور ہر بات پر راضی ہو جانا ان سارے ہی لوگوں کو بہت بھایا۔

انہیں اس بات پر بھی اعتراض نہیں تھا کہ اسے باورچی خانہ سنبھالنا نہیں آتا نہ ہی اس سے مسئلہ تھا کہ وہ آگے پڑھنا چاہتی ہے۔ اوپر سے تائی اماں نے تو کھلے لفظوں میں بتا دیا تھا کہ

"ہماری ماہی بہت نازوں کی ہی ہے اسے کوئی تنگی ہوگی تو وہ سارے گھر کو محسوس ہوگی۔" خود ماہ رخ جس کو گھر بھر ماہی پکار رہا تھا گھر والے اس کی بے وقوفی کے قصے سنا رہے تھے۔ ایک ایسی لڑکی جس نے زمانے کا سرد و گرم دیکھا ہی نہیں تھا اس کے لیے انہیں ایسی ہی ساس چاہیے تھیں بھلا یہ کسے معلوم تھا کہ ابھی ہر بات پر راضی ہو جانے والی ساس شادی کے چار دن بعد ہی ساس کے روپ میں آ جائیں گی۔

شوخ چنچل سی ماہی آہستہ آہستہ بجھتی جا رہی تھی۔ سجیر بھی محبت کرنے پر آتا تو ایسا مہربان ہو جاتا کہ سارے زخم مندمل ہونے لگتے لیکن کوئی بات ذرا سی بھی مزاج کے خلاف ہوتی ویسے ہی وہ رانجھے سے ہٹلر میں تبدیل ہونے میں لمحہ نہیں لگاتا تھا۔

ادھر اماں نے کچھ کان میں پھونکا ادھر وہ جلاد کی صورت ماہی کے سر پر سوار ہو جاتا۔ اور ماہی نے زندگی کا یہ رنگ بھلا کہاں دیکھا تھا۔

☆☆☆

"دلہن کو واپسی پر لیتے آنا۔" سجیر کو اس کی امی کی فون کال ریسیو ہوئی حالانکہ ماہی اس سے اور امی سے تین چار دن اجازت لے کر گئی تھی مگر امی نے تو اگلے ہی دن سے شور مچا دیا یوں مجبوراً اسے ماہی کے گھر آنا ہی پڑا۔

دروازہ زید نے بغیر دستک دیے کھول دیا وہ کوچنگ جا رہا تھا۔ اس سے ملنے کے بعد سجیر اندر چلا گیا۔ سب ہی لان میں تھے اور زور و شور سے باتیں ہو رہی تھیں مگر ماہی کی آواز اور پھر کھنکتی ہوئی نقرئی ہنسی سب سے بلند تھی۔

اس لمحہ سجیر نے بے اختیار سوچا کہ اس نے نجانے کب یہ ہنسی آخری دفعہ سنی تھی۔ اور واپسی پر وہ سوال کر ہی بیٹھا۔

"تم میرے ساتھ خوش ہو ماہ رخ!"

"جی۔" اس نے حیرت سے اس کی سمت دیکھا۔

"تم آج جس طرح سب کے ساتھ ہنس بول رہی تھیں گھر میں تو نہیں رہتیں اس طرح۔"

"مطلب آپ کے گھر بھی ایسے ہی زور زور سے ہنسوں بولوں۔" وہ ہلکا سا ہنسی۔

"ہاں بالکل۔" سجیر نے فوراً ہی کہا۔

"امی کو اس پر اعتراض نہیں ہوگا۔"

"بالکل نہیں، انہیں کیوں اعتراض ہوگا۔"

"شاید آپ کو یاد ہو کہ پچھلے مہینے زاہد بھائی سے

تھوڑی دیر کھانے کی میز پر بات کرنے کے نتیجے میں امی نے مجھے کس قدر ڈانٹا تھا بھلا ایسی جگہ میں ہنس بول کر اپنی عزت گنواؤں۔"

آج اس کے منہ سے گلہ نکل ہی گیا اور سجیر کو بھی یاد آ گیا تھا کہ امی نے اس کے ہنسنے بولنے پر کتنا برا مانا تھا۔ مگر ماننا تو ان ماں بیٹے کو آتا ہی نہ تھا جب ہی توجیہہ دی۔

"ارے زاہد تو داماد ہے اس لیے امی کو اعتراض ہوا تھا۔"

"چلیے کل سے امی سے مذاق کر لیا کروں گی۔" اس کا موڈ ابھی تک خوش گوار تھا تب ہی اس نے بات ختم کرنے کو کہہ دیا۔

☆☆☆

"بقر عید پر تو تم صرف شکل دکھا گئی تھیں اب آنا تو ڈھنگ سے آنا بہت سارے دن کے لیے آنا۔"

امی نے فون پر اصرار کیا اور وہ سوائے ہامی بھرنے کے کیا کہتی بھلا مگر جلد ہی تائی نے عمر بھائی کے سسرال جانے کی دعوت دے دی۔ عمر نے جو لڑکی پسند کی تھی بالآخر تایا ابو اس سے عمر کی شادی کے لیے مان گئے تھے۔ اب تائی امی نے اسے صبح سے بلایا تھا انہوں نے ماہی سے پہلے سجیر کو فون کر دیا تھا پھر اس ہی کے فون سے بات کروانے کی فرمائش کی اور دونوں سے وعدہ لے کر ہی ٹلیں۔

منہ میٹھا کروانے کے لیے سجیر کو بھی جانا تھا۔ وہ تیار ہو کر پہنچ چکی تھی بس زید مٹھائی لینے گیا تھا۔ اس ہی کا انتظار تھا جب ہی تائی امی ٹرے اٹھائے ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔

"تم لوگ ناشتہ کر لو وہاں نجانے کتنی دیر ہو ویسے بھی چھوٹا بچہ ساتھ ہے۔ ویسے ماہی میں کباب تلتے ہوئے تم کو یاد کر رہی تھی۔ کتنا بھی روکو۔ دو چار کباب ماہی کھا ہی جاتی تھی۔"

تائی امی نے محبت سے بتایا مگر اسے نجانے کیوں عجیب سی بے عزتی محسوس ہوئی۔

"کھاؤ نا ماہی!" نوری نے پلیٹ میں ایک ساتھ دو کباب نکال کر دیے۔

"مجھے شیر خرما دے دو۔ کباب کھانے کا دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے ہلکے سے کہا تا کہ آواز سجیر تک نہ جائے مگر جگہ اتنی زیادہ نہیں تھی کہ اس کی آواز سجیر تک نہیں پہنچتی۔

"ہائے کیا قیامت کا دن ہے کہ ماہی اور کبابوں کو انکار۔" نوری نے ہنس کر کہا۔

"ارے پگلی، مہمانوں کی طرح آنے سے تم ہمارے گھر مہمان نہیں ہو گئی ہو۔ تم آج بھی ہماری وہی پیاری سی منی ماہی ہو۔ اس لیے تکلف نہ کرو دو کباب کھاؤ اور دو مٹھی میں دبا کر لے جاؤ۔"

بڑے بھیا نے بھی متوجہ ہو کر شفقت سے کہا جبکہ ماہی کی حالت بری ہو گئی۔ نجانے مجھے کتنا ندیدہ تصور کر رہے ہوں گے سجیر۔ اسی لیے اس نے پلیٹ فوراً پکڑ لی اور مشکل سے چمچ کی مدد سے تھوڑا تھوڑا کھانے لگی مگر آدھے سے زیادہ اس کے حلق سے نہیں اترا۔ جب ہی زید مٹھائی اور پھول لے کر پہنچ گیا اس نے اس افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خاموشی سے دوسرا کباب اس نے پلیٹ میں واپس رکھ دیا۔ جس کو کمرے سے نکلتے سجیر نے نوٹ کیا۔

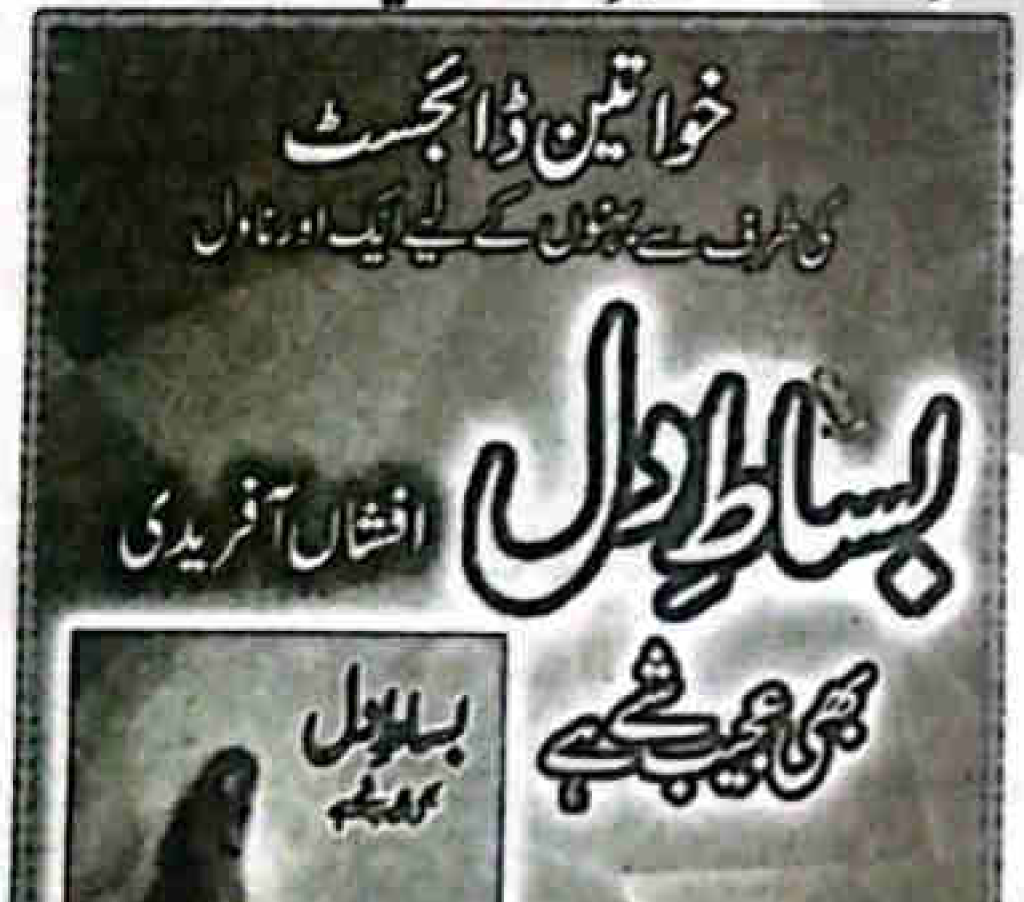

☆☆☆

"اف یار تم نے کھانا تو بہت مزے کا بنایا ہے۔" سجیر نے بہت خوش ہو کر کہا۔ "ویسے تمہیں کیسے لگے یہ لوگ۔"

"ہاں ٹھیک ہی لگے۔"

"ویسے مجھے تو اس سے پہلے والی لڑکی پسند آئی تھی۔"

"ہاں اچھی تھی۔" اس نے آئینہ کے سامنے کھڑے کھڑے ہی اس کے عکس کو دیکھ کر کہا۔

"اچھا مجھے لگا۔ تمہیں وہ پسند نہیں آئی۔"

"اچھی تھی مگر آپ کے گھر کے لیے نہیں۔"

"بھلا وہ کیوں۔" سجیر نے حیرت سے پوچھا۔

"پھر ایک ماہی آ جاتی ناکارہ، بے وقوف سی۔ اس کو بدلتے بدلتے اماں کا پتا پانی ہو جانا تھا۔ وہ چھ سگے بھائیوں کی بہن تھی۔ نجانے کیوں لوگ لڑکی دیکھ کر لاتے ہیں مگر لانے کے بعد اس میں اس قدر کیڑے نکالتے ہیں کہ لڑکی بھی حیران رہ جاتی ہے۔"

وہ کھوئی کھوئی ماہی وہ پرانی والی ماہی ہی تھی جو بولنے سے پہلے سوچتی نہ تھی۔ جس کا تن اور من یکساں تھا یہ تو کوئی اور ماہی تھی۔ سوچ سمجھ، ناپ تول کر بولنے والی۔

"سوری یار! امی کی عادت ہے۔"

"مجھے امی سے۔ شکایت نہیں ہے۔" اس نے روانی میں اگلے شکایتی جملے کو منہ سے نکلنے سے پہلے ہی جلدی سے بدلا اور بول گئی۔

"بھئی امی کی عادت ہے، میں سمجھتی ہوں۔" اس نے بات ختم کر کے باتھ روم کا رخ کیا بھلا وہ یہ کہتی کہ مجھے امی نہیں آپ سے شکایت ہے۔

☆☆☆

"اف یار! یہ امی اور فضیلہ کی چخ چخ سے میں سخت بے زار ہوں۔ اور سمیر کو دیکھو۔ کیسے بیوی کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ میرے وقت میں اسے اتنے کیڑے نظر آتے تھے۔ تمہاری ہر بات، ہر کام میں اور اب دیکھو غلط کو غلط ماننے پر راضی نہیں ہے۔ میں اب اس ٹینس ماحول میں نہیں رہ سکتا میں کافی عرصے سے باہر اپلائی کر رہا ہوں۔ نجانے ہو کیوں نہیں رہا۔"

سجیر چاہ رہا تھا کہ وہ بھی اس کی باتوں کا جواب دے مگر اب اسے بالکل مطلب نہیں، رہا تھا اس گھر کی سیاست سے۔ وہی ساس جن کو پہلے ماہی میں کیڑے دکھتے تھے وہ آج فضیلہ کو اس کی مثالیں دے رہی تھیں مگر ماہی کا بے چارہ دل وہ بھلا اب ان طفل تسلیوں سے کہاں بہلنے والا تھا۔

☆☆☆

زید اور نوری کا رشتہ طے ہو گیا۔ اس کی خاموش اور جامد زندگی میں ایک خوش گوار تلاطم بپا ہوا۔ بہت عرصے بعد وہ دو دن کے لیے میکہ رہنے آئی تھی۔ نوری کے ہونٹوں سے مسکراہٹ جدا ہی نہیں ہو رہی تھی۔ عمر شادی کے بعد ہی الگ ہو گیا تھا اس کے جانے سے تائی امی مزید صدمے میں تھیں اس لیے انہوں نے زید کی نوکری کا بھی انتظار نہیں کیا اور نوری کو مانگ لیا۔ اب وہ کوئی رسک نہیں لے سکتی تھیں۔ انہیں شروع سے خواہش تھی کہ ماہی اور نوری دونوں ان کی بہو بنیں مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

سب گھر والے اسے لاپروا لڑکی سے ایک محتاط عورت میں بدلنے کے عمل کو فطری جان رہے تھے مگر تائی امی جو ماہی پر جان چھڑکتی تھیں شک میں پڑ گئیں۔

انہوں نے بہت دفعہ ماہی کی ماں سے کہا بھی تھا کہ ماہی سے پوچھیں وہ اتنی خاموش اور کھوئی کھوئی کیوں رہتی ہے مگر ان کی دیورانی کا خیال تھا کہ شادی سے پہلے لڑکی ایسی ہی ہوتی ہے۔ شادی کے بعد یہ تبدیلی فطری ہے۔ اور وہ صرف چند ہی دفعہ کہہ پائی تھیں۔

بار بار کہنے کے قابل ان کے بیٹے نے ان کو چھوڑا ہی کہاں تھا اور اب وہ چاہتی تھیں کہ نوری غیروں میں جا کر اپنی آب و تاب نہ کھوئے اس ہی لیے انہوں نے جھٹ پٹ منگنی اور پھر جلد ہی شادی کا فیصلہ کیا تھا۔ اور پھر نوری کی شادی اور ماہی کا آسٹریلیا جانا بس آگے پیچھے ہی طے پایا۔ گم صم سی ماہی بس اپنی پیکنگ ہی میں مصروف رہی نوری کی شادی کی تیاریوں میں وہ شامل ہی نہ ہو پائی۔

☆☆☆

تایا ابا کے انتقال کی خبر اسے آسٹریلیا ہی میں ملی۔ وہ بہت روئی مگر وہ جو چاہتی تھی کہ کوئی کندھا اسے میسر آئے

، وہ کندھا اس کے پاس ہوتے ہوئے بھی اس کے دکھوں کے لیے تو کبھی نہیں تھا سوائے آنسو صاف کر کے زندگی کی گہما گہمی میں دوبارہ مصروف ہونا پڑا۔

تین بچوں کی ذمہ داری نے اسے ایک اور ماہی میں بدل ڈالا تھا۔ وہ اب اپنے گھر کی چہیتی لاڈلی ماہی کے بجائے ان بچوں کی ماں اور بچوں کے باپ کی بیوی تھی ایک ذمہ دار عورت جس کو ہر چیز سے پہلے اپنی گھر ہستی کی فکر دامن گیر ہوتی ہے اس کے اندر کا لاابالی پن شوخی، ظرافت سب ہی وقت کی گرد تلے دبتے چلے گئے تھے۔ اور ایک نئی عورت کا جنم ہوا تھا۔

یہاں اسے اپنی ایک پرانی اسکول فیلو ملی وہ تو اتنی بردباری ماہی کو ہضم ہی نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ یکسر بدل گئی ہے۔ وہ اونچے اونچے قہقہے وہ ڈھیروں ڈھیر باتیں کرنے والی لاابالی سی لڑکی بھلا کہاں گم ہو گئی تھی۔ ماہی کی وہ اسکول فیلو اس سے ملنے کے بعد جب اس کی بیٹی نے حیرت سے اس سے پوچھا تھا کہ کیا وہ آنٹی جو قصے سنا رہی تھیں وہ سچ مچ۔ ان ہی کے تھے تو اس نے ایسے اور بھی کئی قصے سنائے۔

مرد جب خود بیٹی کا باپ بنتا ہے تب اس کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے بیوی ملکیت جانا کبھی نہیں سوچا کہ یہ لڑکی کسی کے جگر کا ٹکڑا ہے۔ کسی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور کسی کے دل کا قرار ہوگی۔ انسان بہت بے رحم ہے جب تک خود کسی چیز کا تجربہ نہیں ہو جاتا۔ تب تک وہ کچھ بھی آسانی سے نہیں سیکھتا۔ وہ بہت عقل مند لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں کے تجربے سے سیکھ لیتے ہیں مگر بجیر ان عقل مند لوگوں میں سے نہیں تھا۔

☆☆☆

بھلا گوشت سے ناخن جدا ہوئے ہیں، جو بجیر اور ماہ رخ پاکستان سے اپنی وابستگی بھلا دیتے اور یوں بھی جب بچوں کی شادیوں کا وقت آتا ہے تو بیرون ملک لوگوں کو اپنے ہم وطن رشتے دار یاد آ ہی جاتے ہیں جب ہی کومل اور نحل کے رشتے کے لیے انہوں نے سب سے پہلے پاکستان میں مقیم اپنے بھانجے بھتیجوں کو سوچا اور نوری نے تو فوراً ہی کومل کو مانگ لیا

مگر بجیر کی آپا نے بہت سوچ بچار کے بعد نحل کے رشتے کے لیے ہامی بھری اور پھر دونوں بیٹیوں کی شادی کے بعد ان دونوں نے بھی پاکستان شفٹ ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور پھر پورا سال لگا یہاں سیٹ ہونے میں اور شادی کی تیاری اس کے ساتھ تھی۔ اذلان جو کہ اب آسٹریلیا میں نوکری کر رہا تھا مانا نہیں اس لیے مجبوراً ان دونوں ہی کو آنا پڑا۔

☆☆☆

"ڈیڈ! میں واپس جا رہی ہوں۔" نحل نے باپ ساتھ ساتھ ماں کو بھی حیران کر دیا۔ لو بھلا ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے صرف تین مہینے۔

"وجہ" بجیر نے موبائل سے نظریں اٹھائیں قریب کا چشمہ اتارا اور اس کی سمت متوجہ ہوئے۔

"ڈیڈ! میں باہر رہی۔ باہر پلی۔ مجھے عادت نہیں ہے بے جا روک ٹوک کی۔"

"کون کرتا ہے روک ٹوک میری بیٹی پر۔" بجیر فدا ہوئے جا رہے تھے اور انداز ایسا تھا جیسے وہ ننھی بچی ہو اور ٹافی کی ضد کر رہی ہو جسے تھوڑی رد و کد کے بعد وہ مان لیں گے۔

اور پھر نحل کی پٹاری سے ڈھیروں چھوٹی چھوٹی رنجش بھری باتیں نکل آئیں ساتھ میں آنکھیں بھی بھیگیں لہجہ نم ہوا اور باپ کا دل فوراً ہی موم ہوا۔

"میں شایان کو کل ہی بلاتا ہوں۔"

"کل نہیں۔ فیصلہ ابھی ہوگا۔ اگر وہ چلنا چاہے تو چلے ورنہ میں اکیلی چلی جاؤں گی۔" نحل نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا جس پر باپ نے فوراً ہی عمل بھی کر دیا۔

شایان اکیلا نہیں آیا تھا ساتھ میں اس کی والدہ یعنی بجیر کی بہن بھی تھیں۔ پھر گلے شکوؤں کا ایک طویل سیشن ہوا خود ماہی بھی شرم سار ہونے لگی کہ ایک دن میں چوبیس گھنٹے اور کل نوے دن یعنی کل دو ہزار ایک سو ساٹھ گھنٹوں میں بیس پچیس ہزار شکوے اور منٹوں کے حساب سے شکایتیں پیدا ہوئی ہیں۔

ماہی خاموشی سے سر جھکائے فریقین کو سن رہی تھی اور اعداد و شمار کر رہی تھی۔ پچھلے پچیس تیس سالوں نے تہمینہ آپا کو بھی بہت بدل دیا تھا اب وہ قدرے صلح جو اور

معاملہ فہم ہوگئی تھیں مگر بے صبری ہوئی جارہی تھیں۔
"آپا! تو پھر آپ کیا کہتی ہیں۔ شایان تحمل کے ساتھ باہر ہی شفٹ نہ ہوجائے۔" سجیر نے مزے سے ایک ماں سے اس کے بیٹے کو جدا کیا بے شک سجیر بھی گئے تھے مگر ماہی کے کہنے پر نہیں اپنی خواہشات اور اپنی مرضی سے مگر یہاں شایان تھا جو بیوی کے پہلو سے جدا ہونے پر راضی نہ تھا۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ تحمل کے کپڑے امی کے حساب کے نہیں ہوتے نا اس نے تحمل کی کھانے کی عادت کو نشانہ بنایا تھا بلکہ وہ تحمل کو برابری کا حق دے رہا تھا۔
"ہاں امی! ویسے بھی لڑکی اگر چاہے تو جہاں رہتی ہے وہ وہیں رہنے کی شرط رکھ سکتی ہے۔" شایان نے مزے سے ماں کو منایا۔
ماہی ایک سمت بیٹی کے محفوظ مستقبل پر جہاں مطمئن ہورہی تھی کہ شایان کانوں کا کچا نہیں وہیں تہمینہ آپا کے اترے چہرے کو دیکھ کر شرمندہ بھی ہورہی تھی۔
"چلو بھئی جو تم میاں بیوی کی مرضی۔ میں نے تو صرف ماہی کے منہ پر تحمل کو لیا تھا۔ میں نے اس کو کبھی گلہ شکوہ کرتے نہیں دیکھا اس نے تو اپنے آپ کو سسرال میں ایسا ڈھالا کہ اپنے پرانے مزاج و عادات کو یکسر فراموش کردیا تھا۔ میں نے سوچا کہ ماں نے اپنے جیسا ہی بنایا ہوگا۔ مگر ہماری ماہی جیسی اور کوئی نہیں۔"
آپا تہمینہ پرس اٹھا کر افسردہ سی باہر کی سمت بڑھ گئیں اور ماہی سوچ میں پڑ گئی کہ اتنے عرصے بعد ملنے والے اس جملے پر خوش ہو یا زبردستی خود پر سنجیدگی متانت کے چڑھائے جانے والے خول پر افسردہ ہو۔
"تہمینہ آپا! آپ نے بہت دیر کردی اعتراف کرنے میں۔"
اس نے دل ہی دل میں ان سے مخاطب ہو کر کہا۔
پھر کچھ عرصے بعد دونوں بیٹیاں بھی آسٹریلیا چلی گئیں۔
گھر میں خاموشی کا راج ہوگیا جب اتنے عرصے بعد سجیر ایک پرانا البم اٹھا لائے جس میں ان دونوں کی ڈھیروں تصاویر تھیں، اس کی شادی سے پہلے کی اوٹ پٹانگ تصاویر دیکھ کر سجیر کو اندازہ ہوا کہ وہ کتنا بدل دی گئی ہے۔
"تم اتنی خاموش چپ چپ سی تو نہ تھیں۔ اب ایسی کیوں ہوگئی ہو، سوری یار! میری وجہ سے تم نے خود کو اتنا بدل لیا اب تمہاری تصویریں دیکھ کر دکھ ہورہا ہے۔ میں نے کبھی تم کو ایک فرد کی حیثیت نہیں دی۔ ایک انفرادی حیثیت جس کی مستحق ہر لڑکی ہر عورت ہوتی ہے۔" وہ کروشیا بنتی ماہی کے پاس آ بیٹھا تھا۔
اس نے گھبرا کر کروشیا صوفے پر رکھا اور کھڑی ہوگئی۔
"شاید سالن جل رہا ہے۔" وہ یہ کہہ کر کچن کی سمت بڑھی اسے اب ان اعترافات کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ان کو سن کر اب کوفت سی ہوتی تھی۔ عورت نا ہوئی چابی سے چلنے والا کھلونا ہوگئی کہ جب دل کیا چلا لیا اور جب چاہا روک لیا۔
اس نے سالن میں چمچہ چلاتے ہوئے سوچا جبکہ سجیر کے دل کو اس کے عمل نے ایک نئے دکھ سے روشناس کروایا تھا۔ اس نے ماہی کو اپنی مرضی کے سانچے میں تو ڈھال لیا تھا مگر وہ اس کے دل سے اتر گیا تھا۔ وہی جس کے ساتھ اس کی ساری زندگی گزری تھی اور باقی بھی گزرنی تھی وہ ہم سفر بھی آج دل درد سے آشنا تو ہوا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

دل ایسے شہر کے
پامال ہو جانے کا منظر بھولنے میں
ابھی کچھ دن لگیں گے۔
وہ اک گھر بھولنے میں
ابھی کچھ دن لگیں گے
مگر، اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں؟
بس اک دن دل کی لوحِ منتظر پر
اچانک رات اترے گی
میری بے نور آنکھوں کے
خزانے میں چھپے
ہر خواب کی تکمیل کردے گی
مجھے بھی خواب میں تبدیل کردے گی
اک ایسا خواب
جس کا دیکھنا ممکن نہیں تھا
اک ایسا خواب، جس کے دامنِ صد چاک میں
کوئی مبارک، کوئی روشن دن نہیں تھا۔

☆☆

ماہنامہ کرن

مئی 2025ء کے شمارے کی ایک جھلک

- مشہور ادبی اور سماجی شخصیت "شگفتہ فرحت" کا "بہو سے ساس تک" کا سفر،
- اداکار "عمر اقبال" کہتے ہیں "میری بھی سنیئے"،
- "تاش گھر" ایمل رضا کا سلسلے وار ناول،
- "لویزا" سعیعہ عمیر کا مکمل ناول،
- "گنوا کر دل و جاں ہم" اُمِ طیفور کا مکمل ناول،
- "تحمل وفا" فرح بخاری کا ناولٹ،
- "دلن" ام ہانی کا ناولٹ،
- "قیس جنگل میں اکیلا ہے" منشاء محسن علی کا ناولٹ،
- "اے دل اے سودائی" حفیظہ لعل دین کا ناولٹ،
- قانتہ رابعہ، سازیہ ستار نایاب اور صائمہ نور کے افسانے اور مستقل سلسلے،
- **"کرن کتاب"**

دلچسپ معلوماتی مضامین اور مزے دار کھانوں کی ترکیبوں کے ساتھ،

مئی 2025ء کا شمارہ شائع ہوگیا

آمت العزیز شہزاد

بس تھوڑی سی بے وفائی

رات بھیگ رہی تھی...... فضا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔ لان کے درختوں کے تنوں کے گرد لپٹے برقی قمقمے کہر میں دھندلے پڑ گئے تھے۔ شادی کا ہنگامہ دلہن رخصت ہوتے سمے اپنے آنچل سے باندھ کر لے گئی تھی اور اپنے پیچھے یہ اداسی، یہ کہر آلود تنہائی اور دل فگار خاموشی چھوڑ گئی۔

داؤد خان لاؤنج کے سفید اور کالے دبیز صوفے پر یوں ٹھس سا بیٹھا تھا گویا اس کے جسم میں جان ہی باقی نہ بچی ہو۔ اور اس میں کچھ شک بجا نہیں تھا کہ اس کی اکلوتی دختر ”روشنی“ واقعی اس کی جان، اس کا محور و مقصود حیات تھی۔

وہ ایک گریس فل پرسنالٹی کا حامل شخص تھا۔ بال اب تک کالے تھے ان میں کہیں کہیں سفیدی جھلکتی تھی۔ اس کی چمکتی آنکھیں اس وقت بھیگی ہوئی تھیں۔

”پتا نہیں، یہ بیٹیاں اتنی جلدی بڑی کیوں ہو جاتی ہیں؟“ اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی کی پشت سے آنکھوں کی حدود اور اس کی مضبوطی کا بھرم توڑتے آنسو کو جھٹکا۔ تب اس کی نگاہ اپنے بیڈ روم سے برآمد ہوتی اپنی بیوی پر پڑی......

وہ اکیلی ہوتی تب وہ نہ چونکتا اس کے ساتھ اس کا براؤن سوٹ کیس بھی تھا۔ وہ بے ساختہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بے تابانہ اس تک آیا......

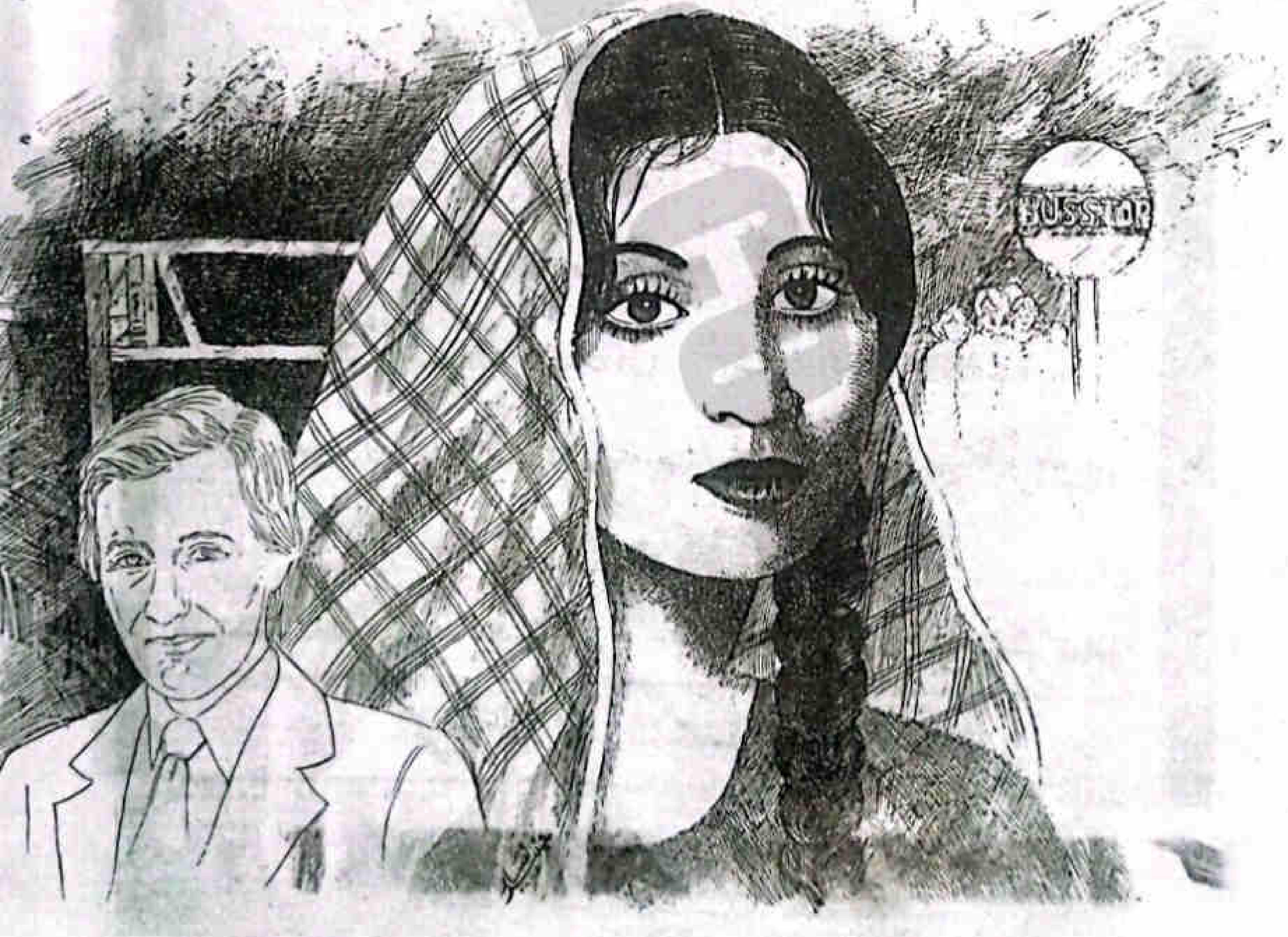

"یہ کیا....." اس نے تحیر سے کہنا شروع کیا۔

"امید! تم اس وقت کہاں جا رہی ہو؟" اور امید نے نہ سوٹ کیس کا ہینڈل چھوڑا نہ اس کی طرف دیکھا بس اتنا بولی۔

"میرا کام بس یہیں تک تھا داؤد...... امانت حق دار کو بحفاظت پہنچ گئی سو میرا کام مکمل ہوا......"

"مگر تم کہاں جا رہی ہو؟ اور کیوں...... کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟ تم ناراض ہو مجھ سے؟" وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اس کے کندھے تھام کر بے قراری سے پوچھنے لگا...... اب کی بار امید نے نگاہ اٹھائی اس کی آنکھوں میں آنسو زیادہ تھے یا شکوے...... داؤد اندازہ نہ کر سکا۔

"غلطی تم سے نہیں...... مجھ سے ہوئی تھی...... آج سے چودہ سال پہلے اور غلطی کی تلافی تو خود ہی کرنی پڑتی ہے۔" اس نے بے بسی سے روتے ہوئے کہا۔ "امید!" وہ بلند آواز میں چلایا، اور اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس گویا چھین کر رکھا اور ڈپٹ کر اس سے پوچھنے لگا۔

"بتاؤ کیا بات ہے؟ آخر اس طرح ناراض ہو کر گھر سے جانے کا کیا مطلب ہے؟"

"مطلب میں بتا چکی ہوں تمہیں...... میرا فرض منصبی مکمل ہوا...... اب اس گھر میں میرے مزید رکنے کا کیا جواز؟" اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی اس کے قدموں کی طرح۔

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم...... یہ گھر تمہارا ہے۔ تم یہاں سے کیوں جاؤ گی؟" دفعتاً امید ہذیانی انداز میں اس کے ہاتھ جھٹک کر چلائی۔

"نہیں ہے یہ میرا گھر...... نہ گھر...... نہ روشنی...... نہ تم کچھ بھی میرا نہیں ہے۔ میں بے وقوف تھی جو آج تک اسی سراب کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتی چلی آئی۔" وہ اس بری طرح بکھری تھی کہ داؤد سے سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔

"امید...... میری جان! ہوش کرو، کسی نے کچھ کہا ہے تمہیں مجھے بتاؤ۔" وہ اسے بازوؤں کے حلقے میں لے کر پچکارنے لگا۔

امید نے تنفر سے اسے پرے دھکیلا۔

"نہیں داؤد! میں اب تمہاری جھوٹی محبت کی پر فریب باتوں کے جال میں نہیں الجھ سکتی...... اچھا ہوا جو میری حیثیت مجھ پر تمہاری ہی زبانی آشکار ہوئی کوئی اور کہتا تو مجھے یقین نہیں آتا۔ مگر تم پر تو مجھے آج بھی خود سے زیادہ یقین ہے۔" وہ شکستگی سے پھر رو پڑی۔ داؤد بری طرح جھنجلا گیا۔

"کیا بے کار کا تماشا کھڑا کر رہی ہو۔ سارے نوکر ابھی یہاں اکٹھا ہو جائیں گے۔ آخر پتا تو چلے کہ ہوا کیا ہے؟"

"خوب؟" وہ طنزیہ مسکرائی مگر آنکھوں سے متواتر آنسو گر رہے تھے۔ "تم چاہتے ہو کہ قتل بھی کر دو اور چرچا بھی نہ ہو۔"

"شٹ اپ۔" وہ درشتی سے دھاڑا۔ "تمیز سے بات کرو اور سیدھی طرح بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟" اس کی برداشت کی حد یہیں تک تھی۔

اور پھر وہ کوئی "دیا" تو تھی نہیں کہ جس کی بدتمیزی بھی وہ سر آنکھوں پر سنبھال رکھتا......

وہ زہر خند ہو کر بولی۔ "معاملہ یہ ہے کہ جس مقصد کے لیے تم نے مجھے اپنایا تھا...... وہ پورا ہوا...... لہٰذا اب میرا یہاں مزید رہنا بے معنی ہے۔"

"یہ تم سے کس نے کہا؟" وہ تیز لہجے میں پوچھنے لگا۔

"تم نے۔" وہ بڑے سکون سے بولی۔ طوفان کی تباہ کاری کے بعد کا سکون۔

"میں نے؟" داؤد استعجاب سے بولا۔

"ہاں تم نے...... لکھا ہے تمہاری ڈائریوں میں، چاہو تو جا کر دیکھ لو اگر بھول گئے ہو تو......"

وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ تب ہی باہر گیٹ پر کسی گاڑی کا ہارن گونجا۔ اور امید نے دوبارہ سوٹ کیس اٹھا لیا۔ گھر سے نکلتے اس نے ایک الوداعی نظر گھر کے در و دیوار پر ڈالی جو اس کے اپنے کبھی تھے ہی نہیں مگر یہ سچائی اس پر آج آشکار ہوئی تھی۔

☆☆☆

"تت...... تمہاری آنکھوں میں نمی ہے داؤد؟"

دیا نے چاول کھاتے ہوئے چمچہ پلیٹ میں رکھ دیا اور حیرت آمیز تاسف سے بولی۔

"ہوگا...... کبھی غور نہیں کیا۔" اس نے اپنے سامنے رکھی ڈشز سے بھرپور انصاف کرتے ہوئے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔ وہ اور دیا اس وقت لنچ کرنے آفس کے قریبی چائنیز ریسٹورنٹ میں آئے تھے۔

"اوہ میرے خدا۔" دیا نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور اذیت آمیز انداز میں نیچے دیکھتے ہوئے اپنا سر نفی میں ہلانے لگی۔

"کیا ہوا...... پھر سر درد؟" داؤد نے یک لخت کھانا چھوڑ کر اس کی جانب فکر مندی سے دیکھا۔ "چلو اٹھو...... فوراً ڈاکٹر کے پاس چلو۔" وہ اٹھنے لگا۔

"مجھ سے کیسے چوک ہوگئی؟ میرا دھیان تمہارے تل کی طرف کبھی کیوں نہیں گیا؟"

"ہیں؟ یہ کیا بول رہی ہو......" وہ حیرت سے بولا۔

"پلیز......" دیا ہاتھ کے اشارے سے اسے ٹوکتی ہوئی بولی۔ "میں اس وقت گھر جا رہی ہو...... بعد میں بات کرتے ہیں۔" وہ اپنا ہینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مگر ایسے کیسے...... ارے بات تو سنو۔ بھئی کیا ہوا" مگر داؤد کی بات سنے بغیر وہ ریسٹورنٹ سے باہر جا چکی تھی...... وہ ہکا بکا رہ گیا۔

☆☆☆

دیا سبطین...... اپنے دھیمے سلگتے نام کے برعکس بھڑکتا شعلہ تھی...... والدین بچپن میں گزر گئے تھے۔ خالہ نے اپنے چھ بچوں کے ساتھ خدا خوفی کے تحت اسے جیسے تیسے پال ہی لیا تھا...... اگر دو وقت کی روٹی کھلا دینا اور چھت کا آسرا فراہم کرنا ہی پالنا کہلاتا ہے تو واقعی اسے اس کی خالہ نے پالا تھا۔ باقی تن ڈھانپنے کے لیے اترن بھی مل جاتی تھی اور کھیلنے کے لیے ٹوٹے کھلونے بھی۔ پھر پتا نہیں کب اس نے اپنا حق مانگنا سیکھ لیا تھا۔ سرکاری اسکول میں دل لگا کر پڑھتی تھی۔ بڑی جماعتوں میں آئی تو اپنی کتابوں وغیرہ کا خرچا ٹیوشن پڑھا پڑھا کر پورا کرنے لگی......

اس میں سے کچھ بچتا تو اپنے چھوٹے موٹے دوسرے اخراجات بھی نکال لیتی۔ خالہ کو اس کی ذات کی پروا اب اتنی نہیں رہی تھی کہ ان کی شادی کے لائق چار بیٹیاں ہی ان کی فکرات کا محور بن کر رہ گئی تھیں۔

وہ بڑا سہانا دن تھا کہ جس دن وہ یونیورسٹی میں داخل ہوئی تھی۔

☆☆☆

داؤد خان...... اونچا لمبا...... گورا چٹا...... گھنے سیاہ بالوں اور خوابیدہ آنکھوں والا خوبرو سنجیدہ بردبار اور لیے دیے رہنے والا نوجوان تھا...... وہ مزاجاً روایتی مرد تھا۔ سارا خاندان پشاور میں آباد تھا۔ وہ پڑھائی کی غرض سے یہاں آیا تھا۔

اسے چیخ چیخ کر باتیں کرنے والی لڑکیاں سخت ناپسند تھیں۔ اس کے خیال میں لڑکیوں کو سبک خرام ندی کی طرح ہونا چاہیے تھا نہ کہ چڑھتے ہوئے چنگھاڑتے دریا کی مانند منہ زور مگر کیا کیا جائے۔

اکثر جو چیز طبیعت کو نہیں بھائے وہ دل کو بھا جاتی ہے۔

شاید دل انسان کا ازلی دشمن ہے۔

☆☆☆

"جب میں نے آپ سے کل ہی فرما دیا تھا کہ کل "یعنی آج میں" نسخہ ہائے وفا" ایشو کرواؤں گی تب آپ کی ہمت کیسے ہوئی اس کتاب کو کسی اور کو دینے کی۔" وہ پنک کاٹن کی قمیص، بلیو جینز میں ملبوس سفید اونی شال کندھوں کے گرد لپیٹے ایک ہاتھ کمر پر ٹکائے اور دوسرا ہاتھ نچا نچا کر لائبریری انچارج سے الجھ رہی تھی۔ انچارج کی موٹے عدسوں اور کالی کمانی والی بھاری بھرکم عینک ناک کی نوک پر ٹکی ہوئی تھی جبکہ اس کی آنکھیں دیا پر ناگواری سے مرکوز تھیں۔

"دیکھیے محترمہ...... یہ لائبریری ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ یہاں آہستگی سے گفتگو کریں۔ دوئم یہ کہ گفتگو تمیز کے دائرے میں ہو، سوئم۔" مگر بات مکمل

کرنے کی حسرت اس کے دل میں پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ اور لب محض تھرتھرا کر......

''بھاڑ میں گیا دوئم سوئم...... مجھے کتاب چاہیے جب میں آپ سے کہہ گئی تھی۔'' اب کی بار انچارج نے اس کی بات نہایت بے دردی سے اچکی تھی۔

''کیا آپ نے اس لائبریری کے جملہ حقوق اپنے نام کروا لیے ہیں جو مجھ سے اس لہجے میں گفتگو فرما رہی ہیں آپ...... جائیے نہیں دیتا میں آپ کو کتاب......تب آپ کیا کر لیں گی۔'' وہ بھنا گیا تھا۔

''ارے واہ......'' اس نے لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچایا۔ ''دیکھتی ہوں کیسے نہیں دیتے۔''

''جاؤ......اور اچھی طرح دیکھ لو۔'' وہ جارحیت سے بولا۔

''سر پلیز...... معاملہ ختم کریں۔'' دیا کی سہیلی مونا نے جو دوران لڑائی اس کے ساتھ ہی ایستادہ تھی جھگڑا بڑھتے دیکھ کر مداخلت کی۔

''چلو اب تم یہاں سے...... کیوں اپنی شامت بلوانی ہے۔'' وہ اسے کھینچتی ہوئی بولی۔

''مگر انہوں نے کل میرے کہنے پر اطمینان سے گردن کیوں ہلائی تھی؟''

وہ روہانسے لہجے میں بولی انداز شکایتی تھا۔

''میری ماں!'' اس نے جھلا کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ ''ہوگئی ان سے غلطی ......اب معاف کرو۔''

''مگر مجھے نوٹس بنانے تھے......اب کیا کروں گی؟'' آنسو بہہ نکلے۔

''اوفوہ......ریڈی میڈ نوٹس سے کام چلا لینا۔'' وہ زچ ہو کر بولی۔

''کبھی نہیں۔'' اس نے بچوں کے سے انداز میں پیر پٹخے۔

''یہ لیں......'' معاً کوئی اس کے عقب سے بولا۔ وہ بے ساختہ بولی۔ ''اور ختم کریں یہ تماشا، آپ کو اتنا احساس بھی نہیں کہ یہ لائبریری ہے اور یہاں آپ اس قدر ہنگامہ برپا کیے ہوئے ہیں۔''

داؤد نے کتاب اس کے ہاتھ میں زبردستی تھماتے ہوئے درشت لہجے میں جھاڑ بھی پلا دی......

مگر دیا نے اس کی ڈانٹ......یا جھاڑ جو کچھ بھی تھا کا برا قطعی نہیں مانا الٹا اس کی شکر گزار ہوئی۔

''تھینک یو...... تھینک یو سو مچ۔'' اس کی آنکھوں کی جگمگاہٹ اور لبوں کی مسکان دید نی تھی اور وہ دیکھ رہا تھا۔ یک ٹک بنا پلک جھپکے۔

کیوپڈ کے تیر والی بات اگر سچ ہے تو وہ اس کے تیر کا گھائل ہو چکا تھا۔

☆☆☆

نوٹس اچھے بن گئے تھے۔ سو دیا کا موڈ بھی بے حد خوش گوار ہو چلا۔

لائبریری والے واقعے کو پورے پانچ روز گزر چکے تھے مگر پھر بھی اس نے جا کر انچارج سے معذرت چاہی۔ انہوں نے بھی کوئی موٹی سی کتاب پڑھتے پڑھتے گردن خفیف سی ہلا کر معذرت قبول کر لی۔ کتاب اسے داؤد ہی کو شکریہ کے ساتھ واپس کرنی تھی۔ سو وہ اسے پوری جامعہ میں ڈھونڈتی پھری۔

وہ کینٹین میں اپنے دوستوں کے ساتھ ملا۔ دیا بے دھڑک اس تک چلی آئی۔

''یہ لیں اپنی کتاب...... آپ کا بہت بہت شکریہ اگر آپ مجھے یہ کتاب نہ دیتے تو میں اپنے نوٹس کبھی نہ بنا پاتی۔'' سارے لڑکے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو معنی خیز اشارے کرنے لگے...... داؤد نے جلدی سے کتاب پکڑ کر اسے ٹالنا چاہا۔

''اٹس اوکے۔'' اسی لیے روکھے لہجے میں بولا تھا۔

''مجھے خوشی ہوگی اگر میں آپ کے کسی کام آسکوں۔'' اس نے خلوص سے کہا۔

لڑکوں کو کھنکارتے کھنکارتے گویا کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا۔ اور داؤد کو غصے کا۔

''بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی...... اب جاؤ

یہاں سے۔'' اس نے اس بار جھڑک کر کہا تھا۔ اس کی جگر جگر کرتی آنکھوں میں پہلے تحیر اس کے بعد موٹے موٹے آنسو ابھرے اور وہ انہیں ضبط کرتی پلٹ گئی۔

''کیا بات ہے بھئی تیری شہزادے...... پوری یونی ورسٹی میں کسی لڑکے کو منہ نہیں لگاتی۔ ماننا پڑے گا تیری ذہانت کو کیسے اسے رام کیا ہے کہ تیرے کام آنے کو مری جا رہی ہے۔'' عامر لفنگے پن سے بولا تو وہ بھڑک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''زبان سنبھال کر بات کرو عامر! ہر لڑکی کو ایک ہی خانے میں فٹ کرنے کی کوشش مت کیا کرو۔'' وہ کہہ کر رکا نہیں لمبے لمبے ڈگ بھرتا کینٹین عبور کر گیا۔

''اوئے ہوئے؟'' سب نے ایک بار پھر آنکھیں نچائیں، گویا یہ بات ہے۔

تین دن ہو گئے تھے وہ یونیورسٹی نہیں آئی تھی۔

اور داؤد کو لگتا تھا جیسے یہ تین دن نہیں، تین صدیاں گزر گئی ہوں۔ ہر منظر ادھورا اور بے جان معلوم ہو رہا تھا۔ رگ و پے میں لہو نہیں بے چینی دوڑ رہی تھی تو سینے میں کچھ سلگ رہا تھا۔ کیا؟ یہ وہ جاننے سے قاصر تھا چوتھے دن کہیں جا کر اس کی صورت دکھائی دی تو منظر مکمل اور جان دار محسوس ہوا۔ رگ وپے میں سرور اور سینے میں ٹھنڈک آنکھوں میں روشنی...... وہ دیوانہ وار اس کی جانب دوڑا۔

''دیا! تم کہاں تھیں؟'' اس نے کچھ ایسی تڑپ سے پوچھا کہ وہ متحیر رہ گئی پھر سنبھل کر بولی۔

''تم سے مطلب؟''

وہ سوچنے لگا کہ اب کیا کہے...... اپنی بے قرار راتوں کا احوال اگر اسے یوں ہی سر راہ سنا دیا تو کیا وہ یقین کرے گی؟

''فکر تھی تمہاری کہ تم کہاں ہو؟'' وہ خود پر قابو پا کر بولا۔

وہ جو ٹھہر گئی تھی پھر چلنے لگی وہ اس کے ہم قدم تھا۔

''میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود اپنی فکر کرنے کو کافی ہوں۔'' اس نے سر جھٹک کر اضمحلال سے کہا تو داؤد کا دل تڑپ کر رہ گیا۔

''ہوں...... بخار تھا اور سر میں درد بھی۔'' وہ غالباً زیادہ دیر ناراض رہنے والوں میں سے نہیں تھی۔

''اوہ ہو۔'' وہ تشویش سے بولا۔ ''ڈاکٹر کو دکھایا؟''

''ڈاکٹر کے پاس جا کر اس کی فیس ادا کرنا میں افورڈ نہیں کر سکتی...... اپنے طور پر دوا لے لی تھی۔'' وہ تلخی سے بولی۔

اور داؤد کا دل تاسف میں ڈوب گیا۔

دوسرے دن یونی آف ہونے کے بعد وہ اس سے ملا۔ وہ اسٹاپ پر کھڑی تھی۔

''میرے ساتھ چلو گی؟''

''کہاں؟'' اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ وہ گڑبڑا گیا۔ وہ اپنے طور پر محبت کی ابتدائی منازل طے کر بیٹھا تھا مگر اس میں آج تک دیا کو کچھ بتانے کی ہمت نہیں آسکی تھی۔

''تم سچ سچ بتاؤ داؤد! آخر مجھے سمجھ کیا رہے ہو؟ کیا میں تمہیں کوئی ایسی ویسی لڑکی......''

''اوہ شٹ اپ پلیز...... اب تم مجھے ایسا ویسا سمجھ رہی ہو۔'' وہ انگلی اٹھا کر تنبیہہ کرنے والے انداز میں بولا۔ ''میں تو ایک دوست ہونے کے ناتے تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

''مگر ہماری دوستی کب ہوئی؟'' اس نے تمسخر سے کہا۔

''نہیں ہوئی تو لو۔ آج اور ابھی بلکہ اسی وقت میں تمہارے آگے دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔'' اس نے واقعی ہاتھ بڑھایا۔

دو منٹ تو دیا اسے یوں دیکھتی رہی گویا جانچ رہی ہو پھر اس کے بعد دیا نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا...... کبھی نہ چھوڑنے کے لیے۔

☆☆☆

داؤد نے اسے لے جا کر ڈاکٹر کو دکھایا۔ دوا دلائی۔ وہ منع کرتی رہی مگر اس نے ''کیا دوست ہونے کے ناطے میرا اتنا فرض بھی نہیں'' کہہ کر اسے

خاموش کروادیا۔ پھر آرام کرنے اور گھر پر رہنے کا مشورہ دینے لگا۔

''داؤد پلیز، مجھے ایسے ٹریٹ مت کرو۔ میں ان رویوں کی عادی نہیں ہوں۔'' اس کی آواز بھیگ گئی۔

''کیوں؟ کیا تمہارے والدین تمہارا خیال نہیں کرتے؟'' وہ یہی سمجھ سکا۔

''وہ میرے بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ مجھے میری خالہ نے پالا ہے۔'' وہ گردن موڑ کر گاڑی سے باہر دیکھنے لگی۔

''اوہ...... آئم سوری۔'' وہ شرمسار سا ہوا تھا۔ پھر بولا تو لہجہ شریر تھا۔

''اگر آج تک تمہارا کسی نے خیال نہیں رکھا تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ کوئی آئندہ بھی نہ رکھ سکے گا۔''

''کیا پتا...... مجھے اپنی قسمت پر کچھ خاص بھروسا نہیں۔''

''ارے باپ رے...... اتنی قنوطیت۔'' وہ دانستہ اس کا دھیان بٹا رہا تھا۔

''اسے قنوطیت نہیں...... حقیقت پسندی کہتے ہیں۔ جو تم جیسے پیدائشی خوش نصیب کی سمجھ میں آسانی سے آئے گی نہیں۔ گاڑی یہیں سائیڈ پہ روک دو۔ یہاں سے میں پیدل ہی گھر جاؤں گی تمہاری گاڑی سے اگر کسی نے مجھے اترتے دیکھ لیا تو میرے کردار پر سو سو باتیں بنائے گا۔''

☆☆☆

داؤد کا فائنل سمسٹر نزدیک تھا۔ سو وہ سب کچھ پس پشت ڈالے پڑھائی میں منہمک تھا۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں کے ساتھ بنی سنگی بینچ پر بیٹھا رضا کے ساتھ کچھ ڈسکس کر رہا تھا تب ہی وہ آن دھمکی۔

''خوب...... یہاں پڑھائیاں کی جا رہی ہیں۔ اتنے دن سے حال پوچھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی تمہیں؟'' اس نے اپنے ازلی لڑاکا انداز میں کمر پر ہاتھ ٹکایا۔

رضا از حد دلچسپی جبکہ داؤد نے پھاڑ کھانے والے انداز میں اسے دیکھا۔

''میں اس وقت بزی ہوں...... بعد میں بات کرتے ہیں۔'' وہ اسے، اس کا لہجہ سب کچھ نظر انداز کرتا دوبارہ کتاب کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''بعد میں۔ میں بزی ہو جاؤں گی۔ بات اگر ہو گی تو اسی وقت ہو گی۔'' وہ اکڑ کر بولی۔

''آرام سے بیٹھ جائیں نا آپ...... پھر باتیں کریں۔'' رضا اپنے پھیلے نوٹس سمیٹتا بڑی خوش اخلاقی سے اس کے لیے جگہ بنانے لگا۔

''میں نے کہا نا۔ ابھی جاؤ یہاں سے۔'' اس بار داؤد نے آنکھیں نکالیں اور تمام لحاظ بالائے طاق رکھ کر اسے جھڑک ہی دیا۔

''آئندہ میرے پیچھے آئے تو منہ توڑ دوں گی۔'' وہ روہانسے لہجے میں گھونسا لہرا کر بولی اور مڑ کر چلی گئی۔

''کیا ہے۔ سن تو لیتے کہ آخر وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔'' رضا داؤد کے روڈ رویے کا بے حد برا منایا۔

''وہ کچھ نہ بھی کہے تو تب بھی میرا دل اس کے دل کی ہر آواز سن لیتا ہے۔'' داؤد نے دل ہی دل میں کہا۔ مگر زبان پر یہ جملہ تھا۔

''چھوڑو اسے...... ہاں تو ہم کیا ڈسکس کر رہے تھے؟''

☆☆☆

''سب میری ہی غلطی ہے۔'' اس نے سوں سوں کرتے ہوئے دل گرفتی سے کہا۔ وہ اس وقت اپنے مخصوص اسٹاپ پر کھڑی گھر جانے والی ویگن کا انتظار کر رہی تھی تب ہی داؤد نے اسے جا لیا اور لگا منت کرنے کہ ایک بار وہ اس کی بات تو سن لے۔

''میں نے ہی تمہیں سمجھنے میں سنگین غلطی کر دی۔ میں اس قابل ہی نہیں ہوں کہ کوئی مجھ سے دوستی کا اعلان سب کے سامنے بانگ دہل کر سکے۔''

وہ زود رنجی سے بولی۔ اسٹاپ سے رش تقریباً چھٹ چکا تھا۔ اکادکا موجود لوگ انہیں بڑی مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ داؤد جیسے سنجیدہ مزاج انسان کے لیے خاصی آکورڈ صورت حال تھی۔

اس لیے وہ جھنجلا کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

''باقی کا رونا دھونا گاڑی میں بیٹھ کر لینا یار...... یہاں سے تو چلو۔''

''نہیں چلوں گی تمہارے ساتھ۔'' وہ بھڑک کر چلائی۔

''اچھی بات ہے۔'' وہ غصے سے بولا۔ ''پھر میں تمہیں زبردستی گھسیٹ کر گاڑی میں ڈال لوں گا......اور لوگ مجھے اغوا کار سمجھ کر پیٹنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے اور اس کے بعد حوالہ پولیس کر دیا جاؤں گا۔ یہی چاہتی ہونا تم۔''

اور دیا نے مزید کچھ کہے بنا زور زور سے رونا شروع کر دیا اور داؤد کا جی چاہتا تھا کہ وہ اپنے ہی بال نوچ ڈالے۔

''چلو......؟'' اس نے رونے کے درمیان ذرا توقف کرتے ہوئے کہا تھا۔

اور داؤد ایک سیکنڈ بھی ضائع کیے بغیر فٹافٹ گاڑی میں آ بیٹھا۔

☆☆☆

اب وہ ریسٹورنٹ میں بیٹھی اس پر الزامات کی بوچھاڑ کیے جا رہی تھی۔

''تم سب کے سامنے مجھے دوست کی حیثیت سے متعارف کروانے میں شرمندگی محسوس کرتے ہو۔ میں نے بارہا محسوس کیا ہے تم سب کے سامنے مجھ سے یوں انجان بن جاتے ہو۔ گویا میں وہاں موجود ہی نہیں ہوں۔ ہاں تو ٹھیک ہی ہے نا۔ میرا معمولی حلیہ تمہارے لیے شرمندگی کا باعث بنتا ہوگا، کہاں تم امپورٹڈ کپڑے پہننے والے۔''

''میں لوکل کپڑے پہنتا ہوں۔'' اس نے پوری توجہ سے اس کی بات سنتے ہوئے ٹوکا۔

''اچھا!'' وہ حیران ہوئی۔

''خیر......تم اپنی بات جاری رکھو۔'' اس نے شاہانہ طریقے سے ہاتھ اٹھا کر اجازت دی۔

''میں کیا تمہیں پاگل دکھائی دیتی ہوں؟'' اس کے انداز پر تلملا گئی۔

''ارے کیوں؟'' وہ بوکھلا گیا۔ ''اب میں نے کیا کیا؟''

''میں تم سے شکایت کر رہی ہوں اور تم......'' اس نے تاسف سے ہونق بنے داؤد کو دیکھا۔

پھر مایوسی سے نفی میں سر ہلا کر اٹھنے لگی۔

''تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔''

''بیٹھو'' دفعتاً داؤد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دوبارہ اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اور اب تم غور سے سنو۔'' اس کا لہجہ اتنا گمبھیر تھا کہ وہ میکانکی انداز میں دوبارہ بیٹھ گئی۔ وہ بولنے لگا۔

''جب میں نے پہلی بار تمہیں لائبریری میں انچارج سے جھگڑتے دیکھا تو سچ پوچھو تو تم مجھے بہت بری لگی تھیں...... مجھے یوں چیخ چیخ کر بولنے اور بات بات پر مرنے مارنے پر تل جانے والی لڑکیاں بے حد بری لگا کرتی ہیں مگر......'' وہ رکا اور جیسے مناسب ترین لفظوں کا انتخاب کرنے لگا۔ دیا نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی تمہید سن رہی تھی۔

''مگر...... پھر نجانے کیا ہوا تم مجھے بے تحاشا اچھی لگنے لگیں۔ اتنی اچھی کہ جی چاہتا ہے تمہیں دنیا کی نظروں سے چھپا کر کہیں محفوظ کر لوں۔'' اس کی آنکھیں لو دے رہی تھیں اور الفاظ جیسے بھی رہے ہو...... ان سے سچائی شفاف موتیوں کی طرح دمک رہی تھی۔ دیا دم بخود رہ گئی۔

''کیا ہوا؟ کیا سو گئی ہو؟'' داؤد نے اس کی ٹھہری حیران آنکھوں کے آگے چٹکی بجائی۔

''تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے؟'' کچھ دیر بعد اس کے لب وا ہوئے۔

''جی ہاں۔'' داؤد کا جی چاہا وہ اپنا سر پیٹ لے۔ پہلی لڑکی دیکھی تھی جو اظہار محبت پر شرمانے لجانے کے بجائے الٹا سوال کر رہی تھی۔

"میں یقیناً یہی کہہ رہا ہوں۔"

"اگر محبت کرتے ہو تو سب کے سامنے مجھ سے بات کرنے سے کتراتے کیوں ہو؟" آنکھیں نکال کر تفتیشی انداز......

"میں اپنے اور تمہارے تعلق کو تماشہ نہیں بنانا چاہتا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

اور اس نے دیکھا۔ اب کی بار وہ کھل کر مسکرائی تھی بنا کسی فکر اور خدشے کے۔

☆☆☆

پھر وہ دونوں اتنی تیزی سے نزدیک آئے کہ خود ہی حیران رہ جاتے۔ داؤد خان ایک سیدھی سادی اور بہترین زندگی گزارتا آیا تھا...... جبکہ دیا کا معاملہ الٹ تھا۔ اس کی زندگی نہ سیدھی سادی تھی اور نہ بہترین۔ اور اب جو داؤد کی صورت میں اسے خوشی ملی تھی تو نجانے کیوں اس کے دل میں یہ خوف جونک کی طرح چمٹ گیا تھا کہ ہو نہ ہو زندگی کے کسی نہ کسی مقام پر جلد یا بدیر یہ خوشی بھی اس سے چھن جائے گی۔

داؤد اس کے واہموں پر ہنستا۔ اس کا مذاق اڑاتا۔ وہ زیادہ فکرمند ہوتی تو اپنی وفاؤں کا یقین دلاتا۔ دلاسے دیتا۔ دن پر لگا کر اڑ گئے اور داؤد کا فائنل سمسٹر آن پہنچا۔ اس نے پیپرز دیے اور اختتام پر اپنے گھر روانگی کی ٹھانی۔

دیا سے الوداعی ملاقات کے لیے آیا یہاں اس کے وہی خدشے۔

"ہمیشہ کے لیے جا رہے ہو نا، میں جانتی ہوں تم وہیں اپنی کسی کزن سے شادی کر لو گے اور لوٹ کر نہیں آؤ گے۔" وہ سینے پر ہاتھ باندھے منہ پھلائے پیش گوئیاں کر رہی تھی۔

"حیرت انگیز!" وہ بری طرح چڑ گیا، مگر بظاہر دلچسپی سے پوچھنے لگا۔

"کب سیکھی تم نے آسٹرولوجی؟ بتایا بھی نہیں...... اچھا خیر مزید بتاؤ...... میں مستقبل قریب میں اور کیا کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں؟"

"مذاق اڑا رہے ہو؟" اس نے جھنجھلا کر آنکھیں اٹھا کر اسے شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھا۔

"یار...... اب رونا شروع مت کر دینا۔ تم کیوں فضول باتیں سوچتی رہتی ہو۔" اور اس نے بھل بھل رونا شروع کر دیا۔ داؤد نے بے چارگی سے اسے دیکھا۔

"یار دیا...... پبلک پلیس ہے۔ تمہارے آنسو بھی صاف نہیں کر سکوں گا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ تمہارے یہ آنسو میرے دل پر گر رہے ہیں یار!" وہ لاچاری سے بولا۔ اس نے کچھ اتنے غیر رومانوی انداز میں رومانوی بات کی تھی کہ دیا بے ساختہ ہنس پڑی۔

"یہ ہوئی نا بات......" اس کا دل شاد ہو گیا۔ وہ مسکرا کر بولا تو لہجہ مضبوط تھا۔

"اپنے دل سے یہ وہم نکال دو دیا! داؤد خان نے تمہیں زبان دی ہے کہ وہ مر جائے گا۔ مگر کسی قیمت پر بھی تمہیں خود سے جدا نہیں ہونے دے گا۔"

"میں یقین رکھتی ہوں تمہارے جذبوں کی صداقت پر۔" وہ بے دردی سے اپنی آنکھیں رگڑ کر بولی۔ "مگر اس دل کا کیا کروں؟ پاگل سمجھتا ہی نہیں۔" اس کی آواز میں معصوم سی بے چینی تھی۔

"چھوڑو دل کو اس کے حال پر اور بتاؤ مجھے میں پشاور سے تمہارے لیے کیا لاؤں؟"

"دنداسے کے علاوہ جو جی چاہے۔" وہ مکمل سنجیدگی سے بولی۔ داؤد کھل کر ہنس پڑا۔

☆☆☆

"پڑھائی ختم...... اب آگے کا کیا سوچا ہے؟" وہ سکون سے ماں کی آغوش میں سر رکھے آنکھیں موندے ہوئے تھا تب ہی ماں نے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے سوال کیا۔

"جاب اور کیا......" وہ اطمینان سے بولا۔ ماں شفقت سے مسکرائی۔

"اور شادی......؟ شادی نہیں کرنی کیا۔"

"آپ اسحٰق کی کر دیں۔" اس نے خود سے چھوٹے بھائی کا نام لیا۔

''ہے بے وقوف۔'' ماں نے پیار سے سر پر چپت رسید کی۔ ''وہ ابھی چھوٹا ہے پہلے تیری ہوگی...... پھر دیکھ نا لڑکی کی یہی تو صحیح عمر ہوتی ہے اپنے گھر جانے کی...... زرینہ کتنی فکر مند رہتی ہے سبیکا کے لیے۔''

پہلے لبوں کی مسکراہٹ غائب ہوئی، پھر آنکھیں پٹ سے کھلیں اس کے بعد وہ خود ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا...... اور بڑی فکر مندی سے انہیں دیکھنے لگا۔

''سبیکا؟ اس کا یہاں کیا ذکر؟'' وہ سمجھ نہیں سکا۔

''کیوں......؟'' ماں کے تیور بگڑے۔ ''پھر اور کسی کا ذکر ہوگا؟ بچپن سے تیرے نام پر بیٹھی ہے۔ اور کتنا انتظار کرواؤں میں اپنی بہن کو؟''

داؤد کو لگا جیسے کسی نے کوہ ہمالیہ اس پر لاد دیا ہو۔ وہ بلبلا کر بولا۔

''مگر میں اس سے شادی نہیں کر سکتا!'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''خانہ خراب......'' ماں غصے سے بڑبڑائی اس کا سرخ و سپید رنگ آتش ہو گیا تھا؟ ''پھر کس سے کرے گا؟''

اور داؤد نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اسے ایسی سچویشن سے دوچار ہونا پڑے گا اور یہ تو بالکل بھی نہیں چاہا تھا کہ وہ یوں دیا کا ذکر اپنی ماں سے کرے گا مگر کیا کرتا...... کرنا ہی پڑا۔

''میری یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ دیا نام ہے۔ ماں وہ بہت اچھی۔ بہت معصوم لڑکی ہے۔ آپ اس سے ملیں گی تو۔''

''وہ سونے کی بھی ہو تب بھی مجھے قبول نہیں۔ میری بہو اگر کوئی بنے گی تو وہ سبیکا ہی ہوگی۔ لکھ لینا میری اس بات کو۔ یہ عجیب بات ہے۔ کرنے پڑھائیاں جاتے ہو اور لے کر بیویاں لوٹتے ہو۔ مگر یاد رکھنا تو نے ایسی کوئی حرکت کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' انہوں نے صاف جتا دیا۔

داؤد نے بے اندازہ پریشانی محسوس کی تھی۔

☆☆☆

فی الحال وہ جیسے تیسے شادی کے ذکر اور سبیکا کے لیے ماں کی فکر دونوں سے بمشکل جان چھڑا کر واپس کراچی لوٹا تھا۔ اور یہاں ایک ملٹی نیشنل فرم میں جاب کر لی۔ وہ متفکر تھا اور مضطرب بھی۔ دیا یہ بات محسوس کیے بنا نہ رہ سکی۔ اس نے اپنی باتوں کے درمیان داؤد سے بارہا سوال کیا تھا۔

''کیا ہوا...... اتنے پریشان سے کیوں لگتے ہو۔''

''وہم ہے تمہارا۔'' وہ صاف ٹال گیا۔ اپنی ماں کی خواہش اور مطالبہ اس کو بتا کر وہ اپنی پریشانیوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''نہیں بتاؤ مجھے۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولی تو وہ غصے میں آ گیا۔

''کیوں ایک بات کے پیچھے پڑ جاتی ہو...... میں تنگ آ گیا ہوں تمہاری بچکانہ عادتوں سے۔''

وہ اس بار بالکل خاموش رہی اور اسی خاموشی سے فون بند کر کے سوئچ آف کر دیا۔

''ارے......'' اس نے بے حد حیرانی سے فون کان سے ہٹایا۔

ایک بار، دوبار، تین بار، اس کا فون مسلسل پاور آف کی گردان کرتا رہا۔ داؤد نے جھنجھلا کر فون دیوار پہ دے مارا تھا۔

☆☆☆

''آئم سوری...... میں بہت بری ہوں جو تمہیں ہرٹ کیا...... تم جو سزا دو گے مجھے منظور ہوگی۔'' اگلی سہ پہر تین بجے جب وہ بے دلی سے اپنے آفس میں بیٹھا کسی فائل پر کام کم اور غلطیاں زیادہ کر رہا تھا۔ تب اسے دیا کا یہ پیغام جاں فزا ملا۔ پیغام پڑھ کر مزاج سے ساری تلخی جاتی رہی۔ موڈ خوشگوار اور ذہن بشاش ہو گیا۔ اس نے فائل ایک طرف کی اور ذرا ریلیکس انداز میں کرسی کی پشت سے کمر ٹکا کر فوراً اسے فون ملایا۔

''سزا تجویز کر لی ہے میں نے تمہارے لیے۔''

رابطہ قائم ہونے پر اس نے چھوٹتے ہی کہا۔
''کہو۔'' وہ روئی روئی سی آواز میں بولی گویا داؤد کے دل کو چیرے لگ گئے۔
''کل کا پورا دن میرے نام کرو۔'' وہ تحکم سے بولا۔
''تسلیم......'' اسے لگا وہ مسکرائی ہو۔ داؤد نے فون بند کر دیا۔
اور اب کی بار وہ دل جمعی سے فائل کی جانب متوجہ ہوا تھا۔
اور وہ دونوں پورا دن سوائے سمندر کی بانہوں کے اور کہاں گزار سکتے تھے سو وہیں چلے آئے...... پہلے گلے شکوے، روٹھنا منانا اس کے بعد بات مستقبل کی ہونے لگی۔
اب شام ڈھل رہی تھی۔ سمندر کی نمی بدمست ہوا، تیز ہو رہی تھی۔ آسمان کی نیلاہٹ پر شفق پھیلتی جا رہی تھی۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ پرندے اپنے ٹھکانوں کو واپس لوٹ رہے تھے تاحد نگاہ تک پھیلا زور آور، متکبر سمندر کچھ اور پراسرار لگنے لگا تھا اور اس کے کنارے دو دیوانے اپنے اردگرد سے بے نیاز مستقبل کے منصوبے بنا رہے تھے۔
''ہم ہر سال اپنی پہلی ملاقات کی اینی ورسری منایا کریں گے۔ اور وہ بھی کسی ہل اسٹیشن جا کر۔'' دیا اپنے اڑتے بالوں کو چہرے سے ہٹاتی ہوئی بولی۔
''اچھا آئیڈیا ہے۔'' وہ پر حدت نگاہوں سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔
''اور تم مجھے باقاعدہ ڈنر پر لے جا کر۔ ان فیکٹ کینڈل لائٹ ڈنر پر لے جا کر سرخ گلابوں اور انگوٹھی کے ساتھ ''ول یو میری می'' کہو گے۔ وہ انگشت شہادت اس کی جانب اٹھا کر دھونس بھرے لہجے میں بولی۔ تو اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں پر گرا لیا۔
''خدا کا شکر ہے۔ تم نے ڈائمنڈ کی انگوٹھی کی شرط نہیں لگا دی۔'' تو وہ برا مان کر بولی۔
''میں مادہ پرست نہیں ہوں۔ صرف زندگی کو خوابوں کی طرح بسر کرنا چاہتی ہوں۔ چوں کہ بچپن سے مجھے خواب بھی بہت حقیقت پسندانہ قسم کے آتے رہے ہیں، اس لیے میں نے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنا شروع کر دیے ہیں۔'' آخر میں اس کے لہجے میں افسردگی گھل گئی۔
''بہت اچھا کیا۔'' وہ اس کی اداسی بھانپ کر خوش دلی سے بولا۔ ''جاگتی آنکھیں بند آنکھوں سے زیادہ خوش کن خواب دیکھتی ہیں۔''
''ہوں...... چلو اب چلیں...... مجھے گھر ڈراپ کر دو...... مزید یہیں ٹھہرے تو مجھے دیر ہو جائے گی۔''
اس نے اپنی سفید اسٹریپ والی گھڑی دیکھی جو شام کے پانچ بجا رہی تھی۔
''اف...... تمہارے ساتھ وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔ کاش کے تمہارے ساتھ میرا وقت ٹھہر جایا کرے۔'' اس نے بڑے جذب سے دعا کی تھی۔ اور دل سے مانگی دعائیں کبھی رد نہیں کی جاتیں۔

☆☆☆

دن یونہی عام سے انداز میں گزرتے گئے۔
ہاں اتنا ہوا کہ داؤد جس فرم میں ملازم تھا وہیں اس نے ذرا سی کوشش کر کے دیا کو بھی رکھوا دیا۔ کہ اسے ضرورت تھی۔
داؤد کو بھی اطمینان رہتا تھا کہ وہ نظروں کے سامنے رہتی گو کہ آفس میں وہ اس سے بہت کیے دیے رہتی۔ بات بھی کام کی کرتی اور یہ داؤد ہی کی تاکید پر وہ کر رہی تھی وگرنہ اس کا بچکانہ مزاج......
داؤد کے اطمینان کی جھیل میں پہلا بڑا بھاری پتھر کل ہی پڑا تھا۔
کل ماں کا فون آیا تھا۔ زرینہ خالہ کی طبیعت نامعلوم وجوہات کی بنا پر بگڑ گئی تھی اور وہ سبیکا کو جلد از جلد دلہن بنے دیکھنا چاہتی ہیں اور داؤد کی ماں فیروزہ اسے دلہا...... وہ انہیں فون پر ہر طرح سے ٹال چکا تھا کہ ابراہیم خان...... اس کے والد نے اس کی ایک بھی سنے بغیر فوراً اسے پیشتر اسے پشاور طلب کیا۔
کیا کرتا...... جانا ہی پڑا۔
جانے سے قبل وہ ہلکے پھلکے انداز میں ان باتوں

کاذکر دیا سے کرنا چاہتا تھا۔ سیکا کو اپنانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا وہ ماں باپ کو دیا کے حق میں ہموار کرنے جا رہا تھا۔ یہی بات کرنے کی غرض سے وہ دیا کو لے کر نیچ پر آیا تھا۔ کہ نجانے کیسے اس نے داؤد کی آنکھوں کا تل باز یاب کرلیا تھا۔

اور بنا کچھ کہے بنا کچھ سنے اٹھ کر اضطراری انداز میں چل دی اور وہ اب سر تھامے بیٹھا تھا۔

☆☆☆

''میں کہہ چکا ہوں...... یہ ہرگز ممکن نہیں۔'' وہ دوٹوک انداز میں مگر تہذیب کے دائرے میں رہ کر بولا۔

والد محترم کے کمرے میں عدالت لگی تھی۔ ماں باپ، اسحٰق...... اور وہ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں گھسائے کٹہرے میں کھڑا تھا۔

''دیکھ لیا۔'' فیروزہ نے ازحد شاکی نظروں سے والد محترم کی جانب دیکھا جو متفکر سے بیٹھے تھے۔

''ساری پٹیاں اسی ڈائن نے پڑھا کے بھیجا ہے۔''

''ماں پلیز۔'' وہ بچی ہوا، دیا کے متعلق ان نازیبا الفاظ نے اس کے دل کو دکھ پہنچایا تھا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں بلکہ اسے تو معلوم تک نہیں کہ یہاں کیا صورت حال ہے۔''

''دیکھو داؤد! اس کے باپ نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ ''یہ تمہاری ماں کی زبان کا معاملہ ہے۔ شادی تو تمہیں بہر حال سیکا ہی سے کرنی پڑے گی۔ اور یوں بھی......'' وہ ذرا رک کے...... پھر آواز بدل کر بولے۔ اب ان کے لہجے سے کرختی ٹپکی تھی۔ ''کسی غیر ذات کی لڑکی کو تمہاری بیوی کے روپ میں ہم ہرگز پسند نہیں کر سکتے۔''

''خوب......'' وہ اپنے اشتعال پر قابو پا کر بولا، ''ماں کی زبان کی اہمیت ہے آپ کی نظر میں اور میں...... میری زبان، ایک مرد کی زبان کی کوئی ویلیو نہیں آپ کے نزدیک؟'' اس نے ابراہیم صاحب پر آنکھیں گاڑیں...... وہ کچھ بے چین سے ہو گئے۔

''ہم سے پوچھ کر اس خانہ خراب کو زبان دی تھی؟'' ماں تلملا کر بولیں۔

''آپ نے مجھ سے پوچھ کر خالہ کو زبان دی تھی؟'' وہ دو بدو بولا۔

جواب نہ بن پڑا۔ ماں نے کالی لال شیشوں سے مزین شال آنکھوں پر دھر کر رونا شروع کر دیا۔ وہی خالص ''ماؤں'' والا جذباتی وار۔

''لالہ...... ماں کو یوں رلانے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔'' اسحٰق کے خون نے جوش مارا۔

''میرا دل کچلنے کا حق انہیں کس نے دیا ہے؟'' وہ شاید واقعی ''پڑھ لکھ'' گیا تھا۔

''زبان کو لگام دو، اور کان کھول کر سن لو۔ اگر تم نے اپنی ماں کی زبان کا پاس نہ رکھا...... تو میں تمہیں جائیداد سے عاق کر دوں گا۔'' سخت لہجے میں دھمکی۔

داؤد بے چارگی سے ہنس پڑا۔

''اگر میں اپنی زبان سے مکر گیا تو جانتے ہیں میں نے اس لڑکی کو کیا کہا تھا؟'' اس کی آنکھیں سرخ تھیں...... چہرے پر فکر مندی۔

کسی نے جاننے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ مگر ان کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جاننا چاہتے ہیں۔

''اس سے کہا تھا کہ داؤد خان اپنی جان دے دے گا، مگر تم سے بے وفائی ہرگز نہیں کرے گا۔''

ماں نے دہل کر اسے دیکھا تھا۔

''اور بابا خان...... آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ ایک مرد اپنی زبان سے مکرا نہیں کرتا۔ اور ہماری تاریخ تو بھری پڑی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہم نے کب کب اور کیسے کیسے اپنی زبان کے لیے اپنی جان قربان کی ہے۔'' اس کے بعد وہ رکا نہیں۔ کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔

تینوں نفوس پر گہرا سناٹا طاری ہو چکا تھا۔

☆☆☆

دیا نے چپکے چپکے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔

''اوہ، وہ میرے خدا...... آخر داؤد کی آنکھ میں تل بنانے کی کیا ضرورت تھی؟''

وہ آدھی رات کو اپنے بستر پر اوندھی پڑی ہچکیاں لے رہی تھی۔

''کیا تھا اگر اس کی گہری، پیار لٹاتی، وارفتہ نگاہوں میں تل نہیں ہوتا تو کون سا اس کی قاتل آنکھوں کا حسن ادھورا رہ جانا تھا...... اس کی ساحر آنکھیں تو ویسے بھی بڑی خوب صورت بڑی شفاف تھیں تو ان میں تل بنا کر اسے داغدار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔'' اس کی اپنی ہی منطقیں تھیں۔ بچپن سے ناہموار، غیر یقینی حالات نے اسے سخت وہمی اور توہم پرست بنا دیا تھا۔

کالی بلی راستہ کاٹ لیتی تو خواہ اسے کتنا ہی لمبا چکر کاٹ کر کیوں نہ جانا پڑے وہ جاتی تھی۔ کالی بلی کی نحوست پر اسے پورا یقین تھا۔ بچپن میں خالہ نے ایک بار ذکر کیا تھا کہ اس کے والدین نے آخری بار گھر سے جاتے ہوئے کالی بلی کے راستہ کاٹنے کا ذرا سا بھی خیال نہیں کیا تھا حالانکہ خالہ نے خود بلی کو ان کا راستہ کاٹتے ہوئے اپنی گناہ گار آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ بات بچپن سے ذہن میں تھی سو تھی اس نے بھی بارہا یہ تجربہ کیا تھا۔ ایک بار جب وہ بلی کے اپنے سامنے سے گزرنے کے باوجود اپنے راستے پر چلتی چلی گئی تو آگے جا کر وہ لڑکھڑا کر گری ضرور تھی۔ پھر ایک بار اس کا پرچہ تھا اس روز بھی بلی نے راستہ کاٹا اور وہ پرچہ اچھا نہیں ہوا تھا۔

رات کو کوا منڈیر پر بیٹھ جاتا تو دوسری صبح یقیناً کوئی مہمان گھر میں آن ٹپکتا۔ (اور جب کوا نہیں بیٹھتا۔ مہمان تب بھی آ جاتے کہ خالہ کی دوسری گلی میں ہی ان کا بھرا پرا سسرال آباد تھا)

اور ان ''معنی خیز'' تلوں کا قصہ بھی زیادہ پرانا نہیں تھا۔

خالو کے پاس کوئی رسالہ تھا۔ اس میں قسمت کا حال، روحانی وظائف وغیرہ کے ساتھ ساتھ ایک خصوصی مضمون چھپا تھا تلوں سے متعلق، اس نے اسی مضمون میں کہیں پڑھ لیا تھا کہ جن کی آنکھ میں تل ہو۔ وہ شخص یقیناً بے وفا ہوگا اور اس پر ذرا بھی بھروسا نہ کرنا چاہیے۔ اور یہ بات اس نے لوح محفوظ پر لکھی ہوئی کوئی تحریر سمجھ کر گرہ سے باندھ لی...... اور یہ بات قطعاً نظر انداز کر گئی کہ اسی مضمون میں بھی لکھا تھا کہ جن کے سینے پر تل ہو وہ بہادر اور جن کے پاؤں پر تل ہو ان کے نصیب میں سفر کرنا لکھ دیا گیا ہے۔

خالہ کے رجو کے سینے پر تل تھا اور وہ شاید پہلا لڑکا تھا جو چھپکلی کو دیکھ کر باقاعدہ بے ہوش ہو جایا کرتا اور جس کمرے میں روشنی گل ہو اس کمرے میں اسے دنیا کی کوئی طاقت داخلے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ اور رہیں خالہ......

فی الحال تو ان کی پوری زندگی اس گھر اور محلے میں گزر گئی تھی اور مستقبل کی رب جانے......

''ہائے میں کیا کروں...... یہ کم بخت دل بڑا ہی دھوکے باز نکلا...... جتنا داؤد سے متنفر کرنے کی کوشش کروں، منحوس اتنا ہی اس کی جانب جھکا چلا جا رہا ہے۔ ہائے۔'' اس نے روتے روتے پوری رات گزار دی تھی۔

☆☆☆

بات نہیں بنی۔

دونوں طرف خاموشی گویا نہ جھکنے کا اعلان تھی داؤد آفس سے دو دن کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ بے حد تھکا تھکا اور رنجور سا واپس لوٹ آیا...... کیا تھا اگر اس کی ماں اس کی بات مان جاتیں......

''اور کیا تھا کہ اگر وہ اپنی ماں کے آگے ہتھیار ڈال دیتا۔'' دل نے چپکے سے کہا۔

''میرا مسئلہ انا نہیں...... محبت ہے...... اور ماں چاہتی ہیں کہ میں انا اور ضد کے چکر میں اپنی محبت قربان کر دوں۔ محبت جو کائنات کی سب سے حسین تخلیق ہے۔ محبت روشنی ہے۔ نغمگی ہے...... شگفتگی ہے۔ چاندنی ہے۔

اور انا......

اس کو بنیاد بنا کر رشتے قائم نہیں کیے جاتے۔ ہاں ٹوٹ ضرور جاتے ہیں۔ مگر یہ بات داؤد کے گھر والوں کو سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔

☆☆☆

"تم میرے ساتھ لنچ بریک میں باہر چل سکتے ہو؟" دیا نے آفس میں اس سے پوچھا۔ اب وہ دونوں ساتھ لنچ کررہے تھے۔ داؤد خلاف معمول بالکل چپ چاپ بیٹھا تھا۔ دیا نے غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ مضمحل ہورہا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے۔ بڑھی ہوئی شیو، پریشان سے بال۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" اس نے ہول کر پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں اپنی سناؤ۔" وہ خلاؤں میں تک رہا تھا۔

"اچانک یوں...... کہاں چلے گئے تھے۔" اس نے رک رک کر پوچھا۔

"اچانک نہیں گیا تھا۔ بابا جان نے بلایا تھا...... اس روز تم سے یہی بات کرنا چاہ رہا تھا کہ تمہیں میری آنکھ کا تل اور بے وفائی نظر آ گئی۔" وہ چڑ گیا۔

وہ تھوڑی خفیف سی ہوگئی۔ پھر خود کو پراعتماد کرتی ہوئی بولی۔

"دیکھو داؤد! تمہارے نزدیک یہ بات غیر اہم ہوسکتی ہے مگر مجھے ان باتوں پر کافی اعتماد ہے۔ اور میں تم سے یہی کہنا چاہتی ہوں کہ اگر تم بے وفا نہیں ہو تو مجھے ثبوت دو۔" داؤد جو ان کی بات غور سے سن رہا تھا یک دم بولا۔

"تم مجھ سے شادی کرلو۔"

"کیا؟" دیا بھونچکی رہ گئی۔

"مگر ایسے کیسے؟" وہ بولی۔ "میں نے تو تم سے اس وقت تمہاری چاہت کا ثبوت مانگا ہے دیکھنا چاہتی ہوں تم کتنے باوفا ہو؟" وہ استہزائیہ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

"دیا...... وفاؤں پر یقین نہیں دلایا جاتا۔ خود یقین آجاتا ہے۔ فی الحال میں تمہیں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری خاطر میں اپنے سارے رشتے پیچھے چھوڑ آیا ہوں اور تمہیں اب بھی میری وفاداری کا ثبوت چاہیے تو تف ہے داؤد خان کی محبت پر۔" وہ کہہ کر اٹھا اور بنا اس کی طرف دیکھے ریسٹورنٹ سے نکلتا چلا گیا۔ پہلی بار دیا صحیح معنوں میں اس کے انداز پر ہراساں ہوئی تھی۔

☆☆☆

"حالانکہ نہ تم مجھے کینڈل لائٹ ڈنر پر لے کر گئے۔ نہ انگوٹھی دے کر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر "ول یو میری می" کہا۔ مگر میں نے پھر بھی تم سے شادی کرلی۔"

شادی کی رات سیج پر بیٹھے ہوئے اس نے داؤد سے کہنا ضروری سمجھا۔

جب کہ یہ وہ لمحہ تھا کہ داؤد کے گھر والوں نے اس کی شادی میں نہ شریک ہونا تھا، نہ دیا کو قبول کرنا تھا سو ایسی صورت میں بے وجہ کا انتظار حماقت تھی۔

وہ برسر روزگار تھا۔ شہر میں اپنا فلیٹ بھی تھا اور وہ ذمے داری اٹھانے کے لائق بھی، تو وہ کس بات کا انتظار کرتا...... دیا کے والدین ہوتے تو شاید۔ "گھر والوں کو لاؤ...... یا اکیلے بارات کیوں لائے ہو۔" جیسے مسائل یا سوالات کھڑے کرتے۔ مگر دیا کی خالہ اپنی چار بیٹیوں اور پانچ بیٹوں کے سلسلے میں اتنی بوکھلائی رہتی تھیں کہ ان کا دھیان ان باتوں کی جانب گیا ہی نہیں۔

اتنا ضرور ہوا کہ خاندان برادری کے سامنے انہوں نے عزت سے دیا کو رخصت کردیا تھا۔ اور ان کا یہی کردینا بہت تھا۔

"ہاں......" داؤد نے تاسف سے کہا۔ "مجھے احساس ہے...... مگر تم فکر مت کرو میں بہت جلد تمہارا یہ گلہ مٹادوں گا۔" وہ اس کے گندمی ہاتھ جو مہندی کے رنگ سے سرخ ہورہے تھے تھام کر بڑی محبت سے بولا۔

"بہت خوب صورت لگ رہی ہو تم۔" وہ پر شوق نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اتنی عام سی تعریف؟ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ۔"

"شش...... خاموش۔" داؤد نے اس کے

احمریں لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ’’ہمیشہ تمہاری سنتا آیا ہوں...... آج تمہیں صرف میری سنی پڑے گی۔‘‘ اس نے بڑے استحقاق سے کہا اور مسکرا دیا۔

دیا اب بالکل خاموش ہو چکی تھی۔

☆☆☆

دنیا میں اگر کہیں جنت تھی تو یہ جنت دیا کو مل چکی تھی...... اس کا ہر دن عید کا اور ہر رات شب برات تھی۔ اس کے دل میں اب بھی واہمے ڈنک مارتے، جب بھی وہ داؤد کو ملول واداس دیکھتی۔

’’تمہیں اپنے گھر والے یاد آتے ہیں نا...... میری وجہ سے ان لوگوں نے تمہیں چھوڑ دیا۔‘‘ وہ اس کے شانے پر سر ٹکا کر رنجیدگی سے بولی۔

’’ایسی کوئی بات نہیں۔‘‘ وہ اس کے نرم بالوں میں محبت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔

’’تم ہو نا...... میرے لیے تمہاری محبت کافی ہے۔‘‘ وہ غم سے مسکرا کر بولا۔

’’نہیں داؤد!‘‘ اس نے اپنا سر داؤد کے کندھے سے ہٹا لیا۔ ’’دنیا میں کسی محبت کو بھی ’’ماں‘‘ کی محبت کا نعم البدل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیوں نہ ایسا کریں۔ ہم دونوں چلتے ہیں تمہارے گھر...... اور ان سے معافی مانگ لیتے ہیں۔ آخر کو تمہاری ماں ہیں...... وہ ضرور تمہیں معاف کر دیں گی۔‘‘ وہ پرجوش ہو کر بولی۔

’’چلیں گے، وہاں بھی چلے چلیں گے مگر ابھی نہیں...... فی الحال تو ہم لوگ ناردن ایریاز جا رہے ہیں۔ اپنا ہنی مون منانے۔‘‘

’’سچ......‘‘ خوشی سے دیا کا چہرہ کھل اٹھا۔

’’جی جناب......‘‘

☆☆☆

وہ دونوں اس وقت وادی سوات کے سب سے شاندار ہوٹل کے ڈنر ہال میں بیٹھے تھے۔ باہر برف پڑ رہی تھی جبکہ اندر کا ماحول خاصا معتدل تھا...... نہ گرم نہ سرد۔ دیا کا چہرہ کاہی رنگ کے بیش قیمت فراک پاجامے میں دمک رہا تھا۔ وہ پوری طرح اس خواب ناک ماحول میں کھوئی ہوئی تھی اور داؤد اس میں...... بیک گراؤنڈ میں بجتا دھیمے سروں والا میوزک، مدھم روشنیاں...... بے فکر چہرے اونچے قہقہے...... سرسراتی خوشبوئیں۔

تب ہی ویٹر نے ان کی میز پر بلیک فاریسٹ چیریوں سے سجا کر کیک لا کر رکھا۔ دیا نے متحیر ہو کر داؤد سے سوال کیا۔

’’کیک...... مگر کس کی سالگرہ ہے؟‘‘ داؤد معنی خیزی سے ہنس دیا۔

’’تمہیں یاد نہیں......‘‘ کچھ دیر بعد وہ بولا۔ ’’آج ہی کی تاریخ کو ہم پہلی بار ملے تھے۔ اور تم ہی نے کہا تھا کہ ہم ہر سال آج کی تاریخ کو ہل اسٹیشن آ کر سیلی بریٹ کیا کریں گے۔‘‘ وہ نازک سی کینڈل روشن کرتا ہوا بولا۔

’’اوہ مائے گاڈ......‘‘ دیا دونوں ہاتھ گال پر رکھ کر خوشی کے انتہائی مقام پر پہنچ گئی۔

’’تمہیں یاد تھا۔‘‘

’’یاد نہ ہوتا تو یہ سب کیوں کرتا۔‘‘ وہ جیسے برا مان کر بولا۔ ’’بلکہ غالباً تم بھول چکی تھیں۔‘‘

’’ہاں۔‘‘ وہ جھینپی۔ ’’دراصل آج کل تو میرے لیے ہر دن ہی کچھ نہ کچھ خاص اپنے دامن میں لیے طلوع ہو رہا ہے۔ شاید خوشی و حیرت کی بہتات نے مجھے یہ بات بھلا دی۔‘‘ وہ کندھے اچکا کر بولی۔

’’چلو خیر......‘‘ اس نے ربن لگی چھری اٹھاتے ہوئے کہا۔ ’’اب میرے ساتھ مل کر ذرا یہ۔ کیک تو کاٹو۔‘‘ دیا نے اپنا مرتعش ہاتھ آگے بڑھایا۔

دونوں نے مل کر کیک کاٹا...... داؤد نے سیدھے ہاتھ سے ڈیجیٹل کیمرہ تھام رکھا تھا۔ داؤد کے ڈیجیٹل کیمرہ نے اس یادگار اور خوب صورت پل کو اپنی آنکھوں میں قید کر لیا تھا...... ایک شاندار ڈنر کے بعد جب وہ اٹھنے لگی تو داؤد بے ساختہ بولا۔

’’ذرا ایک منٹ یونہی کھڑی رہو۔‘‘ وہ اپنے نیوی بلیو کوٹ کی جیب سے کچھ برآمد کرتا ہوا بولا۔

’’اب کیا ہوا۔‘‘ وہ مسکراہٹ لبوں کے گوشوں

میں دبا کر پوچھنے لگی۔

معاً وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا اور انگوٹھی اس کی جانب بڑھاتا ہوا بولا۔

''ول یو میری می...... کہنے کا وقت تو گزر گیا مادام، مگر کیا آپ اس خوب صورت انگوٹھی کو اپنے خوب صورت ترین ہاتھ کی زینت بنانا پسند کریں گی؟''

ہال میں موجود لوگوں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ پھر بے ساختہ ہی کسی نے تالی بجا کر گویا اس کے جذبے کی داد دی...... اس کے بعد پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ دیا کا چہرہ شرم سے گلگلوں اور خوشی سے گلنار ہو گیا۔ اس نے اپنا سیدھا ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا۔

''میری محبت برستی ہوئی بارش جیسی ہے...... جو اگر زیادہ برس جائے تو تباہی کا اندیشہ لازم ہے۔ مگر تمہاری محبت میرے لیے آکسیجن کی حیثیت رکھتی ہے داؤد...... جس کی غیر موجودگی مجھے میری زندگی سے جدا کر دے گی۔'' وہ اپنے کمرے سے ملحقہ ٹیرس پر کھڑی اس کے سینے پر سر ٹکائے کہہ رہی تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی......'' وہ مصنوعی ناراضی سے بولا۔ ''تم مجھے لفظوں سے بہلا لیتی ہو ہمیشہ...... مگر اس بار تمہیں میرے لیے بھی کچھ کرنا ہی ہوگا۔''

دیا نے اس کے سینے سے سر اٹھا کر اسے خفگی سے دیکھا۔

''میں تمہیں لفظوں سے بہلاتی نہیں ہوں۔ میرے نزدیک خوب صورت الفاظ اظہار کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ اور ویسے ذرا میں بھی تو سنوں تم کیا چاہتے ہو۔ کیا کروں میں تمہارے لیے۔'' اس کا ہاتھ کمر پر ٹکا ہوا تھا اور وہ کڑے تیوروں سے اسے گھور رہی تھی۔ مگر لبوں پر چھب دکھلاتی مسکان بتاتی تھی کہ وہ اس سے دل لگی کر رہی ہے۔

''حق ہا......''

دستک یہ میرے ہاتھ کے کھل جاؤ کسی دن......
کیا روز گرجتے ہو برس جاؤ کسی دن۔''

وہ ریلنگ سے کمر ٹکا کر ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

نیچے وادی میں بنے گھروں کی جلی روشنیاں...... دور کسی جھرنے سے آتی جھنکار...... ماحول پر چھایا رومانی سناٹا...... سفید آسمان گویا برف کی چادر آسمان نے بھی اوڑھ رکھی ہو۔ اور اس پر شعر کی ٹانگ توڑتا داؤد...... دیا جی بھر کے بے مزہ ہوئی۔

''کیا فائدہ تمہارا شاعری کی کتابیں پڑھنے کا...... ایک شعر بھی ڈھنگ سے نہیں پڑھ سکتے نہ شاعرانہ باتیں ہی کر سکتے ہو۔'' وہ ناراضی سے بولی۔

''میں قول سے زیادہ عمل پر یقین رکھتا ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''ہونہہ......'' اس نے نخوت سے گردن جھٹکی، پھر یکلخت وہ مایوسی سے بولی۔

''میری کتنی خواہش تھی...... کہ تم شاعرانہ زبان میں مجھ سے اظہار عشق کرتے۔''

''ارے...... رے۔'' وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہوا پھر عاجز لہجے میں بولا۔

''تم ایک ہی بار اپنی خواہشات کی لسٹ میرے گوش گزار کیوں نہیں کر دیتیں، ہر بار ایک نیا درد تمہارے سینے سے نکل کر آتا ہے۔ خدا کی پناہ...... میری عمر تو تمہاری خواہشات کی تکمیل کرتے ہی گزر جائے گی۔''

''کیا تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے؟'' اس نے غصے سے پوچھا۔

''نہیں...... یہ شاعری وائری کی زبان پڑھنے کی حد تک تو ٹھیک ہے، ویسے میرے بجھ میں نہیں آتی......'' وہ بے بسی سے بولا۔

''اچھا تو ٹھیک ہے۔'' وہ مڑ کر جانے لگی......

داؤد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اس کی کالی آنکھوں میں ہیں، انتر منتر سب
چاقو واقو، چھریاں وریاں، خنجر ونجر سب
جس دن سے تم روٹھے مجھ سے یہ روٹھے روٹھے ہیں

چادر وادر، تکیہ وکیہ، بستر وستر سب
مجھ سے بچھڑ کر وہ بھی یاروں بکھرا بکھرا رہتا ہے
پھیکے پڑ گئے کپڑے وپڑے، زیور ویور سب

"ہاتھ چھوڑو میرا...... اور چلو اندر...... برف باری شروع ہو رہی ہے۔" دیا اپنی مسکراہٹ دبا کر بولی۔

"کیا ہوا، پسند نہیں آئی غزل۔" اس کا منہ اتر گیا۔ ہاتھ بھی چھوڑ دیا۔ وہ رکی اس کی جانب مڑی......اور شرارت سے بولی۔

"آخر ہو نا خان......محبت کے درمیان میں بھی چاقو واقو، خنجر ونجر گھسیٹ لائے۔ مگر پھر بھی......اچھی تھی...... گو کہ میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس میں اظہار محبت کہاں تھا مگر پھر بھی...... بہتر کوشش۔" وہ کہہ کر جھپاک سے کمرے میں......داؤد اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

"اچھا......اب سمجھا، شرارت کر کے گئی ہے مجھ سے۔" چند ثانیے بعد جیسے وہ معاملہ سمجھ کر اس کے پیچھے گیا تھا۔

☆☆☆

ہزاروں خوب صورت یادیں لیے وہ لوٹ آئے۔ معمول کی زندگی شروع ہو گئی۔ داؤد کے لیے دیا کی دیوانگی روز بروز بڑھتی ہی گئی۔

وہ اس کا ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتی۔ اس کے جوتے پالش کرتی۔ کپڑے دھوتی...... پریس کرتی...... بال سنوارتی، ٹائی کی ناٹ باندھتی، کوٹ پہناتی۔ اور تو اور......کبھی کبھی اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا بھی کھلاتی۔

داؤد مصنوعی آہیں بھرتا۔

"حق ہا...... کس ڈکٹیٹر بیوی سے پالا پڑ گیا ہے۔"

"اچھا تو میں ڈکٹیٹر ہوں...... ذرا میں بھی تو سنوں کہ کون سا ڈکٹیٹر اپنی رعایا کا اتنا خیال رکھتا ہے؟" وہ خفا ہو جاتی۔

"بس میں یہی تمہارے منہ سے تسلیم کروانا چاہ رہا تھا۔" داؤد خوشی سے چلایا۔ "کہ تم مجھے اپنی رعایا سمجھتی ہو۔ حالانکہ میں تمہارا حاکم ہوں۔" تب وہ شرارت سے اس کی ناک دبا کر بال بگاڑتی۔

"بے شک تم حاکم ہو...... میرے دل پر تمہارا ہی حکم چلتا ہے۔ میرے جسم و جاں پر تم ہی حکمرانی کرتے ہو۔"

تب داؤد مصنوعی افسوس کرتا۔

"کاش میں بھی تمہاری طرح خوب صورت باتیں کر سکتا۔ تب تم سے بھی زیادہ دلکش الفاظ میں تمہاری تعریف کرتا......"

"بس رہنے دو...... کر لی تم نے میری تعریف۔" وہ بگڑ کر کہتی۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں ہنس پڑتے۔

☆☆☆

دیا ماں بننے والی تھی......داؤد کو پتا چلا تو وہ خوشی سے دیوانہ ہی ہو گیا......پھر اس کے بعد اس نے دیا کا اس طرح خیال رکھا جیسے وہ کانچ کی بنی مورت ہو...... اور ذرا سی ٹھیس لگ جانے پر اس کے چٹخ جانے کا اندیشہ ہو۔ اس نے ایک کل وقتی ملازمہ اس کے لیے رکھ دی تھی۔ کبھی کبھی دیا چڑ جاتی۔

"بس کرو داؤد...... میرے ساتھ اس طرح کا سلوک کیوں کر رہے ہو جیسے میں آسمان سے اتری ہوئی کوئی شے ہوں۔"

"ایک زندگی کو اپنے لہو سے سینچ رہی ہو۔ یہ کوئی معمولی بات ہے کیا؟" وہ دودھ کا گلاس اسے زبردستی پلانا چاہ رہا تھا۔

"مجھے نہیں پینا......" اس کا موڈ خراب تھا کوئی وجہ نہیں تھی بس یونہی۔

"پی لو میری جان ...... تمہارے لیے اچھا ہے۔"

"میرے لیے یا تمہارے بچے کے لیے۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"ایک ہی بات ہے۔" وہ اسے پچکارنے لگا۔

"میرے دل کو خدشے ستاتے ہیں داؤد۔" وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

"ارے بھئی کیا ہوا؟" وہ گلاس رکھ کر اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

"تم بدل تو نہیں جاؤ گے نا داؤد۔" اس نے منہ سے ہاتھ ہٹا کر اسے آس سے دیکھا۔

"کبھی نہیں...... تم سارے واہمے دل سے نکال کر پرسکون رہنے کی کوشش کرو۔" اس نے پیار سے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"پتا نہیں کیوں داؤد...... مجھے لگتا ہے۔ جیسے میں تم سے بچھڑ جاؤں گی۔" وہ خوف سے لرزاں آواز میں بولی۔

"بے وقوف ہو تم...... میں تمہیں چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا......

"میری جان ہو تم...... تمہارے بنا میں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میرا وجود تم سے مکمل ہوا ہے۔ میری روح کو تمہاری محبت نے آسودگی بخشی ہے۔ لو دیکھ لو میں بھی تمہارے ساتھ رہ رہ کر شاعرانہ باتیں سیکھ گیا۔ اب تو خوش۔" اور دیا پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

☆☆☆

دیا نے ایک ننھی پری کو جنم دیا تھا۔ داؤد نے خوشی خوشی اپنی ماں کو دادی بن جانے کی خبر دی۔

"جب ہم نے اسے بہو ہی نہیں مانا، تو پوتی کا کیا سوال۔" یہ انکا جواب تھا۔ حالانکہ وہ سیکا کو بہو بنا چکی تھیں۔ مگر ضد...... اور یہ بات داؤد کو صحیح معنوں میں بری لگی تھی اور اس نے ان سے زندگی میں دوبارہ کبھی رابطہ نہ قائم کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

دیا نے اس کے گھر والوں کی آمد سے متعلق پوچھا تو وہ صاف ٹال گیا تھا...... ان دونوں کی خوشیوں اور امیدوں کا محور اب ان کی ننھی پری بن چکی تھی۔

دیا نے اس کا نام روشنی تجویز کیا۔ داؤد کو یہ نام بے حد پسند آیا۔ وہ اکثر اسے پیار سے "دیا کی روشنی" کہنے لگا۔

دیا اسے پا کر بے حد مسرور مطمئن اور آسودہ دکھائی دیتی۔ اسے سجاتی، سنوارتی بڑے پیار سے رکھتی۔ اکثر جذباتی ہو کر داؤد سے کہا کرتی کہ۔

"میرا بچپن بہت محروم گزرا ہے۔ میں چاہتی ہوں روشنی کو ہمارے پیار و محبت کے ساتھ ساتھ بہترین پرورش بھی ملے اور وہ تمام آسائشات بھی جن سے میرا بچپن نا آشنا رہا۔" تب داؤد نم آنکھوں میں محبت کا جہاں آباد کیے اسے دیکھتا۔

"تم فکر کیوں کرتی ہو...... ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔"

مگر جیسا سوچا جائے۔ ویسا ہوتا کب ہے۔ تقدیر کا لکھا انسان کی کرنی پر غالب آ کر رہتا ہے۔

☆☆☆

روشنی کی پہلی سالگرہ ان لوگوں نے بڑے پیمانے پر ہوٹل میں منعقد کی تھی۔

دیا بائل گرین اور میرون ساڑھی باندھے تیاری کے آخری مراحل سے گزر رہی تھی۔ ممتا کا الوہی نور اس کے چہرے سے ہویدا تھا تو داؤد کی محبت نے اس کے وجود کو چاندنی میں نہلا دیا تھا۔ ایسے میں اگر وہ حسین تر نہ لگتی تو کیا لگتی۔

اس کا سجا سنورا روپ داؤد یوں تو پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا مگر آج نجانے کیا بات تھی کہ اس پر سے نظریں ہٹانا اسے دنیا کا دشوار ترین کام لگ رہا تھا۔ اور وہ مبہوت ہو کر بنا پلکیں جھپکائے۔ شیشے میں منعکس ہوتے اس کے وجود پر نگاہیں جمائے اس کی پشت پر کھڑا تھا۔ روشنی بیڈ پر بیٹھی اپنے کھلونوں میں مگن تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ شرگیں لہجے میں بولی۔

"بخدا...... ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔" اس نے اپنے بازو اس کے گرد پھیلائے۔

"کوئی شرارت نہیں چلے گی؟" اس نے داؤد کو تنبیہا گھورا۔ "ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

''چھوڑو یار...... ہم گھر پہ ہی سیلی بریٹ کر لیتے ہیں۔'' وہ اسے چڑانے کو مسکرا کر بولا۔

''داؤد......'' وہ کسمسا کر اس کی بانہوں کے حلقے سے باہر آتی اور روشنی کو گود میں اٹھا کر بولی۔

''چلو جلدی...... یہ نہ ہو کہ میزبان کو وہاں مہمان ریسیو کریں۔''

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''چلو''

''اوفو......'' اس نے نکلنے سے قبل ایک طائرانہ نگاہ پھیلے ہوئے گھر پر ڈالی۔ ''گھر کتنا ابتر ہو رہا ہے۔ آج ناجو بھی کام پر نہیں آئی...... اب آ کر مجھے ہی صاف کرنا پڑے گا۔''

''بے کار کی ٹینشن مت لو۔ وہ صبح آ کر صاف کر دے گی سب کچھ۔''

''اب چلو۔'' وہ گھر لاک کرنے کا منتظر تھا...... اور وہ پتا نہیں کیسی نظروں سے گھر کے در و دیوار تک رہی تھی۔

''چلو دیا......'' اس نے ہانک لگائی۔ تو وہ چونکی۔

''ہاں چلو۔'' اس نے گھر سے قدم باہر نکالے۔ دوبارہ کبھی واپس نہ رکھنے کے لیے۔

☆☆☆

پارٹی بہت اچھی رہی تھی۔ مگر پتا نہیں کیوں دیا اسے بجھی بجھی سی لگ رہی تھی۔ وہ گھر واپسی کے سفر میں تھے جب داؤد نے اس کے اترے منہ کی وجہ پوچھی۔ وہ سوئی ہوئی روشنی کو سینے سے چمٹائے ہوئی تھی۔

''میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے داؤد۔'' وہ یک دم رو پڑی۔

''ارے ارے......'' داؤد گھبرا گیا۔ ''تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ چلو! ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔'' اس نے گاڑی ہسپتال کی طرف موڑلی۔

اسپتال پہنچتے پہنچتے وہ درد سے تڑپنے لگی۔ ایمر جنسی میں ڈاکٹر نے دیکھا...... ابتدائی طبی امداد دی...... کچھ ٹیسٹ کروائے۔ داؤد یہاں سے وہاں بھاگا پھر رہا تھا۔

''داؤد...... روشنی کا بہت خیال رکھنا۔'' وہ روتے ہوئے اسے کہنے لگی۔

اس نے داؤد کا ہاتھ کسی انجانے خوف سے تھام رکھا تھا۔

''ہاں...... ہاں...... ہم دونوں رکھیں گے اس کا خیال...... تم فکر کیوں کرتی ہو۔''

''داؤد ...... میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں...... تم بہت اچھے ہو...... میں......''

تب ہی ڈاکٹر اندر چلی آئی اور اسے باہر نکال دیا۔

کچھ باتیں ہمیشہ ادھوری رہ جاتی ہیں زندگی کی طرح...... وہ نجانے کیا کہنا چاہ رہی تھی...... داؤد کو اس کی رپورٹس لانی تھیں...... وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ رپورٹس لے کر لوٹا۔

مگر دیا بجھ چکا تھا۔

☆☆☆

کتنے دن وہ ہوش و خرد سے بیگانہ رہا۔ زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کرنے والی۔ اپنا وعدہ توڑ کر اس سے دور جا چکی تھی۔ داؤد کی بے وفائی کا خوف اسے کھائے جاتا تھا کون جانتا تھا کہ وہ خود ہی بے وفا نکلے گی۔ وہ جاتے جاتے اس کے لبوں سے ہنسی اور آنکھوں سے نیند تو دل سے قرار چرا لے گئی تھی۔ اب نہ اسے زندگی سے دلچسپی باقی رہی تھی نہ زندگی سے وابستہ کسی شے سے۔

روشنی کو اتنے روز اس کی ماں فیروزہ سنبھالتی رہی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کے دکھ پر افسردہ تھیں۔ چاہتی تھیں کہ وہ زندگی کی جانب دوبارہ لوٹ آئے مگر وہ گویا پتھر ہو چکا تھا۔ نہ سنتا تھا، نہ سمجھتا تھا۔ بس ٹھس...... ان کے برداشت کی حد جواب دے گئی۔ اور وہ چیخ پڑیں۔

''بس...... وہ اس کے نزدیک بیٹھی ہوئی بولیں۔ بہت منالیا تم نے جانے والی کا غم میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ روشنی کو میں پال لوں گی۔ تمہارا گھر بسا۔

ضروری ہے۔"
"داؤد...... روشنی کا بہت خیال رکھنا۔" اس کے اندر سے کوئی بولا تھا۔
"لڑکی اب کی بار میں دیکھوں گی...... بلکہ سبیکا سے چھوٹی......" ماں نجانے کیا کہہ رہی تھیں۔
"داؤد...... روشنی کا بہت خیال رکھنا۔" دیا کی وصیت......
"داؤد...... روشنی کا......"
پتھر میں جان پڑ گئی تھی۔
"رات کیوں ہوتی ہے۔ جب کہ وہ میرے ساتھ نہیں ہوتی......
اس کی خوشبو...... اس کا لہجہ...... اس کی رفاقت...... اس کی کانوں میں رس گھولتی آواز......
دل یہ ماننے سے منکر ہے کہ یہ اب اسے نہ سن سکتا ہے۔ نہ دیکھ سکتا...... نہ چھو سکتا ہے۔
اس کے رنگین آنچل یونہی الماریوں میں بند پڑے ہیں۔ مگر وہ انہیں اب کبھی نہیں پہنے گی۔ اس کی ریشمی چوڑیاں یہیں رکھی ہیں مگر وہ نرم گداز بانہیں مٹی کا رزق بن چکی ہیں جن میں کبھی یہ سجا کرتی تھیں......
آخری بار...... اپنے بال سنوارتے ہوئے وہ اپنے چند بال کنگھی میں ٹوٹے چھوڑ گئی ہے۔ میں نے وہ ٹوٹے بال کسی متاع کی طرح اپنے دل سے لگا رکھے ہیں۔ اور انہیں سینے سے لگا کر یہ سوچ رہا ہوں کہ......
"رات کیوں ہوتی ہے آخر...... جب وہ میرے ساتھ نہیں ہوتی۔"

☆☆☆

"تو اب تم نے کیا سوچا ہے؟ اس طرح تو تمہاری نوکری خطرے میں پڑ جائے گی۔ اور نوکری کی تو خیر جانے دو...... ڈیڑھ سال کی بچی کو تم کیسے پال سکتے ہو...... یہ ناممکن ہے۔" یہ رضا تھا...... اس کا اچھا دوست...... جو اس وقت اسے حال سے بے حال دیکھ کر سخت پریشانی میں گھر گیا تھا۔
"یہ سب میں نہیں جانتا۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ روشنی کو وہ میرے سپرد کر کے گئی ہے اور اس کی ذمے داری مجھے ہی اٹھانی ہوگی میں اپنے علاوہ اس کے معاملے میں کسی پر بھروسا نہیں کر سکتا۔"
"میرے بھائی۔" اس نے تاسف و ہمدردی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "میں تمہارے جذبات سمجھ سکتا ہوں...... مگر عقل کی ایک بات سمجھاتا ہوں کہ ذمے داری بہ احسن طریقے پوری کرنے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تم کما ہی نہیں سکو گے تو پیسے کہاں سے آئیں گے۔ بچی کی اچھی پرورش کے لیے تمہارا معاشی طور پر مضبوط ہونا ضروری ہے۔" رضا کی بات سچ تھی۔
وہ پہلی بار صحیح معنوں میں فکر مند ہو گیا۔ اب تک تو گزر بسر سیونگ سے ہو رہی تھی مگر کب تک۔
"تو تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔" اس نے بے چارگی سے اپنا سر تھام لیا۔
"روشنی کو تمہاری والدہ نہیں رکھ سکتیں؟"
"وہ خود بیمار رہتی ہیں۔" اس نے کہا۔ "پھر بھی اگر وہ روشنی کو رکھ لیتی ہیں تب بھی وہ مجھے پریشان کرتی رہیں گی کہ دوسری شادی کر لو۔" وہ جھلا کر بولا۔
"ہوں......" رضا نے پرسوچ ہنکارا بھرا۔ بات تو ان کی بھی درست ہی ہے۔"
"رضا...... تم بھی......" داؤد نے شکایتی نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "کیا تم جانتے نہیں کہ دیا کی جگہ میں کسی کو نہیں دے سکتا۔"
"کوئی کسی کی جگہ نہیں لے سکتا۔ ہر انسان کا اپنا مقام ہوتا ہے۔"
"رضا پلیز یار...... میں ویسے ہی پریشان ہوں...... تم لوگ مجھے اور عاجز مت کرو۔" اس نے درشتی سے کہا۔
"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" رضا صلح جو انداز میں بولا۔ "دیکھتے ہیں کچھ کیا ہو سکتا ہے۔"

"کچھ مت دیکھو...... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو تم لوگ۔"

اس نے ہاتھ جوڑے تھے۔

☆☆☆

اور اس سے اگلی رات روشنی کی طبیعت اس بری طرح بگڑی کہ وہ بوکھلا کر رہ گیا۔ الٹی...... موشنز نے منٹوں میں صحت مند بچی کو کملا کر رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں اوپر چڑھ گئیں۔ وہ گھبرا کر اسے اسپتال لے کر بھاگا۔ وہاں ڈاکٹر نے ٹریٹمنٹ کے ساتھ ساتھ اسے سخت سنائیں۔ پتا نہیں اس سے کیا بد احتیاطی ہوئی تھی کہ بچی کا یہ حال ہو گیا تھا۔ پوری رات وہ بینچ پر بیٹھا رہا۔ اور صبح ہی صبح اس نے رضا کو فون کیا تھا۔

"رضا پلیز...... میری مدد کرو۔"

☆☆☆

"یہ میری دور کی پھپھو ہیں۔ عالیہ بی...... حیدر آباد میں ان کا گھر تھا۔ میرا مطلب ہے کہ ان کا سسرال...... شوہر کے انتقال کے بعد سسرال والوں نے جائیداد میں ان کی بیٹی کا حصہ دینے سے انکار کر کے انہیں گھر سے نکال دیا۔ بیٹی تو فی الحال وہیں ہوسٹل میں رہ کر اپنی پڑھائی مکمل کر رہی ہے۔ یہ بیچاری یہاں تیرے میرے گھر میں پڑی ہوئی تھیں۔ میکہ ان کا ختم ہو چکا ہے۔ سو بے آسرا ہیں۔ نہایت نیک خصلت اور شریف خاتون ہیں۔ تم دیکھ ہی چکے ہو کام کاج بھی بڑی پھرتی سے کر لیتی ہیں۔"

رضا نے بتایا...... عالیہ بی نے بڑے شوق اور محبت سے روشنی کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ وہ کمرے میں تھیں۔ داؤد لاؤنج میں بیٹھا ان ہی کو دیکھ رہا تھا۔

"مگر کیا یہ روشنی کو اچھی طرح سنبھال سکیں گی؟" وہ فکر مندی سے پوچھنے لگا۔

"کمال کرتے ہو......" رضا نے ہنس کر کہا۔

"وہ عورت ہیں...... تجربہ کار...... تمہاری سوچ سے بھی زیادہ اچھی طرح روشنی کا خیال کریں گی...... تمہارے مسئلے کا حل مجھے تو ایک گورنس کی صورت ہی میں لکھا دکھائی دے رہا تھا۔ مگر میں تذبذب میں تھا کہ کسی غیر انجان عورت کو ایسی صورت حال میں گھر میں لا بٹھانا میرے خیال میں کچھ مناسب نہیں تھا۔ پھر اچانک ہی مجھے ان کا خیال آیا۔ تم سے بات کرنے سے پہلے میں نے ان سے بات کی۔ یہ بہت اچھی اور نیک دل خاتون ہیں ساری صورت حال سن کر ایک لمحہ ضائع کیے بنا انہوں نے تمہاری مدد کی ہامی بھر لی۔ تم سے بھی ایک درخواست ہے۔" وہ ہچکچا کر چپ ہو گیا۔

"ہاں...... کہو......" داؤد نے استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"یار...... انہیں نوکروں کی طرح ٹریٹ مت کرنا۔ عزت دار عورت ہیں۔"

"کیا تم داؤد خان کو اتنا کم ظرف سمجھتے ہو؟" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"میرا سر ہمیشہ ان کی تعظیم میں جھکا رہے گا۔ میں جان دے دوں گا مگر ان کی عزت پر حرف نہیں آنے دوں گا۔"

وہ کافی دن بعد پرسکون ہوا تھا، سو پورے دل سے اس نے یہ بات کہی تھی۔

"شاباش ہے۔" رضا خوش ہو کر بولا۔ "مجھے تم سے یہی امید تھی۔"

☆☆☆

"زندگی اپنے معمول پر آ گئی ہے...... مگر میں اب بھی رات بھر تمہاری خوشبو سے محو گفتگو رہتا ہوں۔ مجھے کوٹ پہنتے وقت...... ٹائی کی ناٹ لگاتے وقت، بالوں میں برش پھیرتے وقت...... اور گھر سے بنا تمہارا دیدار کیے نکلتے وقت تم مجھے بہت یاد آتی ہو......

مگر اب میں روشنی کے لیے خوش ہوں۔ وہ صاف ستھری رہتی ہے۔ آئے دن جو اسے بیماریاں گھیرے رہتی تھیں اسے ان سے بھی نجات مل چکی ہے...... وہ صحت مند رہنے لگی اور خوش بھی...... اس کے لیے میں عالیہ بی کا شکر گزار ہوں۔" اس نے لکھ کر ڈائری بند کر کے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں شاید زندگی میں ٹھہراؤ آتا جا رہا تھا۔ عارضی

ٹھہراؤ......

☆☆☆

امید سکندر نام تھا...... خوب صورت تھی......

ذہین تھی......

پڑھائی ختم...... وہ لوٹ آئی اپنی ماں کے پاس جو کسی اور کی اولاد کو سینے سے لگا کر پال رہی تھیں۔ اسے ان کا یہ اقدام کچھ خاص پسند نہیں آیا۔

"میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکتی ہوں...... جیسے ہی مجھے نوکری ملے گی...... آپ یہ آیا گیری فوراً چھوڑ دیں گی۔" وہ ناپسندیدگی سے بولی۔

"شش...... شش......" ماں نے گھورا، ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ ہو جانے کا اشارہ کیا۔

"بکواس مت کرو...... میں یہاں کوئی تنخواہ دار ملازم نہیں ہوں...... بالکل ماں کی طرح عزت دیتا ہے مجھے داؤد...... بہت شرم لحاظ والا بچہ ہے۔ بہت دکھ ہوتا ہے اس پر گزرے سانحہ کا سوچ کر۔" پھر ماں نے اس پر بیتنے والے حالات...... گزرنے والی قیامت کا بتایا...... اس کا دل بھی بھر آیا...... سوئی ہوئی ننھی پری پر بے ساختہ پیار و ترس ایک ساتھ آیا۔ چوم لیا......

"ہیں کہاں داؤد صاحب......" اس نے مڑ کر عالیہ بی سے پوچھا۔

"آفس والوں نے کام سے اسلام آباد بھیجا ہے۔ آجائے گا چند روز میں۔"

☆☆☆

"زندگی بھی کتنے ستم ظریف اتفاقات سے دوچار کردیتی ہے۔ دیا! آج بھی میں پہاڑ پر ہوں...... خوب صورت نظارے بھی وہیں ہیں۔ ہمارے ملنے کی یہی تو تاریخ تھی...... یہ بھی لوٹ آئی ہے مگر تم نہیں ہو...... آسمان کی نیلاہٹ...... آبشاروں کے نغمے...... پرندوں کی چہچہاہٹیں...... بارش میں بھیگتے جھومتے افق کو چومتے اشجار...... پھولوں کا رقص...... رنگ...... خوشبو...... بادل...... سب...... سب کے سب وہی ہیں۔ یہیں ہیں مگر تمہیں کتنی جلدی تھی دیا جانے کی......

"تم کہیں نہیں ہوں......"

☆☆☆

پھر دیا کی روشنی امید سے یوں مانوس ہوئی گویا برسوں سے اسے جانتی ہو۔ سچ تو یہ تھا کہ عالیہ بی نے کچھ داؤد کی ہمدردی اور کچھ اپنی مجبوری کے تحت یہ ذمے داری اٹھا تو لی تھی مگر اب ڈھائی سالہ بے حد ایکٹو اور شریر سی روشنی کے پیچھے بھاگنا، اسے سنبھالنا انہیں دوبھر تھا۔

سو وہ خاموشی سے روشنی اور امید کے بیچ سے ہٹتی چلی گئیں۔

داؤد ایک ماہ بعد واپس گھر لوٹ رہا تھا۔ اس نے یہ ایک ماہ روشنی کے بنا کیسے گزارا تھا؟ بس گزار لیا...... روز تین وقت فون کرکے عالیہ بی سے اس کی خیریت پوچھتا...... اس کی آواز سننے کی فرمائش کرتا۔

گھر کی صفائی ستھرائی...... ڈسٹنگ...... کوکنگ...... سب امید نے کی تھی۔ یہ عالیہ بی کی خاص ہدایت تھی کہ "بچے کو واپسی پر گھر جیسا ہی ماحول میسر آئے اس لیے یہ سب کرنا ضروری ہے۔"

رات آٹھ بجے وہ گھر پہنچا۔

اور پہلی ہی نظر میں اس نے بھانپ لیا تھا کہ اس کا گھر دوبارہ "بس" چکا ہے۔

"کیوں؟ اب تو مطمئن ہو نا تم؟" چھٹی کے دن رضا اس سے ملنے چلا آیا۔

"ہاں یار...... گھر اور روشنی کی طرف سے مکمل بے فکری ہو گئی ہے۔ بہت شکر گزار ہوں میں تمہارا۔" وہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔

"اور اپنے متعلق کیا سوچا ہے تم نے؟" رضا نے کچھ کھوجتی سوچتی نگاہوں سے اسے بغور دیکھا۔

"کیا سوچنا ہے اپنے متعلق؟" وہ الٹا اسی سے سوال کرنے لگا۔

"دوبارہ گھر نہیں بسانا؟"

"پلیز......" اس کے چہرے کے عضلات تن گئے۔ "تم جانتے ہو میں اس موضوع پر بات کرنا پسند

نہیں کرتا۔"
"اچھا خیر۔" رضا سنبھل گیا۔ "چھوڑو اور بتاؤ وزٹ کیسا رہا؟"
اس نے پوچھا گفتگو کا رخ دوسری جانب مڑ گیا۔

☆☆☆

امید کو داؤد انسان سے زیادہ فرشتہ لگا تھا۔ کہاں ہوتی ہے ایسی محبت جیسی آج بھی وہ مری ہوئی بیوی سے کرتا تھا۔ بیڈ روم کی چیزیں اب تک ویسی ہی سیٹ تھیں جیسی دیانے کی تھیں...... پورے گھر میں عالیہ بی اور امید استحقاق سے رہتیں مگر اس کمرے میں داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ مگر نجانے اب کیا ہوا تھا کہ امید کو اس پراسرار زندہ جاوید محبتوں کی امین خوابوں جیسی خوابگاہ میں جانے کی کھوج لگ چکی تھی۔
جستجو شوق کو بڑھا دیتی ہے جو اگر پورا نہ ہو تو حسرت بن جاتا ہے۔
اس کی دوست ہما کہتی تھی کہ
"محبت آج کے دور میں صرف قصے کہانیوں میں دکھائی دیتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ آج کا عاشق اور معشوق دونوں ہی بڑا پریکٹیکل قسم کا عشق فرماتے ہیں۔ نفع، نقصان پر مکمل نظر رکھتے ہیں اور پھر یہی ٹھیک بھی ہے نا...... آخر ایسی محبت کا کیا فائدہ کہ کچھ ہاتھ ہی نہ آئے...... "نہیں نہیں اس نظریے کو آج کی زندگی پر کسی طرح بھی لاگو نہیں کیا جا سکتا......"
"اور ہما جو اس دیوانے کو دیکھ لے تو اسے اپنی ساری منطقیں اور عقلی دلیلیں اس پراسرار شخص کے سامنے فیل ہوتی دکھائی دیں۔ اسے محبت کر کے کیا مل رہا ہے؟ مگر یہ آج بھی اپنی گزری ہوئی بیوی سے محبت کرتا ہے بنا نفع نقصان کی پرواہ کے اور کتنی خوش نصیب ہے وہ عورت...... جو فنا ہو کر بھی اس کے من میں باقی ہے۔" آج کل نا چاہتے ہوئے بھی امید یہی سب سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

"میں پوچھتا ہوں کہ یہ گری کیسے؟ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو۔"
گھر واپسی پر دیکھا روشنی کے ماتھے پر پٹی بندھی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ مارے غصے کے آپے سے باہر ہو گیا۔
"بچے گر گر کر ہی بڑے ہوتے ہیں، اس میں اتنی پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" امید اس کی فکر مندی کے پیش نظر رسان سے بولی۔
عالیہ بی شرمندہ سی اپنی جگہ چور بنی کھڑی تھیں۔
"آپ یہ جملہ بڑی آسانی سے اس لیے کہہ رہی ہیں کیونکہ روشنی آپ کی اولاد نہیں۔" داؤد نے درشتی سے کہا۔ "اگر یہ آپ کی اولاد ہوتی تو میں دیکھتا کہ کیسے اتنی مطمئن کھڑی ہوتیں۔" جملہ نہیں نیزے کی انی تھی جو داؤد نے اس کے جگر میں چبھوئی تھی۔ اس کی آنکھیں مارے تکلیف کے بھر آئیں...... وہ ہکا بکا کھڑی عالیہ بی کی جانب گھوم کر رندھی ہوئی آواز میں بولی۔
"میں آپ سے کہتی تھی نا...... پرائی اولاد کو لاکھ سینے سے لگا کر پالیں مگر اس کی ذرا سی تکلیف پر آپ کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا جائے گا...... یہ ہے آپ کی مشقت اور وفاداری کا انعام۔" وہ کہہ کر اپنے اور عالیہ بی کے مشترکہ کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ اسے روتے دیکھ کر داؤد کو اپنے لفظوں کی سنگینی احساس ہوا۔
"بیٹا۔" عالیہ بی بے چارگی سے بولیں۔
"جانتی ہوں اپنی بچی کے لیے کتنے حساس ہو تم...... مگر بیٹا یقین جانو ہماری لاپرواہی کی وجہ سے نہیں گری بچی...... امید تو اس کا بہت خیال رکھتی ہے...... نہلا کر لائی تھی کمرے میں...... ماربل کا فرش تھا بیڈ سے اچھل کر اتری اور فرش پر پھسل گئی۔ بس لمحوں میں ہو گیا سب...... خود بھی بڑی فکر ہو رہی تھی اسے پٹی کرواتے وقت خود بھی رو رہی تھی۔ بہت محبت کرتی ہے روشنی سے...... پر کہتی تو ٹھیک ہی ہے پرائی اولاد کو پالنا آسان کام نہیں مانو ہر وقت کوئی تلوار سر پر لٹکی ہو...... اچھا خیر۔" وہ بھی کہہ کر اندر چلی گئیں۔ وہ پشیمان سا لاؤنج کے صوفے پر گود میں روشنی کو سلائے ہوئے تھا۔ روشنی کی آنکھ کھلی تھی۔

"موی......موی......" وہ امید کو پکار کر رونے لگی۔

اور امید کی سچائی پر مہر ثبت کر دی۔

☆☆☆

"میں بہت شرمندہ ہوں۔" دوسری صبح وہ ناشتے کی میز کے پاس آ کر بولا۔ وہ اس وقت روشنی کا دودھ لینے کچن میں آئی تھی۔ رک گئی۔

"مجھے آپ کو اتنے سنگین الفاظ کہنے کا کوئی حق نہیں۔ آپ تو میری محسنہ ہیں اور میں آپ سے ہی اتنے سخت لہجے میں بات کر گیا۔"

"کوئی بات نہیں...... یہ تو آپ کا بڑا پن ہے کہ تنخواہ دار ملازم سے معذرت چاہ رہے ہیں۔" وہ طنزیہ بولی۔

"دیکھیے۔" داؤد نے اس کے طنز کا از حد برا منایا۔ "آپ اس طرح میرے خلوص کی توہین نہیں کر سکتیں۔ میں آپ لوگوں کو ملازم نہیں بلکہ گھر ہی کا فرد سمجھتا ہوں۔"

"آپ نے سمجھا...... مگر ہم ہیں تو نہیں...... ایک سچی بات پر اتنی ناراضی؟" وہ کہہ کر چلتی بنی۔

داؤد کو اس پر بے حد غصہ آیا تھا۔

☆☆☆

"شاباش بولو...... بولو مما......" امید اپنے کمرے میں بیڈ پر روشنی کو لیے بیٹھی تھی...... عالیہ بی کچن میں کچھ لینے گئی ہوئی تھیں۔ داؤد، جو امید کے کمرے کے سامنے سے گزر کر باہر جا رہا تھا کمرے سے آتی آواز پر ٹھہر گیا۔

"ما...... ما" روشنی نے کچھ شرما کر توتلی زبان میں کہا۔

"ارے میری جان۔" امید نے والہانہ انداز میں اسے گلے لگا لیا۔ داؤد کا سارا وجود مضطرب ہو گیا۔

"ما...... ما...... ما" اندر روشنی تکرار کر رہی تھی۔

داؤد کے وجود کا اضطراب بڑھنے لگا...... وہ امید کو ٹوکنا چاہتا تھا۔ مگر ٹوک نہیں سکتا تھا۔ وہ روشنی کی ماں نہیں ہے۔ اسے روشنی کے منہ سے خود کو ماں نہیں کہلوانا چاہیے۔ مگر وہ روشنی کے وجود پر اپنی ممتا نچھاور کرتی ہے۔ بنا غرض اور بلا معاوضہ...... سو داؤد روشنی کو اسے ماں کہنے سے کیسے روک سکتا ہے؟"

☆☆☆

"یہ تو نے کن اٹھائی گیر عورتوں کو گھر میں گھسا رکھا ہے؟" فیروزہ، داؤد سے ملنے کے لیے آئی تھیں۔ وہی پرانا مقصد لے کر آج کل ان کی بہن سبیکا سے چھوٹی شاہانہ کے لیے فکر مند تھیں۔ اور وہ جو یہ سوچ اپنے ذہن میں لے کر پشاور سے کراچی آئی تھیں کہ اب تک تنہائی اور روشنی کی پرورش کے سلسلے میں پیش آنے والے مسائل نے داؤد کی ضد کی آہنی دیوار کو کمزور کر دیا ہوگا۔ تھوڑا بہت وہ اسے جذباتی طور پر پگھلانے کی کوشش کر کے آخری چوٹ مار دیں گی۔ یہاں پہنچ کر اپنی سوچوں کے برعکس دیکھا تو سخت بے مزہ ہوئیں۔

"ماں پلیز......" داؤد برہم مگر مدھم لہجے میں بولا۔ "آپ ان معزز خواتین کے بارے میں کوئی سخت بات نہیں کر سکتیں۔"

"خانہ خراب......" انہوں نے سر جھٹک کر غصے میں کہا۔

"جوان جہان لڑکی نامحرم کے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہ رہی ہے اور تو کہتا ہے کہ معزز...... داؤد! مجھے تیری کم عقلی پر حیرت ہوتی ہے...... پتا نہیں کون ہیں۔ کہاں سے کس مقصد کے لیے آئی ہیں اور تو ہے کہ اپنی بیٹی اور پورا گھر ان کے حوالے کر کے بڑے اطمینان سے بیٹھا ہوا ہے۔" وہ غضب ناکی سے بول رہی تھیں۔

"تو پھر کس کے حوالے کرتا؟" داؤد بھی چڑ گیا۔ اور یک دم ان کے بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ تو روشنی کو یونہی چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ پیچھے میں نے کن کن مسائل کا سامنا کیا ہے آپ کچھ بھی نہیں جانتیں۔ تو میں اور کیا کرتا؟" وہ بھڑک گیا۔ مگر بڑے

ٹھسے سے بیڈ پر نرم کمبل اوڑھے نیم دراز ماں پر چنداں اثر نہ ہوا۔ وہ اسی قدر سکون اور اطمینان سے بولیں۔

''سب تیری غلطی ہے۔ کہہ تو رہی تھی تجھے کہ شادی کر لے شاہانہ سے، روشنی کو ماں بھی مل جاتی اور تجھے گھر سنبھالنے والی بھی۔ مگر تیرے نزدیک تو ماں کی بات کی اہمیت نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔ الٹا نجانے کن اچکیوں کو گھر میں گھسا کر گھر کا مالک بنا بیٹھا ہے۔''

''ماں پلیز'' وہ عاجز آ کر بولا۔ ''آپ کچھ دن کے لیے آئی ہیں۔ آرام سے رہیں۔ اور مجھے بھی آرام سے رہنے دیں۔''

''ہاں رہ آرام سے...... پر یاد رکھنا کل کلاں کو اگر اس گھر اور روشنی کو یہ دونوں نقصان پہنچا کر چلتی بنیں تو میرے پاس روتے ہوئے مت آنا۔'' وہ کہہ کے بستر پہ دراز ہو گئیں۔

کچھ دیر داؤد بے بسی سے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر مڑ کر کمرے سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ ہاتھ میں چائے کی ٹرے اور آنکھوں میں ڈھیروں آنسو لیے امید کو کھڑے پایا۔

☆☆☆

''ماما...... ماما پاس...... ماما پاس۔'' روشنی نے رو رو کر گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔ عالیہ بی، داؤد دونوں ہی اسے سنبھالنے میں ناکام ہو چکے تھے...... نہ وہ کچھ کھا رہی تھی...... نہ کھیل رہی تھی۔

''بڑا ہی بگاڑ رکھا ہے بچی کو نامراد نے'' فیروزہ صوفے پر براجمان ناک بھوں چڑھا رہی تھیں۔

''میری پیاری بیٹی۔'' داؤد نے اسے بانہوں میں بھرنے کی کوشش کی۔ کل رات ہی امید نے فیروزہ کی ہرزہ سرائی سننے کے بعد ایک منٹ مزید اس گھر میں نہ ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ داؤد تو اسے دیکھ کر اتنا شرمندہ ہو گیا تھا کہ معذرت بھی نہ کر سکا۔ وہ روتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔ بیگ میں اپنا سامان ٹھونسا۔

عالیہ کے بوکھلا کر پوچھنے پر کہ کیا ہوا وہ پھٹ پڑی۔

''آخر میں نے ایسا کون سا گناہ کر دیا ہے جو میں یہاں رہ کر سب کی تذلیل آمیز باتیں سنوں...... میں یہاں اب ایک منٹ بھی مزید نہیں ٹھہروں گی۔ ابھی اور اسی وقت اس گھر سے جا رہی ہوں جن کا گھر ہے وہ سنبھالیں۔ بہت جلد میں رہائش کا انتظام کر کے آپ کو بھی وہیں بلوا لوں گی۔'' اس نے بیگ کی زپ بند کی اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ہینڈ بیگ دوسرے کندھے پر ڈالا۔

ایک اداس اور نم نگاہ سوئی ہوئی معصوم روشنی پر ڈالی اور گھر سے باہر قدم رکھ دیے...... عالیہ بی اس کے عقب میں ''ارے، ارے'' کرتی رہ گئیں۔ اپنی دوست ہما کے ہاسٹل پہنچنے کے ایک گھنٹے بعد اسے عالیہ کی پریشانی کا خیال آیا۔ فون کر کے اپنی خیریت کی اطلاع اور واپس نہ آنے کا اعلان کیا۔ عالیہ بی بی اس کی حرکت کا محرک جان کر از حد غمگین ہو گئیں۔ حالات نے انہیں کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ ایک وقت تھا کہ جب وہ بڑی شان سے اپنی حویلی میں رہا کرتی تھیں۔ شوہر نے ان سے پسند کی شادی کی تھی سو وہ ساری زندگی سسرال والوں کے لیے ناپسندیدہ رہیں۔ جوں ہی شوہر کی آنکھیں بند ہوئیں گویا عافیت نے بھی ان سے نگاہیں پھیر لیں۔

☆☆☆

وہ ساری رات تڑپ تڑپ کر روتی رہیں۔ صبح ہوئی تو روشنی نے ان کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔

کہ وہ بری طرح امید کی عادی ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ کھیلتی، اس سے کھاتی، نہاتی، اس کے ساتھ سوتی اور اب جب آنکھ کھلنے پر وہ نہ دکھی تو اس نے بھی کھانے پینے، سونے جاگنے ہر چیز سے انکار کر دیا۔ اور صرف روتی رہی۔

''بابا...... مما پاس...... مما پاس......'' داؤد کی گود میں آ کر بھی اس کا یہی راگ تھا۔ داؤد نے روشنی کی ابتر حالت دیکھی اور یکدم ہی فیصلہ کن انداز میں اٹھ کر کھڑا ہوا۔

''عالیہ بی'' اس نے سر جھکائے ندامت سے

بیٹھی عالیہ بی کی جانب جواب طلب نگاہوں سے دیکھا، کہاں گئی ہے امید؟'' اس نے پوچھا تھا۔

☆☆☆

تذلیل کا جاں گسل احساس..... نئی جگہ..... مستقبل کے اندیشے اس پر اس ننھی پری کی یاد..... سوئی تو ساری رات امید بھی نہیں تھی۔ کچھ دیر قبل ہی اس کی آنکھ لگی تھی کہ ہما نے تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے اٹھایا۔

''اٹھو موئی..... تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔''

''کون؟'' اس نے بمشکل تمام سوجی ہوئی آنکھیں کھولیں۔

''شاید روشنی اپنے پاپا کے ساتھ۔'' ہما نے کہا تھا۔ اور اس نے دیکھا امید نے فوراً سے پیشتر اپنا کمبل اتار پھینکا اور ایک جست میں چارپائی سے اتر کر بنا منہ دھوئے یا بال سنوارے کمرے سے جھپاک سے باہر..... ہما بڑی معنی خیزی سے مسکرائی تھی۔

''ماما.....'' ویٹنگ لاؤنج میں موئل جوں ہی داخل ہوئی روشنی دیوانہ وار، داؤد کا ہاتھ چھڑا کر اس تک آئی تھی..... امید نے بھی بڑی بے قراری سے اسے اپنی بانہوں میں اٹھایا تھا..... روشنی زور زور سے رونے لگی۔ شاید قدرت نے انسان کے خمیر میں یہ چیز گوندھی ہے کہ اس کی عمر کوئی بھی ہو..... خوشی کی انتہا پر نجانے اتنے بہت سارے آنسو کہاں سے اس کی آنکھوں میں چلے آتے ہیں۔

''میری بچی..... میری روشنی۔'' امید اسے بے تحاشہ چوم رہی تھی۔

''ماما..... دھر (گھر)۔'' اس نے اپنی توتلی اور ادھورے فقروں والی زبان میں کہا کہ ماما گھر چلیں۔

داؤد نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ بس یونہی خاموشی سے اپنی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا بغور یہ منظر دیکھتا رہا۔

''ہاں کیوں نہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ضرور چلیں گے گھر۔'' ہما نے اس کا سامان لا کر اسے تھما دیا اور جاتے وقت اس کے کان میں یہ منتر پھونکا تھا کہ.....

''محبت کرنے والوں کی قدر کرنا سیکھو..... اغیار کے طعنوں سے گھبرا کر خود سے محبت کرنے والوں کو کسی آزمائش سے دوچار کر دینا دانشمندی نہیں..... ایک جرأت مندانہ قدم جب اٹھا ہی لیا ہے تو ثابت قدمی کا مظاہرہ کرو..... اور یوں بھی میرا وجدان کہہ رہا ہے کہ وہ دن دور نہیں کہ جب تمہاری یہ آزمائش کسی خوب صورت بندھن میں تبدیل ہو جائے گی۔''

☆☆☆

فیروزہ، امید کی گھر واپسی پر ناراض ہو کر جا چکی تھیں۔

انہیں سمجھانا..... اور ان کی بات مان جانا دونوں ہی داؤد کے بس میں نہیں تھا اور غالباً یہی صورت حال دوسری طرف بھی تھی۔

خیر..... امید گھر لوٹ آئی..... عالیہ بی نے روشنی کی حالت کے متعلق بتایا..... بہت پشیمان ہوئی..... آتے ہی اسے کھلایا پلایا نہلایا..... پھر خود بھی اس کے ساتھ آرام سے سوگئی.....

مگر عالیہ بی کو اب جا کر صورتحال کی سنگینی کا اندازہ ہوا تھا۔ ان کی پریشان نگاہیں ایک دوسرے کے ساتھ اطمینان سے سوتی ہوئی امید اور روشنی پر ٹکی تھیں۔

اس بے نام رشتے کا کیا مستقبل تھا؟

☆☆☆

''روشنی آج تین سال کی ہوگئی ہے دیا!''

اس کی تیسری سالگرہ بھی میں نے بڑے اہتمام سے سیلی بریٹ کی ہے۔ وہ آج پنک اور سلور رنگ کے فراک میں بالکل تمہارا پرتو لگ رہی تھی۔ اس کے بال، اس کی آنکھیں، اس کی مسکراہٹ اور ٹھوڑی کا تل..... سب تم سے بہت ملتے ہیں دیا..... اور..... اور.....''

اتنا لکھ کر داؤد گہری سوچ میں مستغرق ہوگیا..... لکھنا چاہتا تھا کہ اس کے بال، اس کی

آنکھیں، اس کی مسکراہٹ اور ٹھوڑی کا تل سب تم سے بہت ملتے ہیں دیا مگر اس کے انداز...... اس کے اطوار...... نشست و برخاست سب امید جیسے ہیں۔

دیا کی روشنی اب امید کے وجود سے منعکس ہو رہی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ بات دیا کو بتائے مگر نجانے کیا بات ہوئی وہ اس کے آگے لکھ ہی نہیں سکا۔

تب ہی کسی نے بہت متوحش انداز میں اس کا دروازہ بری طرح پیٹا تھا۔ وہ چونک پڑا۔ ڈائری بند کر کے دراز مقفل کی اور جلدی سے دروازہ کھولا۔ سامنے ہی بری طرح روتی ہوئی امید کھڑی تھی۔

''وہ ...... وہ ...... امی کو...... امی کو نجانے کیا ہو رہا ہے...... ان کی سانسیں...... اکھڑ رہی ہیں۔''

امید نے بے ربط سے جملے ادا کیے تھے۔

''اوہ...... چلو!'' داؤد گاڑی کی چابی اٹھا کر سرعت سے باہر نکلا۔

☆☆☆

''جیسے ...... تمہیں ...... تمہاری بیٹی عزیز ہے میرے بچے۔''

اسپتال کے بیڈ پر لیٹی عالیہ بی داؤد کا ہاتھ اپنے کانپتے ہوئے ضعیف مختلف ڈرپس کی سوئیوں سے چھلنی ہاتھ سے تھامے بڑی لجاحت سے کہہ رہی تھیں۔ انہیں دل کا دورہ پڑا تھا۔ بروقت اسپتال پہنچنے پر انہیں ٹریٹمنٹ دی گئی مگر وہ اپنی زندگی سے مایوس اور موحل کے مستقبل سے خوفزدہ ہو گئی تھیں۔

''اسی طرح مجھے میری بیٹی کی بہت فکر ہے داؤد...... اسے تم بلیک میلنگ...... خود غرضی...... مفاد پرستی کچھ بھی کہو...... میں جانتی ہوں کہ دنیا ایک بے آسرا جوان لڑکی کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔ میرے بعد میری بچی کہیں کی نہیں رہے گی۔ تمہاری نیت لاکھ صاف ہے مگر داؤد! دنیا تمہیں جینے نہیں دے گی...... میری بچی سے تمہاری چھت کا آسرا بھی چھین لے گی۔ تم سمجھ رہے ہو نا کہ...... میں...... کیا کہنا چاہ رہی ہوں؟'' انہوں نے بڑی آس و امید سے داؤد کا سپاٹ چہرہ دیکھا۔

''آپ اتنی فکر مند کیوں ہو رہی ہے...... ان شاء اللہ آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔'' داؤد نے نظریں چرا کر انہیں دلاسا دیا۔

''نہیں بیٹے......!'' عالیہ نے اس کا ہاتھ بے دلی سے چھوڑ دیا اور ہانپنے لگیں...... اتنا بول کر وہ تھک چکی تھیں۔

''چراغ کی اونچی لو...... اس کی زندگی کے اختتام کی غمازی کرتی ہے۔ میں جان گئی ہوں کہ مجھے ان چند سانسوں کی مہلت کیوں دی گئی ہے۔''

''داؤد......!'' پھر جیسے عالیہ بی کی آواز میں تحکم در آیا۔

''روشنی، امید کے بغیر رہ نہیں سکے گی اور نہ موحل بنا کسی جائز رشتے کے تمہارے ساتھ اکیلے تنہا گھر میں رہ سکتی ہے...... ایک بار میں نے مشکل وقت میں تمہارا ساتھ دیا تھا...... آج تمہاری باری ہے...... بتاؤ...... اس احسان کا بدلہ چکانے کی طاقت رکھتے ہو؟''

ایک مرتی ہوئی بے بس ماں ہر قیمت پر اپنی بیٹی کا مستقبل محفوظ بنانا چاہ رہی تھی خواہ اس کے لیے اسے احسان جتانے جیسی رزیل حرکت ہی کیوں نہ کرنی پڑی وہ کر گئی اور داؤد خان یہ سن کر مکمل سناٹے میں آ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے......'' کچھ دیر بعد وہ ضبط کی انتہائی پر کھڑا بولا تھا۔

''داؤد خان...... احسان کا بدلہ...... احسان سے چکانے کی طاقت رکھتا ہے...... وہ آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔''

''دیا مجھے معاف کر دو...... آج تمہارا داؤد تم سے بے وفائی کا ارتکاب کرنے جا رہا ہے۔ زندگی بھی عجیب ہے...... انسان کو کبھی کبھار ایسے مقام پر کھڑا کرتی ہے کہ جس سے مفر ممکن نہیں ہوتا۔ ایک زندگی اور موت کے درمیان ڈولتی ہوئی ماں جو میری محسنہ بھی ہے میں چاہ کر بھی اس کی بات رد نہیں کر پا رہا۔ اور رد کر بھی کس طرح کر سکتا ہوں؟ بالفرض محال اگر میں

احسان فراموش بن بھی جاؤں تب پھر میں روشنی کا کیا کروں گا؟ میں اس روشنی کا کیا کروں گا جس کی تابناکی اب امید سے مشروط ہو چکی ہے۔ نہیں دیا...... داؤد اتنا کم ظرف نہیں کہ اپنی محبت کی خاطر تین زندگیوں سے، ان کی امیدوں سے ان کی توقعات سے کھیل جائے۔ مجھے معاف کر دو...... مجھے معاف کر دو۔''

اور وہ جوان، توانا بھرپور طاقت ور مرد اس سے پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔

☆☆☆☆

ریڈ اور فیروزی کام سے بوجھل لانگ شرٹ اور چوڑی دار میں ملبوس سجی سنوری امید...... اپنی بڑی بڑی مسحور کن آنکھوں کو جھپک جھپک کر خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ کہیں یہ کوئی خواب تو نہیں...... اتنا شاندار، مکمل اور سب سے بڑی خوبی جو عموماً صنف مخالف میں عنقا تصور کی جاتی ہے یعنی وفا...... وفادار مرد اس کا نصیب بنا دیا گیا تھا۔ کیا یہ انعام معمولی تھا؟ وہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھی سوچ رہی تھی کہ

''میں داؤد کو اتنی محبت دوں گی کہ اس کا خالی دل چمک اٹھے گا۔ اس نے مجھے اپنا کر اعلا ظرفی کا ثبوت دیا ہے۔ میں تاعمر اس کی اعلا ظرفی کا خراج اسے ادا کرتی رہوں گی۔''

''بی بنو!'' ہما اندر آتی ہوئی بولی۔'' وہ چونک گئی۔ ابھی سے کن سوچوں میں گم ہو؟''

''کچھ خاص نہیں۔'' وہ مدھم لہجے میں بولی۔

''دیکھو موی......'' وہ اس کے نزدیک بیٹھ گئی۔

''جیسا کہ تم مجھے بتایا کرتی تھیں کہ داؤد اپنی پہلی بیوی سے دیوانوں کی طرح محبت کرتا ہے۔ اتنی کہ اس کے گزر جانے کے بعد بھی اس کی یادوں کے سہارے زندہ ہے۔

موی! اب جب کہ اس نے تمہاری عزت و ناموس کی خاطر اور سب سے بڑی بات، ہما ٹھہری...... موی بغور اس کی بات سن رہی تھی کچھ توقف کے بعد ہما دوبارہ کہنے لگی۔

''اس نے اپنی بیٹی کی خاطر تمہیں اپنایا ہے۔ تو تمہیں بھی اسے کچھ اسپیس دینا پڑے گی...... ظاہر ہے تمہاری محبت اس کے دل میں بیدار ہونے میں کچھ وقت تو لگے گا...... اور یہ عرصہ تمہیں حکمت اور دانش مندی سے گزارنا ہوگا...... کیا سمجھیں؟'' ہما نے بات کے اختتام پر اس کے چہرے کے تاثرات جانچے۔

''یہ بات میں سمجھتی ہوں۔'' امید نے حقیقت پسندی سے کہا......

''یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ راہ پرخار ہے مگر مجھے خود پر بھروسا ہے ہما...... کہ میں اس راہ کے سارے کانٹے چن کر اسے گلزار بنا سکتی ہوں۔'' وہ پرعزم لہجے میں بولی۔

''خوش رہو'' ہما نے نم آنکھوں سے اس کا ماتھا چوما تھا۔ کچھ دیر بعد گواہان کی موجودگی میں اس کا نکاح ہوگیا۔ عالیہ بی مارے خوشی کے رو پڑی تھیں...... رضا جو شاید شروع سے یہ ہی چاہتا تھا بار بار اپنی مسرت کا اظہار کر رہا تھا۔ گرین شرارے میں یہاں وہاں کدکڑے لگاتی روشنی کو سنبھالنے کی ذمے داری آج کی رات ہما نے اپنے سر بخوشی لے رکھی تھی۔

یوں دیکھا جائے تو ہر شخص خوش اور مطمئن تھا۔ سوائے داؤد کے......

اب اسے رخصت کر کے حجلہ عروسی میں لے جا رہا تھا۔

''اوہ...... آج یقیناً اس پراسرار خواب گاہ کے سارے سربستہ راز اس پر کھل جانے تھے۔ سرور و مستی امید کے انگ انگ میں لہریں بہنے لگی...... مگر......

اسے پہلا دھچکا تب لگا جب داؤد کے بیڈ روم کے بجائے اسے گیسٹ روم میں پہنچا دیا گیا تھا۔ یہ الگ بات کہ گیسٹ روم کے بجائے اب یہ کمرہ بیڈ روم کا منظر پیش کر رہا تھا...... اور اب یہیں بیٹھ کر اسے داؤد کی آمد کا انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

وہ رات کے اس پہر لان کی چیئر پر بیٹھا بے تحاشا سگریٹ پھونک رہا تھا...... کہ امید کے کمرے میں نئی حیثیت سے جانے کی ہمت وہ خود میں نہیں پا رہا تھا...... اس کی آنکھوں میں وہ رات رقص کر رہی تھی کہ جس رات دیا اس کے نام سے جڑی سیج سجائے بیٹھی تھی۔

ایک پل کو وہ اٹھا اور اس نے دو قدم بڑھا بھی لیے...... مگر پھر کسی نادیدہ قوت نے جیسے اس کے قدموں کو جکڑ لیا...... تب ہی اندر سے رضا اس کی جانب آتا دکھائی دیا۔

''داؤد......!'' وہ اسے بنا کچھ جتائے اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

''میں جانتا ہوں، یہ فیصلہ تمہارے لیے آگ پر چلنے کی مترادف ہے۔ مگر داؤد...... انگاروں پر چلنے والے ہی تو آخر میں فتح یاب ٹھہرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ تم بھابھی کی یادوں سے دستبردار ہو جاؤ جانتا ہوں نہیں ہو سکتے۔ مگر یہ ضرور کہوں گا۔ چلے جانے والوں کی یاد میں کھو کر زندہ انسانوں کو فراموش کر دینا انسانیت نہیں۔'' وہ اتنا کہہ کر اس کا کندھا تھپتھپا کر واپس اندر چلا گیا۔

داؤد نے ادھ جلی سگریٹ پھینکی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اور واقعی وہ انگاروں پر چلتا ہوا ہی کمرے تک آیا تھا۔ مگر خیر گزری...... کہ اس کا انتظار کرتے کرتے وہ سو چکی تھی۔ داؤد کے لبوں سے ایک تشکرانہ سانس نکلی اور وہ وہیں صوفے پر ڈھیر ہو گیا......

اس کی شب زفاف گزر چکی تھی۔

☆☆☆

صبح داؤد سے قبل امید جاگ گئی تھی۔ یونہی ٹیک لگائے لگائے، وہ اپنے نئے نویلے دولہا کا انتظار کرتے نجانے کب تھک کر آنکھیں موند گئی تھی۔ اب جو آنکھ کھلی تو سر بھاری، پلکیں بوجھل اور کمر تختہ محسوس ہوئی۔ مگر ان ساری اذیتوں سے زیادہ تکلیف اسے داؤد کو صوفے پر سوتے دیکھ کر ہوئی تھی۔ وہ اپنے آنسو خود ہی پونچھتی ہوئی اٹھی۔ واش روم میں جا کر کپڑے تبدیل کیے۔ مدھم پڑتا میک اپ صاف کیا۔ جیولری اتاری اور وضو کر کے باہر چلی آئی...... ایک شاکی نگاہ اس بے درد پر ڈالی اور نماز کی نیت باندھ لی۔ پورے خشوع و خضوع سے نماز کی ادائیگی کے بعد وہ مکمل پرسکون ہو چکی تھی۔ جب ''وہ انسان کی فکر کو موجود ہے تب یہ پریشانی کیسی؟ وہ خود ہی اپنی ہمت بندھاتی نماز کے کچھ دیر بعد آہستگی سے دروازہ کھول کر کمرے سے باہر چلی آئی۔

''ارے واہ...... دلہن بیگم اتنے سویرے بیدار ہو گئیں۔''

وہ کچن میں داخل ہو رہی تھی، تب برنر کے سامنے کھڑی چائے بناتی ہما آہٹ پر پلٹی، اور اسے دیکھ کر بے ساختہ نعرہ لگایا۔

''کیوں......'' امید بشاشت سے مسکرا کر بولی۔ ''دلہن بیگم کے سویرے بیدار ہونے پر پابندی لگا دی گئی ہے کیا؟''

''کیا بات ہے بھئی...... ماشاءاللہ خوب چہک رہی ہو...... رات دولہا میاں نے کچھ زیادہ ہی حسن جہاں سوز کی قصیدہ خوانی تو نہیں کر دی کہیں۔'' ہما نے چائے کا پانی بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بس کرو یار، اس کی لطیف سی چھیڑ چھاڑ پر بظاہر مسکراتے ہوئے وہ بولی تھی مگر دل کرچی کرچی ہوا جا رہا تھا۔

جس کے لیے وہ سنواری گئی تھی اس نے تو شاید اسے نظر بھر کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا تھا۔

''اب آرام اور شرافت سے جا کر سامنے ڈائننگ ٹیبل پر جا کر بیٹھ جاؤ اور مجھے شرف میزبانی بخشو، کل سے یہاں کام میں لگی ہوئی ہو۔'' امید نے اس کے ہاتھ سے چائے کی پتی کا جار لیتے ہوئے کہا مگر ہما نے ہاتھ پیچھے کیا اور خود ہی اپنے حساب سے کھولتے پانی میں پتی ڈالنے لگی۔

''رہنے دو ابھی دلہن بیگم...... اب میں اتنی بھی پھوہڑ اور بے ڈھنگی نہیں کہ نئی نویلی دلہن سہیلی کا

گھر نہ سنبھال سکوں۔“

”چلو پھر سنبھالو۔“ امید کچن میں لگی مختصری چار کرسیوں والی ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھی ہوئی بولی۔

”رات روشنی نے تمہیں زیادہ تنگ تو نہیں کیا؟“

”ارے نہیں...... خاصی تھکی ہوئی تھی۔ خود ہی آرام سے سوگئی۔“

اس نے چائے کپوں میں نکالی۔ کیبنٹ سے پلیٹ چمچ وغیرہ اور فریج سے بریڈ، جیلی، مکھن...... سب ٹیبل پر سیٹ کر کے خود بھی آبیٹھی۔

”کہاں گم ہو یار...... چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

ہما نے سلائس پر مکھن لگاتے ہوئے کہا تو وہ جو سوچوں کے گھنے جنگل میں بھٹک رہی تھی چونک کر ہوش میں آئی اور ٹھنڈی سانس لے کر چائے کی جانب متوجہ ہوگئی۔

گھر ہی پر قریبی دوست احباب کو بلا کر اس نے ولیمے کی دعوت بھی کر دی۔ ہما ہزاروں نصیحتوں کے ساتھ اپنے ہاسٹل سدھاری...... آج کی رات امید نے گزشتہ شب والی حماقت نہ دہرائی...... کمرے میں آکر خاموشی سے لباس تبدیل کیا۔ گھریلو حلیہ میں آنے کے بعد وہ رات بسر کرنے کی غرض سے روشنی اور عالیہ کے کمرے میں جانے کے لیے اپنے کمرے کا دروازہ کھول ہی رہی تھی کہ داؤد کمرے میں داخل ہوا۔

نظریں ملیں...... داؤد کے انداز میں حد درجہ اجنبیت تھی مگر وہ امید کو کمرے سے جاتا دیکھ کر بری طرح چونک پڑا۔

”امید!“ سو اس نے بے ساختہ ہی گھبرا کر پکار لیا۔

امید استعجاب سے پلٹی۔

”جی؟“

”کہاں جا رہی ہو؟“

”روشنی کے پاس......“

”نہیں...... یہیں ٹھہرو۔“ وہ تحکمانہ انداز میں بولا۔

”نہیں ...... آپ میری وجہ سے خوامخواہ ڈسٹرب ہوں گے۔“

وہ نظریں جھکائے کہہ رہی تھی۔ انداز جتاتا ہوا سا تھا۔

”میں نے کہا نا...... یہیں ٹھہرو...... بلکہ بیٹھو...... میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ اضطراری انداز میں اپنے گھنے بالوں میں انگلیاں چلاتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا۔ امید اس کے مقابل بیڈ پر آبیٹھی۔ چند لمحے وہ یوں ہی غیر مرئی نقطے کو تکتا رہا...... پھر جیسے چونکا۔

”ہاں......“ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”میں جانتا ہوں کہ یقیناً یہ شادی تمہارے لیے بھی اتنی ہی غیر متوقع رہی ہوگی جتنا کہ میرے لیے...... مگر زندگی شاید غیر متوقع واقعات ہی کا نام ہے۔“ ”ہاں یہ بات سچ ہے کہ دیا......“ اتنا کہہ کر وہ ٹھہر گیا۔ ایسے، جیسے وہ اس نام کو پوری طرح محسوس کر رہا ہو۔ امید یک ٹک اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”میری زندگی اسی ایک نام سے شروع اور اسی پر ختم ہو جاتی ہے۔ مگر، انسان اپنی زندگی اپنی مرضی سے کب جی سکا ہے۔ میں بھی نہیں جی پایا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے مجھے تنہا چھوڑ گئی۔ اکثر اس کے سر میں درد اٹھا کرتا تھا۔ ہلکی پھلکی میڈیسن لے لیا کرتی تھی وہ...... میرا بھی اتنا دھیان نہیں گیا کہ وہ درد معمولی نہیں۔ دماغ میں ٹیومر پل رہا تھا اس کے۔“ وہ بے بسی سے اپنے ہاتھ بھینچتا ہوا بولا۔

امید نے اس کی تکلیف کو محسوس کیا۔

”وہ مجھے چھوڑ گئی...... مگر میں اسے نہیں چھوڑ سکا۔ وہ مجھے اپنی روح میں حلول محسوس ہوتی ہے۔“ وہ اب اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔ ہوتا تو اپنی ”بیوی“ کے سامنے یوں اپنی ”محبوبہ“ کا تذکرہ کر رہا ہوتا؟ امید کو پتا بھی نہیں چلا او ر اس کے آنسو بنا آواز بہنے لگے۔

”میں ہر روز، ہر وقت، اس سے محو گفتگو رہتا

ہوں...... مجھے اپنی زندگی میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی مگر......" وہ بولتے بولتے ہڑبڑا کر بری طرح چونکا تھا۔ پھر سیدھا ہوا...... دو منٹ کی خاموشی اختیار کی...... پھر سنبھل کر کہنا شروع ہوا۔

"دیکھو امید...... میں جانتا ہوں کہ اس نئے رشتے کے حوالے سے تمہاری بھی کچھ توقعات ہوں گی۔ میرا یہ سب کچھ تمہیں بتانے کا صرف یہ مقصد ہے کہ تم میری پوزیشن کو سمجھ سکو...... مجھے کچھ وقت درکار ہے...... اب جب کہ تم میری زندگی کی ساتھی بنا ہی دی گئی ہو تو میرا ساتھ دو...... میں عالیہ بی کے آگے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا وہ کیا سوچیں گی کہ میں ان کے کہے کا مان نہ رکھ سکا...... نہیں امید ایسا مت کرو۔" اس نے سنجیدگی سے اسے سمجھانا چاہا۔

"عالیہ بی؟" امید نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"امی نے کیا کہا ہے آپ سے؟"

داؤد گڑبڑا گیا۔ وہ یقیناً لاعلم تھی کہ یہ شادی عالیہ بی ہی کی خواہش پر کی گئی ہے۔ ان کی خواہش...... اور داؤد کی ضرورت!

"وہ...... وہ اصل میں...... اگر تم شادی کی دوسری رات ہی روشنی کے پاس مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئیں۔ تو میں ان کے سوالات کا کیا جواب دوں گا......؟" داؤد نے بروقت بات بنائی۔

"میں کوشش کروں گی۔" یقیناً داؤد کی تاویل اسے مطمئن کر گئی تھی۔ اسی لیے وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"کہ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہ دوں۔"

"گڈ گرل"۔ داؤد اپنی نشست سے اٹھتا ہوا بولا۔

"اب تم آرام سے یہاں سو جاؤ۔ مجھے کام ہے۔ میں تھوڑی دیر بعد واپس یہیں آجاؤں گا۔" وہ اپنا لائٹر اور سگریٹ اٹھاتا ہوا بولا۔ اور کمرہ عبور کر گیا۔

"وہ اسے یہاں روک کر خود کمرے سے چلا گیا تھا۔ دونوں باتوں میں کیا تفاوت ہے؟

یہ سوچنے کے لیے ابھی پوری رات پڑی تھی۔

اسی لیے گم صم سی امید سوچ گئی۔

"دیا!...... امید ایک اچھی لڑکی ہے۔ اتنی اچھی کہ کوئی بھی لڑکا اس کی تمنا کر سکتا تھا۔ مگر میں اس کا تمنائی نہ تھا کہ مجھے تمہارا سودا ہی کافی ہے۔ مگر زندگی کی ضروریات کو خواہشوں اور تمناؤں سے کوئی غرض نہیں ہوا کرتی۔ امید اور روشنی کے عجیب تعلق نے اس رشتے کو جنم دیا ہے۔ اور میں اس رشتے کا احترام کرنے پر مجبور ہوں۔

"ہاں دیا...... امید میرے لیے محترم ہے۔ جیسی بے غرض محبت وہ روشنی کو دے رہی ہے...... جتنے پیار اور احساس سے وہ اس کی پرورش کر رہی ہے میں خود کو اس کا مقروض سمجھنے لگا ہوں......

"میں نہیں جانتا ہمارے رشتے کا مستقبل کیا ہے مگر اتنا جان گیا ہوں کہ مجھے امید کا قرض چکانا ہی ہوگا......"

پھر بہت سارے دن یونہی عام انداز سے گزرتے چلے گئے......

روشنی نے اسکول جانا شروع کر دیا اور عالیہ بی کی صحت دن بدن بگڑنے لگی...... داؤد کا رویہ امید کے ساتھ ہنوز لاتعلقی لیے ہوئے تھا...... ہاں مگر وہ آتے جاتے یا اس کا سامنا ہونے پر اس سے۔

"کیسی ہو؟" یا "کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔" بھی پوچھ لیا کرتا۔ وہ بھی مشینی انداز میں۔

"ٹھیک ہوں۔" اور "نہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں" کہہ دیا کرتی اس کے بعد دونوں اپنی اپنی راہ پکڑتے۔

اب تک تو امید برداشت کی پالیسی پر عمل پیرا تھی مگر رشتے کے ساتھ ہی احساسات بدل گئے تھے۔ وہی داؤد جو پہلے اسے "عظیم" لگا کرتا تھا اب اس کی "عظمت" سے اسے چڑ محسوس ہونے لگی تھی۔

پہلے اسے دیا پر رشک آیا کرتا اب وہ اس سے حسد محسوس کرنے لگی۔

کیا عشق تھا صاحب...... جس نے جوان خوب صورت بیوی کا وجود بھلا رکھا تھا......

مگر پھر بھی وہ بڑے استقلال سے اپنے محاذ پر ڈٹی ہوئی تھی اور ڈٹی رہی تھی کہ ایک دن بالکل اتفاق سے۔

☆☆☆

وہ روزانہ کی طرح داؤد کے آفس جانے کے بعد صفائی والی سے اپنی نگرانی میں گھر کی صفائی ستھرائی کروا رہی تھی کہ اچانک ہی اس کی نظر داؤد کے ہمیشہ مقفل رہنے والے بیڈروم کے دروازے پر پڑی...... جھری سی دکھائی دی۔ اس نے اپنا واہمہ سمجھ کر ٹالا مگر نہیں...... ذرا قریب آئی۔

دروازہ واقعی کھلا ہوا تھا۔ داؤد کی فاش غلطی! مگر اس کے پورے وجود میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ افراتفری میں کام والی سے صفائی کروائی اسے چلتا کیا۔ اور کمرے میں داخل ہوئی۔

اپنی دسترس سے باہر جس چیز کو بہت سوچا گیا ہو۔ معجزاتی طور پر وہ شے ہاتھ لگ جانے پر انسان کو جو محسوس ہو سکتا ہے۔ وہی احساسات اس وقت امید کے تھے۔

کمرے میں مکمل اندھیرا تھا کہ مخمل کے بھاری میرون اور گولڈن پردے کھڑکیوں پر پڑے روشنی کا راستہ روکے ہوئے تھے۔ اس نے سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہوئے اپنے نم ہاتھوں سے بٹن آن کیا...... یک دم ہی دودھیا روشنی نے اندھیرے کا گلا دبا دیا۔ اخروٹی رنگ کے بھاری چنیوٹی فرنیچر سے کمرہ بھرا بھرا سا محسوس ہوتا تھا۔ بستر پر کھلتے ہوئے ہرے رنگ کی بادامی پھولوں والی چادر بچھی تھی۔ مگر اس کی نگاہوں نے کمرے کی خوب صورتی سراہنے کے بجائے اپنی ساری توجہ سائیڈ ٹیبل پر رکھی سنہرے فریم والی دلہن کی تصویر پر کر لی تھی۔ وہ انجانی سی کشش کے زیر اثر تصویر تک آئی...... اور اسے ہاتھ میں اٹھا کر بنا پلک جھپکے دیکھے گئی۔

خوب صورتی کے سارے استعارے اس پر پورے اترتے تھے کہ جس کے گرد، داؤد نے بڑے استحقاق سے اپنا مضبوط بازو حمائل کر رکھا تھا۔ اس نے وہ تصویر واپس رکھ دی...... دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی رائٹنگ ٹیبل تک آئی...... وہاں سلور ڈیجیٹل کیمرہ رکھا تھا۔ بنا کچھ سوچے سمجھے اس نے آن کر لیا۔ اور یکے بعد دیگراں امر لمحوں کی چشم دید گواہ بن گئی۔ جو دیا اور داؤد نے ایک ساتھ جیے تھے۔

☆☆☆

"جب سے آئی ہو نان اسٹاپ روئے چلی جا رہی ہو...... کچھ بتاؤ تو سہی آخر ہوا کیا؟" ہما عاجز ہو کر بولی۔

"نہیں ہما...... میں ہار گئی...... میں اپنی زندگی کی یہ بازی بری طرح ہار گئی ہوں۔" اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

"کون سی بازی اور کیسی ہار...... کچھ بتاؤ تو سہی۔" ہما فکرمندی سے اسے دیکھ رہی تھی...... امید نے سامنے ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس لبوں سے لگا لیا۔ خالی گلاس رکھ کر خود پر قابو پانے کے بعد بولی۔

"آج اتفاقاً داؤد اپنے اور دیا کے بیڈروم کے دروازے کو کھلا چھوڑ گئے تھے۔ ہما...... شادی سے قبل مجھے وہ کمرہ انمٹ محبتوں کا امین...... پراسرار لگا کرتا تھا۔ ظاہر ہے جتنے اہتمام سے داؤد اسے بند رکھا کرتے تھے اس کے متعلق متجسس ہونا فطری بات تھی مگر مجھے کیا پتا تھا کہ اس کا اسرار مجھ پر یوں کھلے گا کہ میرا وجود ہی لاپتا ہو جائے گا۔" وہ پھر رونے لگی۔

"ہوا کیا؟" ہما کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ اس نے روتے سسکتے ساری روئیداد سنا دی۔

"بس اتنی سی بات۔" ساری بات سن کر ہما نے دانش مند کی طرح نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ اتنی سی بات ہے ہما؟ وہ شخص ٹوٹ کر دیوانوں کی طرح اپنی بیوی کو چاہتا ہے۔ اور شاید ساری عمر چاہتا رہے گا۔ تو اس سارے قصے میں، میں کہاں موجود ہوں؟" وہ افسردگی سے بولی۔

"تم اس کے گھر میں...... اس کی زندگی میں موجود ہو ۔ اس کی بیٹی کی ماں ہو تم اس کی زندگی کی حقیقت ہو۔ اور وہ ایک سائے کی محبت میں گرفتار

ہے...... اور تم سائے سے ڈر رہی ہو امید؟ اتنی کم ہمت تو تم کبھی نہ تھیں۔"

"وہ سایہ میری زندگی پر حاوی ہے ہما۔ داؤد نے آج تک مجھے بیوی کے روپ میں قبول نہیں کیا۔" اس نے روتے ہوئے انکشاف کیا۔ ہما اس بات پر بری طرح چونکی۔ پھر گہرے تفکر میں ڈوب گئی کچھ دیر بعد لب کشا ہوئی تو آواز میں گہری سنجیدگی اور ٹھہراؤ تھا۔

"ٹھیک ہے۔ نہیں کیا تو کرلے گا۔ ابھی تمہاری شادی کو محض چند ماہ ہی تو ہوئے ہیں اور تم ابھی سے سودوزیاں کے چکر میں پڑ گئیں تو خالی ہاتھ رہ جاؤ گی...... اب ان شکایات پر دل چھوٹا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں یہ سب تمہیں شادی کرنے سے قبل سوچنا چاہیے تھا۔ یہ بات پہلے ہی سے تمہارے علم میں تھی کہ وہ اپنی پہلی بیوی سے شدید قسم کے عشق میں مبتلا ہے اب یوں رودھو کر رقابت میں جل کر کڑھنے سے تو کچھ نہیں ہوگا...... اپنی جگہ بنانے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ وہ تمہارا شوہر ہے۔ وہ تعلقات استوار کرنے میں پہل نہیں کر رہا تو یہ قدم تم ہی اٹھالو۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ضروریات کا خیال رکھو۔ اپنے ہونے کا احساس دلاؤ۔ اس سے روشنی کے متعلق باتیں شیئر کیا کرو...... اس نے اپنے دل ودماغ کو خول میں بند کر رکھا ہے تم وہ خول چٹخانے کی کوشش کرو۔ اس کے گرد اپنی خدمت گزاری اور اطاعت گزاری کا ایسا مضبوط جال بنا دو کہ وہ اس سے باہر نکل ہی نہ پائے۔" اس کی باتیں غور سے سنتی امید بولی۔

"مگر ان سب باتوں سے کیا فرق پڑ جائے گا؟"

"کر کے دیکھو...... آزمائش شرط ہے!" اس نے بات ختم کردی۔

☆☆☆

مگر یہ سب کرنے کی نوبت ہی نہ آئی قدرت نے ان دونوں کو نزدیک لانے کے لیے موقع فراہم کر دیا۔

اس روز سرِ شام ہی سے عالیہ بی کی طبیعت اکھڑی اکھڑی سی تھی۔ رات پڑتے پڑتے ان پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔ امید کو اپنے جسم سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ داؤد انہیں اسپتال لے کر گیا مگر بے سود...... مسافر اپنا سفر تمام کر چکا تھا...... امید کی زندگی میں طوفان سا در آیا۔

وہ بلک بلک کر کسی چھوٹی بچی کی طرح رو رہی تھی...... ہما اس کی دگرگوں حالت دیکھ کر خود بھی رو پڑی مگر پھر بھی اسے صبر کی تلقین متواتر کرتی رہی۔ مگر اسے صبر آ ہی نہیں رہا تھا...... داؤد کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

آج عالیہ بی کے انتقال کو ساتواں روز تھا مگر امید کی بے قرار روح کو کسی پل چین نہ تھا۔ داؤد حسبِ معمول صوفے پر نیم دراز سگریٹ پھونکنے میں مشغول تھا جب بڑی مشکل سے ـــــ سوئی ہوئی امید چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔

"امی...... امی...... آپ مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئیں...... امی آپ نے مجھے اکیلا چھوڑتے ہوئے میرا بالکل بھی احساس نہیں کیا کہ میں آپ کے بعد کیسے رہوں گی۔" وہ روتے ہوئے مسلسل انہی الفاظ کی گردان کر رہی تھی۔ داؤد جو بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر عالمِ تذبذب میں رہا۔ پھر سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا کر اس تک آیا، اس کے قریب بیٹھ کر بولا۔

"کیوں روتی ہو امید...... کیا میں اور روشنی تمہارے نہیں۔" وہ رونا بھول کر اسے تحیر سے دیکھنے لگی۔

اور داؤد نے اسے خود سے لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"اب مت رونا...... میں اور روشنی تمہارے ہی ہیں۔ تم اکیلی نہیں۔"

☆☆☆

ٹھیک ہی کہا تھا ہما نے کہ وہ ایک سائے کے خوف میں مبتلا تھی۔ یہ شان دار گھر اس کا تھا۔ داؤد جیسا بے

مثال شخص اس کا تھا...... روشنی اس کا دم بھرتی تھی۔
داؤد نے اسے اعتبار بخشا تو اس نے بھی اپنی ساری محبتیں اسی پر لٹا دیں۔ وہ ایک اطاعت گزار، فرمانبردار بیوی تھی۔
داؤد بھی اس کی ساری ضروریات کا خیال رکھتا۔ امید نے سارے گھر کی تزئین و آرائش اپنی مرضی سے کی۔ داؤد نے اعتراض نہ کیا۔ لان میں اپنی مرضی سے کچھ نئے پودے لگائے۔ بیج بوئے۔ مگر جب وہ ایک سوکھا خشک پیلا پڑتا موگرے کا پودا اکھاڑنے لگی تب وہ بے ساختہ بول بیٹھا......
''مومی...... اسے یہاں سے نہ اکھاڑنا......''
''کیوں...... خشک اور بدنما ہوگیا ہے۔ کیاری کی ساری خوب صورتی اس کی وجہ سے گہنا رہی تھی۔''
(میری نظر سے دیکھو...... اس سے خوش نما اور تروتازہ پوردا اس روئے زمین پر نہیں)
''ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو...... مگر یار...... اس گھر کو خریدنے کے بعد اس لان میں یہ پہلی چیز تھی جو میں نے بڑے ارمانوں سے بوئی تھی۔''
''ارے۔'' امید ہنس پڑی۔ ''ٹھیک ہے بابا، نہیں ہٹاتی اسے اب خوش۔'' وہ یقیناً ایک اچھی بیوی تھی جو شوہر کی باتوں کی زیادہ کرید نہیں کرتی تھی۔
''امید نے اپنا اور ''داؤد'' کا بیڈروم بھی اپنی مرضی سے سنوار لیا تھا۔ کیا ہوا جو آج بھی داؤد ''اپنا اور دیا'' کا بیڈروم مقفل رکھتا تھا۔ ہر انسان کی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسا ''پراسرار'' پہلو ضرور ہوتا ہے۔ امید نے زندگی سے یہی سیکھا تھا کہ کچھ رازوں پر ہمیشہ پردے ہی پڑے رہنے چاہئیں۔ حجاب اٹھ جائیں تو زخم کھل جاتے ہیں!

☆☆☆

اب اتنے سال بعد......
داؤد پر، اس کے گھر پر اور اس کے دل پر بلاشرکت غیرے امید کی حکمرانی تھی۔ گزرتے وقت نے ان کے رشتے کو مزید مضبوط کیا تھا۔
ان کی سوائے روشنی کے کوئی اور اولاد نہ ہوسکی۔ یہ بات اکثر امید کو ملول و دلگرفتہ کر دیتی مگر روشنی اتنی پیاری اور فرمانبردار و وفادار بیٹی تھی کہ امید کے دل سے رفتہ رفتہ یہ کسک جاتی رہی۔
ان کی زندگی میں کئی اتار چڑھاؤ بھی آئے کہ دنیا کبھی کسی کو چین سے جینے نہیں دیتی...... دنیا قدم قدم پر اسے سوتیلی ماں ہونے کا احساس دلاتی رہی۔
اس نے تمام حالات کا مقابلہ کیا اور سچ تو یہ ہے کہ یہ داؤد ہی تھا جو اس کے گرد حصار اور کڑی دھوپ میں سر پر سائبان بن گیا تھا۔
مگر کبھی کبھار اس کے دل میں خدشے سر اٹھاتے تھے...... سو روشنی کی زندگی کے فیصلے کا اختیار امید کو سونپ کر داؤد نے ان خدشات کا سر کچل دیا۔ اور اس کی ریاضت کو سنہرا تاج پہنا کر اسے سرخروئی بخشی تھی......

☆☆☆

''دیا!''
''کل تمہاری روشنی اس گھر سے رخصت ہوجائے گی......
بلاشبہ امید نے اس کی تعلیم و تربیت پر اس بہترین انداز سے محنت کی ہے کہ آج مجھے اپنے اس فیصلے پر فخر اور اطمینان محسوس ہوتا ہے اور میرا دل خدا کے بعد عالیہ بی کا از حد شکر گزار ہے۔
سچ تو یہ ہے کہ جس وقت عالیہ بی نے اپنے احسان کا بدلہ مجھ سے امید کے ساتھ شادی کی صورت میں مانگا تھا مجھے ان کا یہ مطالبہ بے حد خود غرضانہ ہی لگا تھا۔ اور میرا دل قطعی اس کا ساتھ قبولنے پر راضی نہ تھا۔ اور پھر میرے سامنے روشنی اور اس کی امید کے لیے تڑپ اور محبت بھی تھی۔ اور خود روشنی کی پرورش کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔
یہ بات طے ہے دیا کہ قدرت جو ہمارے لیے پسند کرتی ہے اسی میں ہماری بھلائی مضمر ہوتی ہے۔
بے شک امید نے روشنی کو بہت اچھی طرح سنبھالا۔ میں اس کا شکر گزار ہوں۔ وہ ایک بہترین ماں اور اچھی بیوی ہے۔
مگر دیا......!

میرے دل میں کبھی کبھی یہ خیال بڑے شدت سے در آتا ہے کہ اگر آج تم یہاں میرے پاس موجود ہوتیں تو اس بے رنگ زندگی کے مناظر کس رنگ میں رنگے ہوتے شاید روپہلے......گلابی......ارغوانی یا پھر دھانی؟

کچھ معلوم تو نہیں......مگر پھر بھی کبھی کبھار میں نجانے کیوں یہی سوچتا رہتا ہوں۔" اس نے لکھ کر ڈائری بند کر دی۔ کمرے میں گھٹن بڑھنے لگی۔

وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگا پھر یکدم کمرے سے باہر قدم بڑھا دیے مگر بے دھیانی میں سالوں پہلے کی طرح کمرے کا دروازہ مقفل کرنا بھول گیا۔

☆☆☆

ساری رات گزر گئی۔ مگر داؤد کے انداز نشست میں تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ نوکر بیدار ہو گئے۔ وہ کسی ہارے ہوئے "فاتح" کی طرح بیٹھا تھا شرف الدین اس سے چائے کا پوچھنے چلا آیا۔

"آہ چائے؟" وہ بری طرح چونک کر خالی الذہنی کے عالم میں اسے دیکھنے لگا۔ "کیا صبح ہو گئی؟"

"جی صاحب......" اس نے مؤدب لہجے میں جواب دیا۔

"بلکہ اب تو خاصا دن چڑھ آیا ہے۔"

"اچھا!" وہ تحیر سے بولا۔ پھر سنبھل کر کہنے لگا۔

"ہاں لے آؤ چائے میں کمرے میں ہوں اپنے۔" وہ بڑی دقتوں سے اٹھا جیسے ہزاروں من بوجھ کسی نے اس کے وجود پر لاد رکھا ہو......

"بے چارے صاحب جی۔" شرف الدین اسے شکستہ قدموں سے اپنے کمرے کی طرف جاتے دیکھ کر سوچنے لگا۔

"اکلوتی بیٹی کو بیاہ کر کتنے غمگین ہیں......مگر تم کیا بھول گئے شرفو، تم بھی تو اپنی دھی رانی کو بیاہ کر کتنے ہی روز یونہی افسردہ پھرے تھے......سچ ہے......بیٹی بڑی پیاری چیز ہے اسے کسی انجان کو سونپ کر کلیجہ کانپتا ہی رہتا ہے۔" وہ سر جھٹک کر چائے بنانے چل دیا۔

☆☆☆

صبح کے دس بج چکے تھے۔

مگر پروفیسر ہما یزدانی نے اپنی پگلی......اپنی بکھری ہوئی......الجھی ہوئی شکست خوردہ......جذباتی سہیلی جو رات بھر روتی رہی تھی اور صبح کے قریب جا کر کہیں سکون آور دوائی کے زیر اثر سوئی تھی کو اب تک نہیں جگایا تھا......اچھا تھا کہ وہ خود ہی جاگتی۔

رات روشنی کی شادی کے فنکشن سے لوٹنے کے تقریباً ڈیڑھ، دو گھنٹے بعد اس کا فون آیا تھا۔ اس نے بس اتنا کہا کہ "مجھے ابھی اور اسی وقت تمہاری طرف آنا ہے، ہو سکے تو پلیز اپنے ڈرائیور کو بھیج دو۔"

اور ہما اتنی عقل مند تو بہر حال تھی ہی کہ بنا سوال کیے اس کا مطالبہ پورا کر دیا......وہ آئی......ہاتھ میں سوٹ کیس تھا......ہما نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہ کیا۔ معمول کے مطابق اس کا استقبال کیا۔ اس کے ساتھ چائے پی۔ وہ اس تمام عرصے میں بالکل خاموش رہی......پھر رونے لگی اور بے ربط سے انداز میں اپنا دکھ، اپنا شکوہ، اپنا درد سب کچھ اس کے سامنے اگل دیا......ہما نے سب کچھ خاموشی سے سنا، اس کا کندھا محبت سے دبایا......نیند کی گولی کھلائی اور آرام سے سو جانے کی تلقین کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔

اور اب اسی تحمل اور سکون سے اس کی بیداری کی منتظر تھی۔ خود اس کا بیٹا پڑھائی کی غرض سے ملک سے باہر تھا۔ شوہر جسٹس ایس ایم اقبال کسی کانفرنس کے سلسلے میں دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔

"بیگم صاحب......اب تو دس بج چکے ہیں آپ کا ناشتہ بنا دوں؟" زرینہ نے آ کر پوچھا۔

"ایسا کرو......" وہ جو آرام کرسی پر بیٹھی آج کا اخبار دیکھ رہی تھی اخبار سے نظر ہٹا کر سوچتی ہوئی بولی۔ "بنانا شروع کر دو میرا اور امید ہم دونوں کا......شاید اتنی دیر میں وہ جاگ جائے۔"

یہی ہوا......ناشتہ بننے کے دوران وہ جاگ گئی......ہما نے بصد اصرار اسے ناشتہ کروایا......پھر چائے لے کر اس کے ساتھ لان کی جانب نکل آئی......سردیوں کے دن تھے۔ شاہ خاور بھی ٹھٹھرا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی ہلکی تپش والی کرنیں جسم

کو بھلی لگ رہی تھیں۔
"اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟" ہما نے پوچھا......
"پتا نہیں۔" امید کا چہرہ ستا ہوا اور آواز ناہموار تھی۔
"ہوں......؟" ہما نے پرسوچ ہنکارا بھرا۔ روشنی کی شادی شدہ زندگی کی اولین صبح...... کیا تمہیں روشنی کو لینے اس کے گھر نہیں جانا ہے؟"
"کون روشنی؟" امید نے گردن اس کی جانب موڑ کر حد درجہ بیگانگی سے پوچھا۔
"تمہاری بیٹی!" ہما مدھم سی مسکرائی۔
"وہ میری کچھ نہیں لگتی" آواز بھرانے لگی۔
"اٹھارہ سال خود کو اس کی خاطر ہلکان کیوں کیا پھر؟"
"بڑی نادانی ہوئی مجھ سے۔" وہ چلتے چلتے تھک کر لان چیئر پر آبیٹھی اور ہانپنے لگی۔
"ناراض داؤد بھائی سے ہو۔" ہما بھی وہیں آبیٹھی۔ "تو پھر خود کو اور روشنی کو سزا کیوں دے رہی ہو۔"
"میں ان سے ناراض نہیں ہوں۔" امید چلائی۔ "ناراض اپنوں سے ہوا جاتا ہے۔ جب وہ میرے کچھ لگتے ہی نہیں تو میری ناراضی کیسی؟"
"تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ وہ تمہارے کچھ نہیں لگتے؟"
"ہما پلیز...... تم مجھے کچھ بھی سمجھانے کی کوشش مت کرنا۔ میں اب کچھ نہیں سمجھنا چاہتی۔ میں نے اتنے سال اس شخص سے ٹوٹ کر محبت کی اس کی اولاد پالی اس کا گھر سنوارا، اس کی ضروریات کا خود سے بڑھ کر خیال رکھا اور اس نے...... اس نے بدلے میں مجھے کیا دیا؟
اپنے دل میں تھوڑی سی جگہ تک نہ دے سکا۔ اس نے بحالت مجبوری مجھے اپنی زندگی میں شامل کیا۔ مجبوری کے تحت میرا ساتھ نباہتا رہا۔ مجھے ضرورت کی طرح برتتا رہا۔ کیا تم میری اذیت سمجھ سکتی ہو؟ ہرگز نہیں۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ وہ میرا شکر گزار ہے۔ میرا مقروض ہے۔ زندگی کا ساتھی ہے مگر محبت...... محبت وہ آج بھی اسی دیا سے کرتا ہے ہما۔ میری تو عمر رائیگاں گئی اس شخص کے پیچھے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ہما متانت سے مسکرائی۔
"یقین مانو امید! تمہارے جیسی بے عقل عورت میری نگاہ سے آج تک نہیں گزری...... وہ تمہارا مشکور ہے زندگی کا ساتھی ہے۔ تمہاری محبتوں اور وفا شعاری کا قرض دار ہے اور تم یہاں بیٹھی محبت کو رو رہی ہو؟"
"محبت ہی کی کمی تو رلاتی ہے۔"
"ہرگز نہیں...... محبت کی کمی شاید دل دکھاتی ہے۔ مگر عورت کی زندگی میں رونے کے لیے اور بہت سی باتیں موجود ہوا کرتی ہیں امید...... اقبال ایک وکیل ہیں۔ دن رات ان کے پاس ایسے متعدد کیسز آتے ہیں کہ تم سنو تو دنگ رہ جاؤ۔ اپنا درد بھول جاؤ۔ اور پھر تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ اگر داؤد بھائی تم سے شادی کے بعد کسی اور سے محبت کر بیٹھتے۔ یا محبت چھوڑو کسی سے افیئر چلا لیتے۔ یا کوئی تعلق قائم کر لیتے تب تم ان کا کیا بگاڑ لیتیں؟ ایسے مقامات تو شادی شدہ مرد حضرات کی زندگی میں اکثر آجایا کرتے ہیں۔ اس مقام پر تمہارا اقدام کیا ہوتا؟"
"وہ اس قسم کے مردوں میں سے نہیں ہیں۔" امید بے ساختہ بولی۔
"میں یہی تو تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ اپنی عمر کے اس حصے میں آکر کیوں اپنی ریاضت خاک میں ملا رہی ہو۔" وہ رسانیت سے بولی۔
"مگر محبت...... کیا محبت کی کوئی حقیقت نہیں؟ سچ تو یہ ہے ہما! کہ روح کی پیاس صرف سچی اور پرخلوص محبت ہی سے بجھتی ہے۔"
"یہ سب کتابی باتیں ہیں۔" ہما نے استہزائیہ کہا۔ "اگر ہوتا نا تمہارا شوہر کوئی ہتھ چھٹ، بدزبان، بدلحاظ اور مالی لحاظ سے غیر مستحکم شخص تب میں تم سے یہ روح کی پیاس کے فلسفوں کی حقیقت پوچھتی۔" اب کی بار امید خاموش رہی۔
"زندگی میں مکمل جہاں کسی کو نہیں ملتا...... عقل مند

وہی ہے جو اس رمز کو سمجھ لے...... زندگی آسانی سے گزر جاتی ہے۔'' امید گہری سوچ میں گم ہو چکی تھی۔

☆☆☆

''بابا!'' داؤد اپنے کمرے میں اندھیرا کیے آنکھوں پر بازو رکھے بیڈ پر دراز حساب زندگی میں مصروف تھے تب ہی ان کے کانوں میں یہ جانی پہچانی، زندگی سے بھرپور کھنک دار آواز گونجی۔ انہوں نے چونک کر آنکھوں سے بازو ہٹایا۔

''میں آ گئی......'' وہ کمرے میں داخل ہو کر کھڑکیوں سے پردے ہٹاتے ہوئے بولی۔ کمرے کا بوجھل اندھیرا کھڑکی کے راستے سے باہر نکل گیا۔

وہ سرعت سے اٹھ بیٹھے۔

''کیسے آئیں......کون لے کر آیا ہے تمہیں۔''

وہ حیرانی سے پوچھنے لگے۔

''شعیب (شوہر) کے ساتھ آئی ہوں۔ اور کون لے کر آتا؟'' وہ دھپ سے ان کے نزدیک بیٹھ گئی۔

''آپ دونوں کی اتنی یاد آ رہی تھی...... جیسے ہی شعیب جاگے۔ فٹافٹ ان کے ساتھ یہاں آ گئی۔'' وہ لاڈ سے داؤد کے کاندھے پر اپنا سر رکھ کر بولی...... داؤد کا ہاتھ بے ساختہ اس کے ریشمی بالوں والے سر پر ٹھہرا۔

''بہت غلط بات ہے روشنی...... نہ جانے شعیب کیا سوچتا ہوگا...... پھر رواج کے مطابق ہمیں تمہارے گھر تمہیں لینے آنا تھا۔''

وہ تنبیہا بولا۔ مگر لہجے سے پدرانہ شفقت صاف جھلکتی تھی۔

''وہ کچھ نہیں سوچیں گے؟'' وہ داؤد کے کندھے سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔ ''اور اگر آپ لوگ نے آنا تھا۔ تو اب تک آئے کیوں نہیں تھے۔''

وہ منہ پھلا کر بولی۔

''وہ...... وہ دراصل۔'' اس سوال کا داؤد کیا جواب دیتا؟

''اچھا چھوڑیں۔'' وہ بیڈ سے اٹھتی ہوئی بولی۔

''ماما کہاں ہیں۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔ بہت سی باتیں شیئر کرنی ہیں۔'' وہ بولتی ہوئی کمرے سے جانے لگی۔

''تمہاری ماما...... یہ گھر چھوڑ کر جا چکی ہیں۔'' داؤد کی پست مگر گمبھیر آواز سنائی دی۔ روشنی یکدم ٹھہر گئی۔ پھر مڑی۔

''گھر چھوڑ کر چلی گئیں...... مگر کیوں؟'' وہ تعجب سے بولی۔

''شاید میری ہی کسی بات پر ناراض ہو گئی ہے۔'' داؤد نظریں چراتے ہوئے بولے۔ چند ثانیے روشنی بالکل دیا کے سے انداز میں کمر پر ہاتھ ٹکائے انہیں شاکی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔

''اور آپ نے انہیں جانے دیا...... روکا کیوں نہیں؟'' وہ جرح کرنے لگی۔

''روکا تھا...... نہیں رکی۔'' وہ بے چینی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''اوہ...... ویری سیڈ، یقیناً بہت سیریسلی ہرٹ ہوئی ہیں۔'' وہ خود کلامی کرنے لگی۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟'' داؤد فکرمندی سے کمرے میں ٹہلنے لگے۔

''کچھ بھی کریں...... مگر انہیں منالیں بابا...... میں زندگی میں دوسری بار اپنی ماں سے محروم ہونا نہیں چاہتی۔'' معاً اس کی آواز گلوگیر ہو گئی اور آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر آئے۔

''ہاں...... میں اسے ضرور منالوں گا میری بیٹی...... کہ زندگی میں دوسری بار میں اپنا ہمسفر کھونا نہیں چاہتا۔''

اور پھر داؤد روشنی ہی کو ساتھ لیے ہما کے گھر چلا آیا۔ ظاہر ہے امید کا زندگی میں داؤد اور روشنی کے بعد اگر کوئی تھا۔ تو وہ ہما ہی تھی۔ ملازمہ نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اندر ان کی آمد کی اطلاع پہنچائی کچھ دیر بعد چائے اور ہما ایک ساتھ آتے دکھائی دیے۔ ہما نے بڑے پیار سے روشنی کو ساتھ لگا کر دعا دی اور مسکرا کر کہنے لگی۔

''اپنی ماما کو لینے آئی ہیں نئی نویلی دلہنیا...... بھئی یہ تو ایک نئی رسم ایجاد ہو گئی۔'' روشنی پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔ داؤد سنجیدگی طاری کیے بیٹھا تھا۔

بی اے...... مسکرائے پتا چلا ہے کہ ماما
کسی بات پر ناراض ہو کر گھر چھوڑ آئی ہیں۔"

"تو کیا اس کی ناراضی غلط ہے؟" اس نے براہ راست خاموش بیٹھے داؤد کو مخاطب کیا۔ "کیا اتنے برس بے لوث محبتیں لٹانے والی کو اتنا حق بھی حاصل نہیں کہ اپنی ناراضی ہی جتا سکے۔" وہ مزید بولی۔

"ناراض ہونے کا حق بھی حاصل ہے اور جتانے کا بھی...... مگر پتا تو چلے کہ آخر وہ اتنے نازک موقع پر کس بات پر ناراض ہو کر گھر چھوڑ آئی ہے؟" داؤد سنبھل کر بیٹھ گیا اور ناگواری سے بولا۔

"موقع کی نزاکت کا احساس اسے بھی ہے مگر لگتی ہے نا کبھی کبھی ایسی چوٹ دل پر کہ اس چوٹ کا درد انسان کو ہر شے سے ماورا کر دیتا ہے۔" ہما اپنی سہیلی کا کیس بڑی جانفشانی سے لڑ رہی تھی۔

"کیسی چوٹ...... کہاں کا درد...... کچھ پتا تو چلے...... سارے گھر کی ملکہ اور سیاہ سفید کی مالک ہے وہ۔ آخر ایسی کیا بات ہو گئی جو وہ یوں گھر چھوڑ کر چلی آئی۔" داؤد گلہ آمیز ناراضی سے بولا۔ روشنی خاموشی سے ٹکر ٹکر کبھی داؤد تو کبھی ہما کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی بات پر ہما اپنے ازلی متین انداز میں مسکرائی۔

"گھر کی ملکہ یہ بات جان گئی ہے کہ اس کی راجدھانی کسی کے دل پر قائم نہیں ہو سکی۔" داؤد اس بات پر کچھ بے چین کچھ پشیمان دکھائی دینے لگا۔ البتہ روشنی کے سر سے یہ بات گزر گئی تھی۔

"یہ سچ نہیں ہے۔" داؤد بودے لہجے میں بولا "میں نے آج تک اسے ایسی کوئی بات نہیں جتائی۔ بلکہ ہمیشہ اسے محبت، عزت اور مان دیا ہے۔"

"بات کس قدر درست ہے۔" ہما شائستگی سے بولی۔ "آپ نے ہمیشہ ایک بیوی ہونے کے ناطے اس کا بہت خیال رکھا ہے یہ بات وہ بھی تسلیم کرتی ہے مگر دکھ دراصل اسے اس بات کا ہے کہ وہ آپ کے دل تک رسائی حاصل نہیں کر سکی۔"

"نہیں یہ بات غلط ہے۔" داؤد پرزور لہجے میں بولا۔ "جو دل میں موجود نہ ہو وہ زندگی میں کیسے موجود رہ سکتا ہے؟"

"بالکل اسی طرح جیسے کہ کوئی آپ کی زندگی میں موجود نہ ہو کر بھی آج تک آپ کے دل میں موجود ہے۔" ہما بولی۔ داؤد کو اس کی برجستگی نے لاجواب کر دیا۔ تب ہی روشنی ان کی بحث سے اکتا کر بولی۔

"یہ آپ لوگ کس قسم کی فلسفیانہ باتوں میں الجھ گئے ہیں۔ آنٹی پلیز...... مجھے ماما کے پاس لے چلیں...... وہ ناراض ہیں مگر دیکھیے گا کہ میں انہیں منا لوں گی۔"

"تم کیوں مناؤ گی بیٹا......" ہما دھیمے سے مسکرا کر متانت سے بولی۔ "دل کو درد جس نے دیا ہے۔ مرہم بھی وہی لگائے تو اس بار بات بنے گی کہ چوٹ اس بار اسے بڑی گہری پہنچی ہے۔"

ہما کی بات پر چند ثانیے ماحول میں خاموشی ہو گئی۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" لمحاتی توقف کے بعد داؤد بڑے مضبوط لہجے میں گویا ہوا۔

"داؤد خان نے نادانستگی میں اس کا دل دکھا دیا ہے اور اب اس سے معافی بھی وہی مانگے گا۔"

☆☆☆

"میری آنکھ میں موجود تل کو وہ میرے بے وفا ہونے کی نشانی سمجھتی تھی مگر گواہ ہیں سب کہ داؤد خان بے وفا نہیں تھا۔" بصد احترام، ہما داؤد کو اپنے اسٹڈی روم کے دروازے کے باہر چھوڑ کر ایک حوصلہ افزا مسکراہٹ سے نواز کر وہیں سے واپس پلٹ گئی اور وہ اپنی شخصیت کے تمام تر طمطراق کے ساتھ اندر داخل ہو گیا کہ جہاں گویا زمانے سے چھپ کر اس وقت امید پناہ لیے بیٹھی تھی...... پہلے تو وہ اسے دیکھ کر بے طرح چونکی۔ دوسرے پل اسے ہما کی "غداری" پر بے طرح تاؤ چڑھا پھر تیسرے ہی پل وہ اپنے صبیح و ملیح چہرے پر چٹانوں کی سی سختی طاری کیے ٹھس سی بیٹھ گئی۔ جب کہ اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے۔ کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اضطراری انداز سے چکراتا داؤد محو گفتگو تھا۔

"دیا نہ رہی...... مگر اس کی زندگی میں دیا کی روشنی تو تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس روشنی کے سہارے اس کی زندگی کے سارے اندھیرے دور ہو جائیں گے مگر جلد ہی اس کی یہ خوش امیدی دم توڑ گئی کہ روشنی تو خود دیا کے وجود کی رہین منت تھی۔ دیا نہ رہی تو روشنی کا وجود بھلا کیوں کر سلامت رہ سکتا تھا۔ چاروں اور اندھیرا بڑھ رہا تھا کہ تب ہی اس کی زندگی میں امید کی ایک کرن چلی آئی...... اور چشم زدن میں چہار اطراف یوں پھیلی کہ داؤد کی زندگی میں پھیلے سارے اندھیرے اپنا سیاہ منہ چھپا کر کہیں دور چلے گئے۔ وہ امید کا احسان مند رہا، ممنون رہا، مشکور رہا۔"

"پر اس سے محبت نہ کر سکا...... یہی کہیں گے نا آپ۔" وہ جو لاتعلق سی بنی بیٹھی تھی داؤد کے ان جملوں پر تڑپ کر بے اختیار اس کی بات قطع کر بیٹھی۔ اور داؤد یہ سن کر اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ پھر ایک ایک قدم جیسے سوچ سمجھ کر اٹھاتا ہوا سرمئی کاؤچ پر براجمان امید تک پہنچا......

"اور پھر ایک روز اس بے غرض و بے لوث وفا شعار کے قدموں میں اپنا دل ہار بیٹھا...... میں یہ کہنا چاہتا تھا تم سے...... مگر بس...... کہہ ہی نہیں سکا۔" وہ اس کے مقابل بیٹھا براہ راست اس کی آنسو بھری آنکھوں میں جھانک کر پورے اعتماد سے بولا۔

"جھوٹ...... بالکل جھوٹ۔" وہ جیسے کند چھری سے ذبح ہوئی۔

"آپ آج بھی دیا سے محبت کرتے ہیں...... میں صرف آپ کی ضرورت ہوں۔"

"دیا میری محبت تھی امید...... اور تم میری محبت ہو...... اور تم جانتی ہو کہ داؤد جھوٹ نہیں بولتا......"

"اگر میں آپ کی محبت ہوں تب پھر آپ کو آج بھی اپنی تنہائیوں میں دیا سے مخاطب ہونے کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟" وہ احتجاجاً چیخ پڑی تھی۔ داؤد جان گیا کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے سو ایک لحظہ توقف کے بعد ملول مگر گمبھیر لہجے میں بولا۔

"کیا ہم خاص مواقعوں پر دنیا سے گزر جانے والے اپنے پیاروں کو یاد نہیں کیا کرتے امید...... تو بس تم سمجھ لو...... وہ بھی ایک ایسا ہی لمحہ تھا...... جس کی گرفت میں آ کر میں مغلوب ہو گیا ورنہ یہ داؤد خان جو تمہارے سامنے کھڑا ہے دل و جان سے سرتاپا تمہارا ہے۔ چاہو تو آزما کر دیکھ لو۔"

اور اس لمحے امید نے اس کی شفاف آنکھوں میں کسی دیا کا نہیں...... واقعی اپنا عکس دیکھا۔ اور ان جانے سے احساس میں گھر کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی کہ اتنا تو جانتی ہی تھی واقعی داؤد خان جھوٹ نہیں بولتا۔

☆☆☆

"امید نے مجھے معاف کر دیا ہے دیا...... میں اسے منا کر گھر واپس لے آنے میں کامیاب ہو گیا...... وہ بلاشبہ بہت اعلا ظرف اور بہترین رفیق حیات ہے۔ تو کیا میں اب بھی اسے اپنی محبت اور وفاؤں کا بلا شرکت غیرے مالک نہ بناتا؟ اور میں بناتا یا نہ بناتا بہرحال وہ حق دار ہے کہ اس کی بے لوث ریاضت کو میں رائیگاں نہ جانے دوں سو اس لیے آج میں نے بیس سال سے مقفل میرا اور تمہارا کمرہ کھول دیا ہے۔ موگرے کا وہ مرجھایا ہوا پودا بھی اپنے ہاتھوں سے اکھاڑ پھینکا کہ جس کی اتنے برس میں سخت موسموں سے حفاظت کرتا رہا۔ اب میری وارڈ روب امید کے پسندیدہ رنگوں سے سج گئی ہے دیا۔ اور مجھے یہ سب کرتا دیکھ کر امید کے چہرے پر جو آسودگی بکھری ہے اور اس کی آنکھوں میں جو چمک آ پڑی ہے اسے میں لفظوں میں بیان کر ہی نہیں سکتا۔

میں نے امید سے سچ کہا تھا دیا کہ تم میری محبت تھیں...... سو میرے دل میں ہمیشہ ایک حسین یاد بن کر دھڑکتی رہو گی مگر دیا...... ایک اعتراف میں تمہارے سامنے بھی کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے واقعی امید سے محبت ہے...... سو آج کے بعد میری تنہائی صرف اور صرف امید کے نام ہو گی کیوں کہ تم جانتی ہو کہ داؤد خان بے وفا نہیں۔" اس نے سفید کاغذ کو سیاہ ڈائری میں ہمیشہ کے لیے بند کر دیا......!!

☆☆

صائمہ نور

آخر وہ بھی

اے سی کی خنکی پورے کمرے کو شدید گرمی میں بھی سرد بنائے ہوئے تھی۔ کمرے میں جان دار قہقہوں کی گونج تھی۔ ثومیہ آرام دہ انداز میں بیڈ پر لیٹی ہوئی اتنے شور میں بھی اونگھ رہی تھی۔ آٹھ ماہ کا ارتضیٰ رینگتے ہوئے کبھی ماموں اور کبھی خالہ کی گود کا سفر کر رہا تھا۔ قہقہوں کے گونج میں اس کی قلقاریاں بھی شامل تھیں۔

"ثومیہ، اتنے دن کے بعد آئی ہو کچھ تو اللہ کا خوف کرو جب سے آئی ہو تب سے سو رہی ہو۔ کیا سونے کو نہیں ملتا سسرال میں؟"

چھوٹی زینب جو دن گن رہی تھی کہ ثومیہ آئے گی تو خوب باتیں کرے گی، خاندان بھر میں ہونے والے واقعات اس کے گوش گزار کرے گی، چاچو کے بیٹے کی شادی کے فنکشن میں پہنے جانے والے کپڑے منتخب کرے گی مگر ثومیہ پر تو نیند سی نیند سوار تھی۔ "کچھ دیر رکو، ارتضیٰ کو سلا کر لمبی گپ شپ کریں گے۔" ثومیہ نے غنودگی میں ہی اسے بہلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"سونے دو بہن کو ابھی تو وہ ہے ایک دن اور کر لینا جی بھر کر باتیں۔" امی نے رسان سے ثومیہ کی طرف داری کرتے ہوئے چھوٹی بیٹی سے کہا تھا۔ اس سے پہلے زینب کچھ کہتی ثومیہ کا فون بجا تھا ثومیہ نے مندی مندی آنکھوں سے دیکھا، وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھی تھی جاذب کا فون تھا۔

''ہیلو'' ثومیہ میکے آتی تو جاذب اسے کئی فون کیا کرتا۔ پتا نہیں جاذب نے کیا کہا تھا کہ ثومیہ نے محض جی کہہ کر فون رکھ دیا تھا۔

''کیا ہوا ثومیہ؟'' امی نے اس کے چہرے پر پھیلا تفکر دیکھ کر پوچھا تھا۔

''امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے جاذب کہہ رہے تھے کہ کل ہی واپس آ جاؤں۔'' ثومیہ کے لہجے میں فکر مندی تھی۔

''ہاں پھر تمہیں چلے جانا چاہیے۔'' ماں تھیں وہ اور کیا کہتیں، بیٹیاں تو ہوتی ہی پرائی ہیں۔

''مجھے تو پہلے ہی پتا تھا ہمیشہ یہی کرتی ہیں ثومیہ کی ساس دو دن کے لیے بھیجتی ہیں اور دوسرے ہی دن کسی بہانے سے واپس بلا لیتی ہیں۔'' زینب نے برے برے منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

''ایسے تو نہ کہو، یاد کرو انہوں نے فروا کی شادی میں بھیجا تھا، حالانکہ خود جاذب کے تایا کے یہاں شادی تھی۔'' فروا ثومیہ کی بچپن کی سہیلی تھی، اتفاق سے اس کی اور جاذب کے سگے تایا کے بیٹے کی ایک ہی دن شادی تھی، جس میں سے اس کی ساس نے کمال فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فروا کی شادی میں جانے کی اجازت دے دی تھی۔ ثومیہ آج تک ان کی احسان مند تھی وہ منع بھی کر سکتی تھیں۔

''ہاں بھیجا تھا بلاشبہ وہ ایسی جگہوں پر کھلے دل کا مظاہرہ کرتی ہیں جہاں چار لوگوں کو پتا چل سکے کہ بہو کے معاملے میں ان کا دل کتنا وسیع ہے۔''

''میری ساس تمہاری خوفناک ساس سے تو اچھی ہی ہیں کم از کم کڑوے بول، بول کر دل آزاری تو نہیں کرتیں۔'' ثومیہ نے برا مانتے ہوئے زینب کو جواب دیا تھا۔ زینب منگنی شدہ تھی اور اس کی ساس سگی پھپھو تھیں۔ پھپھو تو ویسے بھی بدنام ہی ہوتی ہیں اور اب تو وہ ساس بھی بن گئی تھیں۔ وہ قدرتی کچھ تھیں بھی منہ پھٹ۔

''چاہے میری کڑوی کسیلی ساس ہوں یا تمہاری اچھے برتاؤ کے بھیس میں لپٹی میٹھی چھری جیسی ساس، تاثیر تو دونوں کی ایک سی ہی ہے۔'' زینب نے کہتے ہوئے ارتضٰی کو گود میں اٹھایا تھا۔ ثومیہ اب کچھ کہنے کے بجائے خاموش رہی تھی۔

''اب تم کیا خاک جاگو گی، صبح صبح آ جائیں گے جاذب بھائی تمہیں لینے۔'' زینب اب ارتضٰی کو اٹھاتے ہوئے کمرے سے باہر جا رہی تھی تاکہ ثومیہ اپنی نیند پوری کر سکے۔ اور ثومیہ پھر سے غنودگی میں جاتے ہوئے زینب کو جواب بھی نہ دے سکی تھی۔

☆☆☆

''ثومیہ، ذرا بات سننا بیٹا۔'' کچھ دیر پہلے ہی ثومیہ کام کاج سے فارغ ہو کر ننھے ارتضٰی کو لے کر کمرے میں آئی تھی، جب بلقیس بیگم نے ہلکی سی دستک دیتے ہی ساتھ دروازہ بھی کھول لیا تھا۔ تھکن سے چور آڑی ترچھی بیڈ پر دراز ثومیہ جلدی سے اٹھی تھی۔

''جی امی۔'' اس نے بند ہوتی آنکھیں بمشکل کھولتے ہوئے ساس کو جواب دیا تھا۔

''تم سو گئی تھیں، ابھی روزینہ کا فون آیا تھا بچوں کے ساتھ شام کو آ رہی ہے، کھانا یہیں کھائے گی تو یہی بتانے آئی تھی کہ شام کو تم اٹھتیں تو دیر ہو جاتی۔''

بلقیس بیگم نے کمرے کی بتی جلاتے ہوئے ثومیہ کو اپنی آمد کا مقصد بتایا تھا۔

''اوہ اچھا آپ بتائیے کیا پکانا ہے میں پکا لوں گی۔'' ثومیہ کے انداز میں تابعداری تھی۔

''نہاری تو بنی ہوئی ہے، (آج رات کے کھانے کے لیے نہاری بن چکی تھی) تم یوں کرو پلاؤ کی یخنی تیار کر لو، چاول شام میں ڈال دینا اور قیمہ بھون لو ساتھ۔ رائتہ سلاد تو شام میں بھی بن جائیں گے۔ میٹھا میں بنا لیتی ہوں۔'' بلقیس بیگم نے مینیو سوچتے ہوئے ثومیہ کے گوش گزار کیا تھا۔

''امی! نہاری کے ساتھ پلاؤ اچھا لگے گا۔ قیمہ رہنے دیتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟'' ثومیہ نے

جھجکتے ہوئے کہا تھا، ڈشز، پھر روٹیاں، کچن سمیٹنا ،کھانے کی میز سجانا، پھر بعد میں چائے وغیرہ کا دور، مہمانوں کے ساتھ بیٹھ کر خوش اخلاقی کے تقاضے بھی پورے کرنے پڑتے اور ساتھ میں ارتضیٰ، یہی نہیں رات گئے میاں صاحب کے ناز نخرے بھی اٹھانا تھے کہ کل چھٹی کا دن تھا۔ثومیہ کو رات تک کا سوچتے ہی چکر سا آیا تھا۔

''تم رہنے دو، میں کر لیتی ہوں، اتنے دن کے بعد آرہی ہے میری بہن۔ میں جانتی ہوں تو دیکھتی نہیں ہو وہ کیسے انواع واقسام کے کھانوں سے میز بھر دیتی ہے۔''

بلقیس بیگم کو بہو کی بات بالکل پسند نہ آئی تھی۔ وہ کہہ کر مڑنے لگی تھیں۔ انہیں جب ثومیہ کی کوئی بات بری لگتی تو وہ اس وقت تو کچھ نہیں کہتیں، مگر حکم عدولی پر بہت برا مانتی تھیں۔ اور کئی دن منہ پھلائے رکھتیں اور ہر کام میں اٹھتے بیٹھتے مین میکھ نکالتیں۔ اسی لیے ثومیہ ان کی ناراضی سے ڈرتی تھی۔

''ارے نہیں امی! میرا یہ مطلب نہیں تھا اصل میں سر میں بہت درد ہو رہا ہے، میں کچھ دیر آرام کر لوں پھر بنا لیتی ہوں قیمہ بھی، ابھی تو بہت وقت ہے۔''

کچی نیند ٹوٹنے سے ثومیہ کے سر میں ہلکا درد شروع ہو چکا تھا، نیند اڑنے کا الگ اندیشہ تھا کہ ایک بار سونے کے دوران نیند میں خلل پڑ جائے تو دوبارہ سونا محال ہوتا تھا۔ اسی لیے وہ کچھ دیر آرام کرنا چاہتی تھی کہ صبح سے اٹھی ہوئی تھی۔

''ہاں ٹھیک ہے تم دیکھ لو اگر کر سکو تو نہیں تو میں کر لیتی ہوں۔ پہلے بھی تو کیا کرتی تھی۔'' بلقیس بیگم ماتھے پہ بل لیے جتاتے ہوئے کمرے سے باہر آگئی تھیں۔ وہ جانتی تھیں ان کی یہ ٹون سننے کے بعد ثومیہ زیادہ دیر آرام نہیں کر پائے گی اور جلد ہی اٹھ کر کھانے کی تیاری میں لگ جائے گی، نہیں تو ابھی شام ہونے میں اچھا خاصا وقت تھا، چکن پلاؤ اور قیمہ بننے میں اتنی دیر بھی کہاں لگتی تھی۔

اور وہی ہوا ٹھیک پندرہ منٹ بعد ثومیہ کمرے سے نکلی تھی۔ وہ کچن میں رات کے کھانے کی تیاری شروع کر چکی تھی۔

☆☆☆

''باجی! خوش قسمت ہیں آپ جو ثومیہ جیسی بہو ملی بالکل بیٹیوں کی طرح کام کرتی ہے بھاگ بھاگ کر۔'' روزینہ نے ثومیہ کی پھرتیاں دیکھ کر بہن سے کہا تھا۔

''اگر ثومیہ بیٹیوں جیسی ہے تو میں بھی تو ماں جیسی ہوں۔ میں نے بھی اپنی بہو کو پھولوں کی طرح رکھا ہوا ہے، مجال ہے کہ کبھی کوئی آرڈر دوں، جب دل چاہے جیسے دل چاہے کام کرے۔ اپنی مرضی کا سونا اپنی مرضی کا اٹھنا۔ بتاؤ ثومیہ، کیا میں نے کچھ غلط کہا؟''

بلقیس بیگم کی عادت تھی، وہ جو بھی بات کرتیں ٹھوک بجا کر کرتیں اور سامنے والے سے ہاتھ کے ہاتھ تصدیق بھی کرواتیں تا کہ ان کے بیان میں کوئی ابہام نہ رہنے پائے۔ اور سننے والے کو ان کے بیان کی صداقت کا یقین ہو جائے۔ثومیہ ان کی اس عادت سے واقف تھی۔ آج بھی روزینہ خالہ کی بات سن کر جواب دیتے ہوئے، جب بلقیس بیگم نے ثومیہ سے تائید چاہی تو ثومیہ نے مسکرا کر ہاں میں گردن ہلائی تھی۔ اور ثومیہ کی تصدیق کے بعد بلقیس بیگم کی گردن فخر سے تن گئی تھی، بھئی اچھی ساس ہونا اور کہلوانا کوئی بچوں کا کھیل تھوڑی ہے۔

☆☆☆

ارتضیٰ واکر میں بیٹھا پورے گھر میں گھوم رہا تھا۔ ثومیہ اس کو سنبھالتے سنبھالتے ساتھ ساتھ کام بھی کر رہی تھی۔

''ثومیہ! تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ بیٹا، کتنی دیر سے کام کر رہی ہو۔''

صوفے پر ٹانگیں اوپر کیے بیٹھی، بلقیس بیگم نے ثومیہ کو پیار سے ڈپٹا تھا۔ ساسو ماں مہربان ہو رہی تھیں ثومیہ الرٹ ہو گئی۔

''امی! بس تھوڑا ہی رہ گیا، ہاتھ میں جھاڑن لیے ثومیہ گھر کا کونا کونا جھاڑ رہی تھی۔ کچن کا کام تو ہو ہی چکا تھا۔

''کبھی ایسا وقت تھا میں اتنی دیر میں تمام کام کر لیا کرتی تھی بیٹا، یہ بڑھاپا بہت بری چیز ہے انسان کی تمام طاقت نچوڑ لیتا ہے۔'' بلقیس بیگم نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا تھا مصروف سی ثومیہ جلدی جلدی ہاتھ چلاتی سر ہلاتے جواب دے رہی تھی۔

☆☆☆

ناشتہ بنا کر ہاٹ پاٹ میں رکھتے ہوئے ثومیہ نے چائے تھرماس میں نکالی تھی۔ آج ثومیہ معمول سے کچھ پہلے اٹھی تھی، پورے گھر کے جالے اور پنکھے صاف کرنے تھے۔

''یہ رہنے دو بیٹا! صاف ہی ہے، بس کرو اب تم تھک گئی ہو گی۔'' پورے گھر کے پنکھے صاف کر کے وہ بلقیس بیگم کے کمرے میں آئی تو انہوں نے کہا تھا۔ ثومیہ نے نظر دوڑائی وہ صاف ہی تھا مگر جب بھی پنکھے صاف کرنے کی باری آتی وہ اسے یہ پنکھا صاف کرنے سے منع ہی کر دیتیں کہ صاف ہی ہے روز جھاڑنے کی وجہ سے وہ صاف ہی لگتا تھا۔

''بہت دن ہو گئے امی کر لیتی ہوں۔''

ثومیہ نے دوبارہ کہا بھی مگر انہوں نے یہی کہا کہ بس اسے چھوڑ دو۔

☆☆☆

آج صبح ثومیہ کی آنکھ باہر سے آتی کھٹر پٹر کی آوازوں سے کھلی تھی۔ شاید بلقیس بیگم کچن میں کام کر رہی تھیں۔

''یا اللہ کیا مجھے دیر ہو گئی اٹھنے میں؟'' ثومیہ نے بوکھلا کر وقت دیکھا تو ابھی اس کے اٹھنے کا مقررہ وقت نہیں ہوا تھا۔

''پھر یہ آوازیں کیسی ہیں؟'' وہ ہڑ بڑا کر اٹھی پتا نہیں کیا ہوا۔ اور کچن میں آئی تو حیران ہی رہ گئی بلقیس بیگم آلو گوشت اور سویوں کا زردہ بنا چکی تھیں۔

''امی! خیریت آپ اتنی جلدی اٹھ گئیں؟'' وہ تو ثومیہ کے اٹھنے کے بعد ہی اٹھا کرتی تھیں۔

''ہاں آج کچھ طبیعت بے چین تھی، نیند بھی نہیں آ رہی تھی، میں نے سوچا کچھ کام ہی کر لوں آؤ تم بھی ناشتہ کر لو۔'' وہ ناشتے کے لیے روٹیاں بھی بنا چکی تھیں ثومیہ مزید حیران ہوئی۔

یہی نہیں اس نے دیکھا امی نے مشین بھی لگا رکھی تھی بلکہ مشین میں کپڑوں کا آخری چکر گھوم رہا تھا۔ ثومیہ کی شادی کو ڈیڑھ سال ہی ہوا تھا اور شادی کے بعد ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ وہ جی بھر کر حیران ہوتی ناشتہ کرتی رہی اتنے میں ارتضیٰ کے رونے کی آواز آئی تھی۔

''جی امی۔'' ثومیہ کے دل میں ساس کے لیے کوئی گرہ نہیں تھی وہ صاف دل تھی۔ پھر بھی کوئی بات تھی جو اسے اچنبھے میں ڈال رہی تھی۔ ''کیا؟'' سوچتے ہوئے وہ کمرے میں آئی تھی۔

☆☆☆

ثومیہ کمرے آئی اور ارتضیٰ کو ناشتہ وغیرہ کروا کر صاف ستھرا کیا، کچھ دیر اس سے کھیلی، کھلونے دے کر اسے کمرے کے وسط میں بٹھایا تو وہ کھیلنے میں مگن ہو گیا۔ ثومیہ نے اپنی جاذب اور ارتضیٰ کی الماریاں صاف کیں۔ دھونے کے لیے کپڑے الگ کیے، جاذب کے کچھ کپڑے استری کیے۔ یہ سب کرتے، وہ تھک گئی تو یونہی سستانے لیٹ گئی اسے پتا بھی نہ چلا اور آنکھ لگ گئی، ارتضیٰ کھیلتے کھیلتے باہر دادی کے پاس چلا گیا۔ ثومیہ ایسی سوئی کہ ساڑھے بارہ بجے بلقیس بیگم نے ہی اسے اٹھایا۔

''ثومیہ اٹھو بیٹا، ساڑھے بارہ ہو رہے ہیں اور جلدی باہر آؤ کوثر ممانی آئی ہیں۔'' وہ اسے اٹھا کر واپس چلی گئی تھیں۔ ثومیہ ساڑھے بارہ کا سن کر بدحواس ہوئی تھی وہ اتنی دیر تو کبھی نہیں سوئی تھی۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور جلدی جلدی تازہ دم ہو کر باہر نکلی تھی۔

باہر کا منظر صاف تھا کوثر ممانی اپنی بہو کے ساتھ آئی تھیں۔ نیچے ارتضیٰ کے کھلونے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ شاید کافی دیر سے دادی کے پاس کھیل رہا تھا۔ اور ثومیہ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی۔ ممانی مسکراتے ہوئے اس سے ملی تھیں۔

''آنٹی، آپ تو بہت اچھی ساس ہیں، آپ بچہ سنبھال رہی ہیں اور بھابھی ابھی سو کر اٹھی ہیں۔'' کوثر ممانی کی بہو نے بلقیس بیگم کی تعریف کرتے ہوئے شاید اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے تھے۔

''کہا تھا ناں میں نے، میں روک ٹوک نہیں کرتی اپنی بہو پر، دیکھو اپنی مرضی سے سونا اٹھنا ہے۔ پھر مجھے تو بیٹھنے کی عادت ہی نہیں، اتنی دیر تو میں سو ہی نہیں سکتی میں نے صبح سے اٹھ کر مشین لگائی کھانا بنایا۔ جلدی اٹھنے کا یہی تو فائدہ ہے سارے کام وقت پر ہو جاتے ہیں، کیوں ثومیہ ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟'' وہ روانی سے کہہ کر چپ ہوئی تھیں۔

اپنی نند کی باتیں سن کر کوثر ممانی کی آنکھوں میں استعجاب تھا جبکہ ان کی بہو رشک سے اس خوش قسمت بہو کو دیکھ رہی تھی۔

''جی۔'' ثومیہ کے منہ سے بد قت نکلا تھا۔ روزانہ تو وہی صبح اٹھ کر اس وقت تک تمام کام نمٹایا کرتی تھی۔ آج وہ کیوں جلدی اٹھ کر سارے کام کر چکی تھیں، یہ سمجھنے میں ثومیہ کو دیر نہیں لگی تھی۔ انہیں اپنی بھاوج کو دکھانا مقصود تھا کہ وہ کتنی اچھی ساس ہیں۔ اور جو کچھ رہ گیا تھا ان کے بارے میں سمجھنے میں وہ ثومیہ ابھی بھی تھی۔ اس کی ساس کوئی بات بغیر ثبوت کے نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ انہیں جو کہلوانا یا دکھانا ہوتا وہ اس کی ایسے منظر کشی کر کے حقیقت کی طرح دکھاتیں کہ جسے کوئی جھٹلا نہ سکے۔ وہ اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے عملی جھوٹ کے فارمولے پر عمل پیرا ہوتیں پھر چاہے وہ جھوٹ ایک دن کے لیے ہی ہوتا۔

''ماشاء اللہ باجی۔ آپ کے یہاں صفائی کا وہی معیار ہے جو شازیہ کے ہوتے ہوئے تھا۔'' شازیہ بلقیس بیگم کی بیاہی بیٹی تھی۔ ''یقیناً ثومیہ نے گھر کو سنبھال لیا اچھے سے۔'' شاید ممانی نے ثومیہ کا اترا چہرہ دیکھ کر اس کی دل جوئی کی خاطر کہا تھا۔ آخر وہ بھی اپنی نند کو اچھی طرح پہچانتی تھیں۔

''ہاں ثومیہ کرتی ہے، بہت خیال رکھتی ہے ہر بات کا۔ مگر بیٹیاں تو بیٹیاں ہی ہوتی ہیں۔ بیٹیاں تو گھر کے کونے کونے کا خیال رکھتی ہیں۔ یہ کرتی ہے مگر کچھ نا کچھ چھوڑ ہی دیتی ہے اب دیکھو میرے کمرے کا پنکھا جب سے شازیہ شادی ہو کر گئی ہے صاف نہیں ہوا۔''

''کیوں بیٹا! ٹھیک کہا نا میں نے صاف نہیں ہوا نا؟'' اور ثومیہ...... ثومیہ کا سر اس بار تائید میں نہیں ہلا تھا۔ وہ گھومتے سر کے ساتھ سب کو دیکھ رہی تھی۔ بلقیس بیگم جانتی تھیں کہ ثومیہ کتنے لحاظ و مروت والی لڑکی ہے وہ کبھی بھی انہیں جھٹلا کر اپنی بات کی وضاحت نہیں کرے گی۔ اسی بات کا فائدہ اٹھا کر وہ بے فکری سے آدھی ادھوری، اپنی مرضی کا رنگ دے کر گول مول باتیں کیا کرتی تھیں۔

''میں بھی زیادہ کہتی نہیں بہو کو اس کی جیسے مرضی ہو کرے کام...... کر ہی لے گی جب وقت ملے گا بچہ بھی تو چھوٹا ہے۔'' بلقیس بیگم نے بہو کو گم صم دیکھ کر بات سنبھالی تھی۔ سن بیٹھی ثومیہ کو زینب کی باتیں یاد آئی تھیں وہ کتنی بحث کرتی تھی، اپنی بہن سے ساس کے لیے کہ میری ساس بہت اچھی ہیں وہ روایتی ساسوں جیسی نہیں ہیں۔ زینب اس کی ساس کو میٹھی چھری کہتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ ''سنبھل کر رہنا میٹھی چھری جب چلتی ہے تو ایسے کاٹتی ہے کہ درد ہوتا ہے مگر منہ سے آہ بھی نہیں نکلتی۔''

☆☆

ثانیہ الطاف ہاشمی

کامیاب عورت

ساری زندگی گورنمنٹ اسکول کی پرنسپل مسز حمدہ نے یہ کہہ کر گزاری تھی "پیسہ ہی سب کچھ ہے۔ پیسے سے سب کچھ خریدا جاسکتا ہے۔ ان کے شوہر عباس صاحب جو ان کے پھوپھی زاد بھی تھے۔ ان سے ہمیشہ دب کر رہے، ان کا دبنا بنتا بھی تھا حمدہ جیسی خاتون کے سامنے۔ ان کا ذریعہ معاش کوئی خاص نہیں تھا معمولی سی جوتوں کی دکان تھی وہاں بھی ان کا کوئی خاص دل نہیں لگتا تھا اور گھر آکر اس سے زیادہ دل اچاٹ ہوجایا کرتا جب حمدہ کو بنے سنورے مہنگے سے مہنگا میک اپ کرتے دیکھتے۔ اس عمر میں بھی نخرہ اور اکڑ آسمان کو چھو رہی تھی، انہیں اپنے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا اور عباس صاحب کے دل کے حال سے انہیں کیا لینا دینا گھر، آٹا دال اور ہر ایک شے ان کے پیسے سے آتی تھی تو کس کی مجال کہ دم مار سکے، تین تین جوان سال بیٹے' دو کالج جاتے تھے اور ایک چھوٹا اسکول جاتا تھا۔ اب ان کی گردن میں سریا روز بہ روز بڑھتا جارہا تھا' بینک بیلنس ان کی تسلی کا کیا خوب سامان تھا اسکول میں بھی پرنسپل اور گھر میں بھی بڑی چیئر پر براجمان پرنسپل ہی تھیں وہ۔

''آج پھر وہی چائے' تیز پتی والی ذرا پانی کم ڈال کر دودھ پتی ہی بنالیتیں۔" بڑی مشکل سے عباس صاحب کے منہ سے یہ جملہ نکلا تھا۔ اور اتنی ہی سرعت سے تیر ٹھیک حلق کا نشانہ بھی لے چکا تھا۔

''خود کمانا پڑے تو پتا بھی چلے، چلے ہیں دودھ پتی پینے، جس طرح گھر چلتا ہے میں جانتی ہوں جو مل رہا ہے اسی پر صبر کریں۔"

حمدہ نے ٹھیک ٹھاک گرج کر کلاس لی اور اٹھ کر چلی گئیں۔ عباس صاحب کا تو روز کا معمول تھا۔ پراٹھا زہر مار کیا اور ملازمہ پر نظر ڈالی۔ وہ تو روز دیکھتی تھی۔ آج کون سا نیا دن تھا اور چپکے سے دکان کی راہ لی۔ کتنے برے لگتے ہیں اس کے ہونٹ جب زہر اگلتی ہے۔

مسز حمدہ نے بھی تیز لپ اسٹک سے لبوں کو چھپایا اپنی گاڑی نکالی اور یہ جا وہ جا۔ "حد ہے بے توقیری کی بھی مگر یہاں تو کوئی حد ہی نہیں دل چاہے گا تو بولیں گے نہیں چاہے گا تو پروا نہیں کسی کی جوتی کو۔"

عباس صاحب سوچتے ہوئے جارہے تھے۔ بھلے وقتوں میں اماں کہا کرتی تھیں کہ "کمانے والی اور روپے پیسے والی مال دار ساری عورتیں اچھی نہیں ہوتیں جو ایثار کرتی ہیں زمین پر قدم جما کر رکھتی ہیں، وہ تو ہوئیں اچھی اور جو باقی بچتی ہیں ناں ان کے پاس کم ظرفی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا خالی دامن اور خالی دل۔"

تجارت تو حضرت خدیجہؓ نے بھی کی تھی اور اپنے مال کو کس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان کے مقصد پر خرچ فرمائی تھیں۔ کس طرح حوصلہ دیتی تھیں، ڈھال بنتی تھیں۔ ساری عورتیں ایسی نہیں ہوتیں اور جو ہوتی ہیں' وہ کمال ہوتی ہیں! عباس صاحب بے مقصد ہی جیے جارہے تھے۔

سامنے ہی عائشہ نئی پڑوسی چلی آرہی تھیں سامنے والا ''ولا'' انہوں نے ہی خریدا تھا۔

''السلام علیکم!'' ان بیوہ خاتون میں الگ طرح کا سلیقہ تھا، جمے ہوئے بال سفید لباس اور چہرہ صاف شفاف باتوں باتوں میں پتا چلا کہ یہ ''ولا'' ان کی

ملکیت نہیں ہے بلکہ ان کے بھتیجے کا ہے انہوں نے بس رہائش کے لیے لیا ہے' ایک آدھ بار گھر آئیں تو لگا جیسے دنیا "باغ و بہار" ہو گئی ہو۔ دھیما لہجہ اور رکھ رکھاؤ۔"

"کیا خاتون ہیں قسمت والوں کو ملتی ہیں ایسی خواتین۔" انہوں نے مکدر دل کے ساتھ حمدہ کو دیکھ کر سوچا۔

"عائشہ کافی سمجھ دار خاتون ہیں۔" اتنا بولنا تھا کہ بم پھوٹ گیا جسے سارا ملبہ ان پر گر چکا تھا۔ دھول ہی دھول مٹی ہی مٹی۔

"کیا دیکھ لیا اس ٹکے ٹکے کی محتاج عورت میں' جو لگے ہیں تعریفوں کے پل "باندھنے"

مسز حمدہ نے اسکول کی طرز کی ہی تقریر کی اور غصیلی نگاہوں سے عباس صاحب کو گھورنے لگیں جیسے اپنی غلطی مان لو ورنہ تمہیں اسکول سے بے دخل بھی کیا جا سکتا ہے، تمہیں تمہارا کریکٹر سرٹیفکیٹ بھی خراب ہی ملے گا وغیرہ وغیرہ۔ عباس کا نشہ ہرن نہیں ہوا دو آتشہ ہو گیا تھا۔

وہ گھر سے کافی حد تک غافل ہو گئے تھے دھیان تو پہلے بھی حمدہ نہ دیتی تھیں اب بھی نہ دیا تھا پھر چکر پر چکر اور ادائیں عجیب سی ہو گئیں تو انہیں دھیان دینا پڑا تھا۔

انہوں نے پاؤں اٹھا کر سیدھا گردن پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اب عائشہ بی بی کے اردگرد نہ دیکھوں۔"

ان کے لہجے میں ذاتی کمائی کا غرور بول رہا تھا۔ یعنی خرچا کھانا بند ہو جائے گا۔

"آپ اپنا خرچا پانی اپنے پاس رکھیں میں معمولی کماؤں گا مگر رہوں گا اپنی مسز کے ساتھ، حمدہ! میں نے عائشہ سے نکاح کر لیا ہے۔ وہ ایسی عورت ہے جو میری محتاج رہے گی اور میں اس کی محبت کا محتاج رہوں گا۔ بس یہی کافی ہو گا میرے لیے۔"

ان کے لہجے میں سکون تھا۔

"بچوں کو میرے خلاف کرنا ہو تو کر لیجیے گا۔ وہ میرے حال سے واقف ہیں اعتراض کریں بھی تو کوئی مسئلہ نہیں، وہ اپنے اخراجات کے لیے آپ کے محتاج ہیں میرے نہیں۔"

اتنا صاف عباس صاحب پہلی بار بولے تھے حمدہ حیران رہ گئی تھیں' وہ تو "کامیاب عورت" تھیں ناکام کیسے ہو گئیں اور عباس صاحب جاتے ہوئے سوچ رہے تھے۔

"کامیاب عورت تو وہ ہے جس نے اپنی محبت میرے نام کر دی' مجھے کچھ جتایا نہیں اور ناکام "عورت حمدہ" ہے جس نے محبت کرنا سیکھا ہی نہیں۔ وہ پیسوں کے حساب سے کامیاب ہو گی محبت میں نہیں۔"

☆☆

نگہت سیما

ماء الملوک

لاہور کے ذکی دروازے کی سمت بہت شان دار حویلیاں تھیں ان میں سے ایک مرزا جہاں زیب کے دادا مرزا ہمایوں بیگ نے بنوائی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں جدید تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں کی گئی تھیں۔

مرزا جہاں زیب اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھے اللہ نے انہیں چار بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا تھا۔ بیٹوں، بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ اوپر والی منزل میں اورنگ زیب بیگ اور ارباب بیگ رہائش پذیر تھے جب کہ خود جہاں زیب بیگ گراؤنڈ فلور پر دونوں چھوٹے بیٹوں شاہ زیب اور ظفریاب کے ساتھ رہتے تھے۔

اورنگ زیب کی دو بیٹیاں دو بیٹے تھے۔ ارباب بیگ کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔

ظفریاب کا بیٹا آزین اور شاہ زیب بیگ کی بیٹی زہل کا نکاح ہو چکا تھا۔

شاہ زیب بیوی کے مرنے کے بعد گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ظفریاب کچھ سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے گرفتار ہو گئے تھے، وہ بہت برا وقت تھا، نہ جانے کیا ہوا کہ ان کی بیوی نے ان کے واپس آنے کے بعد طلاق لے لی۔ ظفریاب دوسری شادی کر کے ملک سے باہر چلے گئے۔

ابرار شاہ ایک بڑے وڈیرے اور سیاست دان کا بیٹا تھا جو صبوحی سے یونی ورسٹی کے زمانے سے محبت کرتا تھا جبکہ وہ شادی شدہ تھا اور اس کے دو بچے تھے۔ ظفریاب سیاسی ہنگاموں میں غائب ہوئے تو صبوحی ان کو تلاش کرتے ابرار شاہ سے ملتی ہیں وہ ظفریاب کی رہائی کے بدلے صبوحی سے شادی کرنا چاہتے تھے وہ راضی ہو جاتی ہیں یوں ظفریاب کی رہائی اور تندرستی کے بعد وہ طلاق لے لیتی ہیں اور ابرار شاہ سے شادی کر کے یوکے چلی جاتی ہیں۔

سمیرا ابرار شاہ کی پہلی بیوی کی بیٹی ہے جو بدلہ لینے کی خواہش میں زین اور زہل کے بیچ دراڑیں ڈالتی ہے وجدان کو سمیرا کی یہ حرکتیں ناگوار گزرتی ہیں۔ زہل اختر بانو کے پاس نومان کی شادی کے سلسلے میں جاتی ہے۔ منیرہ کے گھر جاتے ہوئے رستے میں زہل کو اغوا کر لیا جاتا ہے چراغ سائیں اس کی اطلاع اختر بانو کو دیتے ہیں وہ پہلے ہی دل کے عارضے میں مبتلا ہانپی کانپتی ڈیرے پر آتی ہیں اور جذبات میں شایان کا سچ نکل جاتا ہے کہ وہ ان کا خون ہے۔ شایان اور زہل کے لیے یہ انکشاف حیران کن تھا۔ شایان ثمرہ سے اس بابت پوچھ گچھ کرتا ہے اور وہ خوب روتی چلاتی ہے۔ چراغ سائیں کا انتقال ہو جاتا ہے حویلی سے اس کا جنازہ اٹھایا جاتا ہے۔

زہل کو لینے مرتضیٰ آتا ہے شاہ زیب بیگ نارمل ہو رہے ہیں۔

بیسویں قسط

وہ کچھ دیر یوں ہی خالی الذہن کھڑی بی بی اماں کو پھرتی سے کام کرتے ہوئے دیکھتی رہی پھر کچن سے نکل کر ہولے ہولے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور بیڈ پر لیٹتے ہوئے آنکھیں موند لیں، پپوٹے

بھاری ہو رہے تھے اور ذہن تھکا تھکا سا۔ رونے سے آنکھوں اور سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلیوں سے پیشانی اور کنپٹیوں

کو ہولے ہولے دباتے ہوئے اس نے سوچا۔
''پتا نہیں زین نے دادا جان کو کیا کہا ہوگا۔ کیا اس نے دادا جان کی بات مان لی ہوگی اور کیا جانے

سے پہلے......لیکن نہیں اس نے یقیناً دادا جان کو منع کر دیا ہوگا اور ضرور کوئی مضبوط جواز بھی دے دیا ہوگا اگر اسے رخصتی کروانی ہوتی تو پہلے ہی اس کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد کروا چکا ہوتا تو کیا کہا ہوگا اس نے دادا جان سے۔ کیا وہ اس بندھن کو ختم کرنا چاہتا ہے۔'' وہ یکدم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''نہیں۔'' اس نے نفی میں ـــــ سر ہلایا۔ نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر اس نے ایسا کیا تو ......''نہیں۔'' وہ یکدم بے حد بے چین ہو گئی۔

''نہیں۔ میں دادا جان سے کہہ دوں گی۔ بھلے وہ ساری زندگی رخصتی نہ کروائے لیکن اس کا غذی تعلق کو جڑا رہنے دے۔ مجھے یہ بندھن کبھی ختم نہیں کرنا کبھی نہیں۔ میں زندگی کی آخری سانس تک یہ تعلق جڑا دیکھنا چاہتی ہوں۔'' وہ کچھ دیر یوں ہی بے چینی سے نچلا ہونٹ دانتوں تلے کچلتی رہی، دل سینے کے اندر ماہی بے آب سا تڑپتا تھا۔ کیا کرے کہ کوئی خیال کوئی سوچ نہ آئے۔ اضطراب سے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز کی طرف دیکھا۔

چند دن پہلے اس نے مہرین سے نیند نہ آنے اور بے چینی کی بات کی تھی تو مہرین نے اسے دو ایم جی کی گولیاں دی تھیں کہ آدھی یا چوتھائی گولی کھا لینا سکون ملے گا۔ اس نے بس دو تین بار ہی ایک چوتھائی گولی کھائی تھی لیکن اس وقت جس اذیت سے وہ گزر رہی تھی اس میں نیند آنا مشکل تھی اور اسے سکون چاہیے تھا، اس نے آدھی گولی لے لی اور سونے کی کوشش کرنے لگی، پھر زین، صبوحی چچی، ابا، مہرین، شانزے سب کے متعلق سوچتے سوچتے کچھ دیر بعد وہ سو گئی۔ مہرین نے کہا تھا کہ دماغ پرسکون ہو جائے گا اور ہلکی نیند آ جائے گی۔ لیکن اس پر پہلے بھی بہت اثر ہوا تھا اور آج بھی وہ دیر تک سوتی رہی تھی۔

بی بی اماں دوبارا اسے بلانے آئی تھیں لیکن وہ اچھا آتی ہوں اٹھتی ہوں کہہ کر پھر سو گئی تھی۔

''چلو سوتی رہے۔'' بی بی اماں نے سوچا پتا نہیں کتنی راتوں کی جاگی ہے۔ زین کے جانے سے وہ اتنی پریشان تھیں تو زنل کتنی پریشان ہو گی۔ انہوں نے کھانے کے لیے بھی اسے نہیں اٹھایا تھا لیکن جب عصر کی اذان ہو رہی تھی تب وہ پھر اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ ان کی ایک ہی آواز پر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''آج خوب سوئیں۔''

بی بی اماں اسے دیکھ کر مسکرائیں تو اس کی نظر بے اختیار سامنے دیوار پر لگے کلاک کی طرف اٹھی۔

''اوہ اتنی دیر ہو گئی۔ آپ جگا دیتیں مجھے۔ ظہر بھی قضا ہو گئی۔'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

''آئی تھی جگانے لیکن تم اتنی گہری نیند سو رہی تھیں کہ جی نہیں چاہا جگانے کو۔ رات بھر نہیں سوئی ہو تم، جانتی ہوں اور اس رات سے پہلے بھی جانے ٹھیک سے سوتی ہو گی یا نہیں۔''

انہوں نے محبت و شفقت سے اسے دیکھا۔

''عصر کی نماز پڑھ کر اپنے ابا کے کمرے میں ہی آ جانا۔ تمہارے بڑے تایا اور دادا جان شاہ زیب کے کمرے میں ہی ہیں۔''

''ابا تو ٹھیک ہیں نا۔'' وہ گھبرا گئی تھی کہ تایا جان بہت کم ہی ابا کے پاس آ کر بیٹھتے تھے۔

''ہاں اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہیں۔ بڑے صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ تمہارے تایا بڑے صاحب سے ہی ملنے آئے تھے لیکن وہ شاہ زیب کے کمرے میں تھے تو ادھر ہی چلے گئے۔''

بی بی اماں کی بات سن کر اس نے اطمینان بھری سانس لی۔

''نماز پڑھ کر میں چائے ادھر زیب کے کمرے میں ہی لے جاؤں گی۔''

بی بی اماں کہہ کر چلی گئیں وہ بھی نماز پڑھ کر شاہ زیب کے کمرے میں جانے کے لیے اپنے کمرے سے نکلی تو ساجدہ صحن میں کرسیاں رکھ رہی تھی۔

''تو آج زین کے دوست اس کے جانے سے

پہلے اسے ملنے اور خدا حافظ کہنے آ رہے ہیں۔ بی بی اماں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر وہ شاہ زیب بیگ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور پھر دروازہ کھولتے ہی ٹھٹک کر رک گئی اور مبہوت سی ہو کر شاہ زیب کو دیکھنے لگی۔ وہ نہ جانے کس بات پر ہنس رہے تھے۔ تایا جان کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی دادا جان کی آنکھوں میں نمی سی تھی اور لبوں پر مدھم مسکراہٹ اس نے نہ جانے کتنے عرصہ بعد ابا کو اس طرح ہنستے دیکھا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس نے سب کو مشترکہ سلام کیا۔

"وعلیکم السلام بیٹا۔" دادا جان نے سلام کا جواب دیتے ہوئے مڑ کر اسے دیکھا۔

"آؤ۔ آ جاؤ بیٹی۔" وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی شاہ زیب کے پاس ان کے بیڈ پر ہی بیٹھ گئی تھی۔

"آپ ہنستے ہوئے بہت اچھے لگ رہے تھے ابا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہنسی کی کرنیں آپ کی آنکھوں سے بھی پھوٹ رہی ہوں۔"

بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا اور شاہ زیب چونک کر اسے دیکھنے لگے تھے۔ ذہن کے اندر کہیں کچھ کلک ہوا تھا۔ اور کوئی جملہ ذہن کی سطح سے ٹکرایا تھا۔ "آپ ہنستے ہوئے بہت اچھے لگتے ہیں۔ جی چاہتا ہے آپ ہنستے رہیں اور میں آپ کو دیکھتی رہوں۔" ان کے لب بھنچ گئے۔ پیشانی پر لکیریں پڑ گئیں۔ آنکھوں کے سامنے دھندلے دھندلے سے مناظر بننے اور مٹنے لگے تو انہوں نے سر کو دو تین بار جھٹکا۔

"کیا ہوا زیبی۔" جہاں زیب بیگ کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"تم ٹھیک ہو نا۔" اورنگ زیب بیگ بھی پریشانی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"ہاں......" وہ چونک کر اورنگ زیب بیگ کو دیکھنے لگے۔ دھندلی تصویریں اور منظر معدوم ہو گئے۔ لبوں پر پھر مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی تھی۔

"آپ کس بات پر ہنس رہے تھے۔ کیا تایا جان نے کوئی لطیفہ سنایا تھا۔" زل کا دل انہیں مسکراتے دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔

"لطیفہ ہی سمجھ لو۔" اورنگ زیب بیگ نے مسکرا کر شاہ زیب کو دیکھا۔ "اس کے بچپن کا ایک واقعہ یاد آ گیا تھا۔ چھوٹا سا تھا یہ تب۔ پانچ چھ سال کا۔ باہر گلی میں ایک گدھا گاڑی والا اپنے گدھے کو مار رہا تھا کہ وہ عین گلی کے درمیان میں اکڑا کھڑا تھا کہ مار کھانے کے باوجود ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا رہا تھا شاید بوجھ زیادہ تھا۔ یہ یکدم میری انگلی چھوڑ کر گدھا گاڑی کے مالک کی طرف بھاگ کر گیا اور اسے مکے مارنے لگا۔ میں چند لمحوں کے لیے تو حیرت زدہ سا اسے دیکھنے لگا جو مکے مارتے ہوئے اسے کہہ رہا تھا کہ "مت مارو اسے۔" گدھا گاڑی والا جو پہلے ہی تپا ہوا تھا چڑ کر بولا تھا۔

"تمہیں کیا تکلیف ہے، کیوں نہ ماروں۔" ساتھ ہی اس نے بازو سے پکڑ کر اسے پیچھے ہٹایا۔

"کیا لگتا ہے تمہارا۔"

"میرا بھائی ہے یہ مت مارو اسے۔" اور اس کی بات سن کر گدھا گاڑی کا مالک ہنس پڑا تھا۔

"اچھا تمہارا بھائی ہے تو اس سے کہو کہ نخرے نہ دکھائے مجھے اور پھیرا ابھی لے کر جانا ہے۔"

اور یہ حضرت گدھے کے جسم پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرتے ہوئے سمجھانے لگے گدھے بھائی بری بات ہے ضد نہیں کرتے۔

اب پتا نہیں اس گدھے نے اس کی بات مان کر ضد چھوڑی تھی یا گاڑی بان کو دوبارا چابک لہراتے دیکھ کر۔ بہرحال اصل تماشا تو پھر واپس گھر آ کر لگا تھا جب میں نے ساری بات بتائی تو باقی سب تو ہنسنے لگے لیکن ظفریاب غصے سے لال پیلے ہو کر نتھنے پھلائے صحن میں چک پھیریاں لگانے لگے کہ زیبی نے گدھے کو بھائی کہہ کر ان کی بے عزتی کر دی ہے۔" شاہ زیب کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی

تھی۔

''آپ کو یہ واقعہ یاد تھا ابا۔'' زل نے پوچھا تو وہ اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''اتنی چھوٹی عمر کی بات یاد نہیں رہتی لیکن بھائی جان اور ظفر بھائی اکثر گدھے کو میرا بھائی کہہ کر مجھے چھیڑتے تھے اس لیے یادداشت سے یہ واقعہ محو نہیں ہوا۔''

وہ بالکل کسی نارمل انسان کی طرح بات کررہے تھے کیا ابا بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں۔ زل نے اپنے اندر خوشی کے پھول کھلتے اور چہکتے محسوس کیے اس وقت وہ اپنی اذیت بھول کر پرمسرت نظروں سے شاہ زیب بیگ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کتنے سال ہو گئے تھے اسے ابا کے لیے دعائیں کرتے۔ کتنی خواہش تھی کہ ابا اس سے ڈھیر ساری باتیں کیا کریں اور وہ بھی اپنے دل کی ہر بات انہیں بتایا کرے ان سے ایسے ہی لاڈ کیا کرے جیسے بیٹیاں باپ سے کرتی ہیں جیسے سحرش ارباب تایا سے کرتی ہے۔ وہ ان سے فرمائشیں کرے اور ابا اس کی فرمائشیں پوری کریں۔

''ابا۔'' اس نے شاہ زیب کے بازو پر ہاتھ رکھا تب ہی اورنگ زیب بیگ نے کھڑے ہوتے ہوئے جہاں زیب بیگ سے پوچھا۔

''تو ابا جان آپ کب جائیں گے راجہ صاحب کی طرف۔''

''میرے خیال میں راجہ صاحب سے بات کرنے سے پہلے ایک بار پھر ہم خود جا کر عقیل کے والد سے بات نہ کریں بلکہ عقیل کے تایا چچا سے بات کریں وہ معقول آدمی لگے تھے مجھے۔''

جہاں زیب بیگ نے سوالیہ نظروں سے اورنگ زیب بیگ کی طرف دیکھا۔

شانزہ عدالت میں نہیں جانا چاہتی تھی خلع کے لیے جب کہ عقیل نے اسے طلاق دینے سے انکار کر دیا تھا اور سب چاہتے تھے کہ عقیل سے طلاق لے کر شانزہ کا گھر دوبارا بسایا جائے۔ اورنگ زیب اسی لیے جہاں زیب بیگ سے بات کرنے آئے تھے کہ انہیں پتا چلا تھا کہ جہاں زیب بیگ کے دوست راجہ صاحب کے عقیل کے خاندان سے اچھے مراسم ہیں۔

''آپ جو مناسب سمجھیں ابا جان ایک بار مل کر دیکھ لیں۔ لیکن میرا نہیں خیال کہ عقیل باپ یا چچا کی بات مان لے گا۔ میں نے خود فون کیا تھا اسے کہ اب جب وہ اپنی دوسری بیوی کو گھر لا چکا ہے تو وہ شانزہ کو طلاق دے دے۔ لیکن اس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ کبھی عمر بھر طلاق نہیں دے گا۔ بہت شوق ہے طلاق لینے کا تو عدالت میں چلے جائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ صرف شانزہ کو اذیت دینا چاہتا ہے۔ اور عدالت جانے کا بھی اس لیے کہہ رہا ہے کہ وہاں وہ اس پر جھوٹے الزام لگا سکے۔ اس کے کردار پر کیچڑ اچھالے۔''

ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

''کیسے نہیں دے گا طلاق۔'' شاہ زیب بیگ کا چہرہ یکدم سرخ ہوا تھا۔

''میں خود کل جاؤں گا ابا جان کے ساتھ۔ دیکھ لوں گا سب کو۔'' جہاں زیب بیگ نے شاہ زیب کی طرف دیکھا تو دل کے اندر خوشی کے کئی شگوفے پھوٹے۔ یہ تو وہی پرانا شاہ زیب تھا۔ وہی غصہ، وہی رعب اور تنتنا۔ جب بھی اختر بانو کے حوالے سے گھر میں کوئی بات ہوتی تھی کہ وہ میکے نہیں آتی تو وہ یوں ہی غصے سے لال پیلا ہو جاتا تھا۔

''ہاں ٹھیک ہے کل تم میرے ساتھ ہی چلنا شانزہ کے سسرال، عقیل کے والد سے بات کر کے دیکھیں گے۔ جب بات نہ بنی تو راجہ صاحب سے دباؤ ڈلوالیں گے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے ایسے گھٹیا لوگوں سے رشتہ جوڑا ہی کیوں۔ مجھ سے بھی مشورہ نہیں کیا ورنہ میں ان کے متعلق ساری تحقیق کروا لیتا۔''

شاہ زیب نے شاکی نظروں سے اورنگ زیب بیگ کی طرف دیکھا۔ وہ جنہوں نے ایک مدت سے چپ کی چادر اوڑھ رکھی تھی اردگرد سے بے خبر اور

بیگانہ اپنے آپ میں ہی گم رہتے تھے۔ پچھلے دو تین ماہ سے اب اپنے آس پاس ہونے والی باتوں کو توجہ سے سنتے تھے اور بات چیت بھی کرنے لگے تھے۔ اب بھی جب اورنگ زیب بیگ نے ان کی موجودگی میں ہی ساری بات کی تھی تو انہوں نے بہت دھیان سے سب سنا تھا۔ گو وہ یہ سمجھ نہیں پائے تھے کہ شانزہ طلاق کیوں لینا چاہتی ہے۔ لیکن اتنا سمجھ گئے تھے کہ شانزہ کے شوہر نے دوسری شادی کر لی ہے۔

"ہمارے نصیب خراب تھے یار۔ اب کیا کہیں۔" اورنگ زیب بیگ نے ایک گہری سانس لی۔

"خیر جو ہوا آپ پریشان نہ ہوں میں دیکھ لوں گا سب کو۔ سیدھی طرح بات نہ مانی تو انگلیاں ٹیڑھی کرنا بھی آتا ہے۔ سب کو جیل میں ڈلوا دوں گا۔" ان کی آنکھوں میں سرخی تھی۔

"تم ٹینشن مت لو زیبی ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اورنگ زیب بیگ نے ان کے کندھے کو ہولے سے تھپتھپایا۔ شاہ زیب کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرتے دیکھ کر وہ گھبرا گئے تھے کہ کہیں ان کی طبیعت خراب نہ ہو جائے۔ ڈاکٹر ارسلان کے علاج سے ان میں بہت بہتری آئی تھی لیکن ڈاکٹر ارسلان نے تاکید کی تھی کہ ان کے سامنے ایسی بات نہ کی جائے جس سے وہ اسٹریس لیں۔ وہ جانتے تھے کہ صبح تک وہ سب بھول چکے ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ شاہ زیب کچھ کہتے بی بی اماں چائے لے آئیں۔

"اے میاں کہاں جا رہے ہیں آپ۔ بیٹھ جائیں اب چائے پی کر ہی جائیں۔"

"کارخانے سے سیدھا ادھر ہی آ گیا تھا ابا جان کی طرف اب گھر جا کر ہی چائے پیوں گا۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے تو سوچا اب اوپر ہی جا کر چائے پی لیں گے۔

"گھر کہیں بھاگا نہیں جا رہا میاں بیٹھ جائیں۔ آپ کی پسند کے شامی کباب ہیں۔ یاد ہے نا کتنے پسند تھے آپ کو آپا جان سے فرمائشیں کر کے بنواتے تھے۔" بی بی اماں نے ان کی والدہ جہاں آرا کا ذکر کیا۔

"اور آپا جان نے کبھی آپ کی فرمائش نہیں ٹالی تھی۔" اورنگ زیب بیگ کبھی کبھار ہی اتنی دیر بیٹھتے تھے۔ کارخانے سے تھکے ہوئے آتے تھے تو جلد از جلد اپنے کمرے میں جا کر آرام کرنے کی خواہش ہوتی تھی لیکن آج بی بی اماں کے کہنے پر رک گئے تھے ورنہ گھڑی دو گھڑی جہاں زیب بیگ سے بات کر کے چلے جاتے تھے۔ بی بی اماں نے ٹرالی سے پلیٹ اٹھا کر ان کی طرف بڑھائی۔

"اللہ پر بھروسا رکھیں میاں! جو اللہ انسان کو آزمائش میں ڈالتا ہے وہی اس آزمائش سے نکالتا بھی ہے۔ اسی سے دعا کیا کریں۔ وہی آسانیاں پیدا کرے گا۔ ان شاء اللہ ہماری شانزہ کو اللہ بہترین نعم البدل عطا کرے گا۔"

بی بی اماں بچپن سے ہی اورنگ زیب بیگ کو میاں جی کہتی تھیں جو عمر بڑھنے کے ساتھ اب صرف میاں رہ گیا تھا کہ انہیں لگتا تھا جیسے وہ چاروں بھائیوں کی بڑی ہیں۔ جہاں آرا نہیں تھیں تو ان کی ذمہ داریاں انہوں نے سنبھال رکھی تھیں۔ سب کا ہی انہیں خیال رہتا تھا۔

"آپ میرے بچوں کے لیے دعا کیا کریں۔" اورنگ زیب بیگ نے ایک شامی کباب اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھا۔

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے میاں! میں تو سب بچوں کے لیے اٹھتے بیٹھتے دعا کرتی ہوں۔"

انہوں نے سب کو ہی پلیٹیں پکڑائیں۔ جہاں زیب بیگ جو شام کے وقت چائے کے ساتھ کچھ نہیں لیتے تھے انہوں نے بھی ایک کباب پلیٹ میں رکھا۔

"زل تم سب کے لیے چائے بنا دینا۔ اسد اور مرسل بھی زین کے پاس آئے ہوئے ہیں۔ انہیں اور شیخو کو بھی چائے بھجوانی ہے۔ ساجدہ کو بلوا رکھا ہے میں نے اسی کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔"

بی بی اماں کا دھیان سب کی طرف ہی رہتا تھا۔ یہ نہیں ہوتا تھا کہ اپنی مصروفیت میں وہ کسی کو بھول جائیں۔

''جی بی بی اماں' میں بنا دوں گی۔'' زنل اٹھ کر چائے بنانے لگی تھی۔ شاہ زیب بیگ نے چونکہ کچھ بھی کھانے سے انکار کر دیا تھا اس لیے اس نے پہلے انہیں چائے بنا کر دی پھر دادا جان اور اورنگ زیب کو چائے دے کر واپس شاہ زیب کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

''تم نے خود کچھ نہیں لیا اور نہ ہی چائے بنائی ہے اپنے لیے۔'' جہاں زیب بیگ نے پوچھا تو وہ مدھم سا مسکرائی۔

''اس وقت جی نہیں چاہ رہا دادا جان۔''

گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے شاہ زیب بغور اسے دیکھ رہے تھے۔

''ابا جان یہ زنل اتنی جلدی کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ ابھی کل تک تو یہ چھوٹی سی تھی۔'' ان کی آنکھوں میں تحیر تھا اور وہ جہاں زیب بیگ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''لڑکیاں تو یوں ہی ککڑی کی بیل کی طرح بڑھتی ہیں۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ کب اتنی بڑی ہو گئیں کہ رخصتی کی گھڑی آ گئی ابھی تو ہماری انگلی پکڑ کر چلنا سیکھ رہی تھیں اور ابھی ایک پورے گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل ہو گئیں۔'' انہیں اختر بانو کا خیال آ گیا تھا اور آنکھوں میں نمی سی پھیل گئی تھی۔

''اچھا ابا جان میں چلتا ہوں۔ آج میں اور شاہ رخ ہی تھے کارخانے میں۔ ارباب آج کسی کام سے فیصل آباد گیا ہوا تھا۔ بہت بڑا آرڈر تھا۔ مال بھجوانا تھا تھک گیا ہوں۔ اسی لیے جلدی چلا آیا تھا کہ کچھ دیر آرام کروں گا شاہ رخ تو ابھی کارخانے میں ہی تھا۔''

اورنگ زیب خالی کپ ٹرے میں رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''یہ ارباب مرتضٰی کو کیوں نہیں کہتا کہ وہ بھی کارخانے میں ہاتھ بٹائے اس کا۔''

''بہت بار کہا ہے اس نے لیکن وہ ہی نہیں سنتا۔ پتا نہیں کیا ارادے ہیں اس کے۔ ارے بھئی کارخانے میں نہیں آنا تو کہیں نوکری کر لو۔ آخر زین بھی تو جاب کر ہی رہا ہے نا لیکن نہیں جی ان کو تو بزنس کرنا ہے اور وہ بھی کوئی چھوٹا موٹا نہیں۔ بڑا بزنس۔ ارباب بے چارہ تو سمجھا سمجھا کر تھک گیا ہے اب آپ ہی بات کریں اس سے کہ عقل کے ناخن لے۔ ایسے ویلے نکمے کو کسی نے رشتہ بھی نہیں دینا۔ گھر کی بات اور تھی۔''

اگرچہ مہرین کا رشتہ ریحان سے ہو گیا تھا اور ریحان ہر لحاظ سے مرتضٰی سے بہتر تھا لیکن شاید دل میں ابھی بھی ایک افسوس تھا کہ ہمیشہ سے انہوں نے یہ ہی سوچا تھا کہ مرتضٰی اور مہرین سو بے اختیار ہی مرتضٰی کے متعلق اتنا کچھ کہہ گئے تھے۔

''میں بات کروں گا مرتضٰی سے کہ وقت ضائع نہ کرے۔ پوچھوں گا کہ کیا چاہتا ہے۔''

جہاں زیب بیگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''جی ابا جان! ارباب بہت پریشان رہتا ہے اس کی اس لاابالی اور غیر ذمہ دارانہ طبیعت سے۔ کیا پتا آپ کی بات سمجھ لے تو اس کی بھی پریشانی کم ہو۔'' اورنگ زیب بیگ نے قدم باہر کی طرف بڑھائے تو جہاں زیب بیگ نے شاہ زیب کی طرف دیکھا۔

''مجھے کچھ تھکن سی محسوس ہو رہی ہے بیٹا۔ کچھ دیر جا کر لیٹوں گا پھر مغرب کی نماز مسجد میں پڑھ کر راجہ صاحب کی طرف جاؤں گا بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی ان سے۔ تم بھی کچھ دیر آرام کر لو۔''

''نہیں۔'' شاہ زیب بیگ مسکرائے۔

''میں کچھ دیر اپنی بیٹی سے باتیں کروں گا۔''

اور زنل کا دل پھول کی طرح کھل اٹھا تھا کتنی حسرت تھی اسے کہ ابا اسے اپنے پاس بٹھا کر باتیں کیا کریں۔ اس کے دل کی باتیں پوچھیں۔ اس کی دلچسپیاں اس کے شوق۔

''ٹھیک ہے تم باپ بیٹی باتیں کرو میں ساجدہ کو بھیج دیتا ہوں۔ وہ یہ لے جاتی ہے۔'' انہوں نے

ٹرالی کی طرف اشارہ کیا اور مسکرا کر انہیں دیکھتے ہوئے چلے گئے۔

"میں اپنی جاب کی مصروفیت میں تمہیں وقت نہیں دے سکا۔ حالانکہ مریم کے بعد تمہیں میری ضرورت تھی، مجھے معاف کر دینا میں تمہارا خیال نہیں رکھ سکا۔ ناراض مت ہونا۔"

"ابا کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" زل نے بے اختیار ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔

"میں بھلا آپ سے کیوں ناراض ہوں گی۔ مجھے پتا تھا آپ کی مصروفیات کا۔"

"تم بالکل مریم جیسی ہو۔ ویسی ہی صابر، متحمل مزاج اور نرم دل۔ وہ بھی کبھی مجھ سے ناراض نہیں ہوتی تھی۔ ہمیشہ میری مجبوریوں کو سمجھتی تھی۔ مجھے جب اس کے ساتھ ہونا چاہیے تھا میں اس وقت بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ جب ابا جان نے بتایا مریم بہت بیمار ہے۔ ہاسپٹل میں ہے تو میں ایک اہم مشن پر تھا۔ فوراً آ نہیں سکا۔ جب آیا تو اس کے پاس بہت تھوڑا سا وقت رہ گیا تھا بس چند گھنٹے۔"

وہ ہولے ہولے ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے اور زل بہت دھیان سے انہیں سن رہی تھی۔

"اس روز جب میں ہاسپٹل پہنچا تھا تو کیا ہوا تھا۔" وہ سوالیہ نظروں سے زل کو دیکھ رہے تھے ان کی آنکھوں میں الجھن تھی جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"ابا جان نے کہا تھا۔ زیبی مریم جا رہی ہے ڈاکٹر کہتے ہیں زیادہ سے زیادہ ایک دن یا دو دن۔ اور جب میں نے آ ئی۔ جی صاحب کو ابا جان کے فون کے متعلق بتایا تو انہوں نے جو کام میرے ذمے لگایا تھا وہ کسی اور کے ذمے لگایا اور میں لاہور آ گیا۔ وہاں ہاسپٹل میں کچھ غلط ہو گیا تھا۔ کچھ اور بھی غلط ہو گیا تھا زل۔

میں مریم کے پاس اس کا ہاتھ پکڑے بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی اسے کچھ نہیں ہوگا۔ میں اسے باہر لے جاؤں گا۔ انگلینڈ، امریکہ جہاں بھی ممکن ہوا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ مجھ سے تمہارے متعلق کچھ کہہ رہی تھی۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ وہ اسے ایمرجنسی میں لے گئے اور میں باہر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ میرے اندر بہت سارے پچھتاوے تھے۔ میں نے وہ سارا وقت گنوا دیا تھا جو مجھے مریم کے ساتھ گزارنا تھا۔ اگر وہ میرے ساتھ رہتی تو شاید بیمار نہ ہوتی۔ میں سوچ رہا تھا۔ میں گھبرا کر باہر نکلا تھا ابا جان اور ظفر بھائی پتا نہیں کہاں تھے۔ اور تم کہاں تھیں، تمہیں تو اس وقت اپنی ماں کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ میں انہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ مریم چلی گئی لیکن صرف مریم ہی تو نہیں گئی تھی کچھ اور بھی ہوا تھا کچھ بہت غلط ہوا تھا لیکن کیا ہوا تھا یاد نہیں آتا۔ میں بہت ساری باتیں بھول گیا ہوں۔ یاد کرتا ہوں یاد نہیں آتیں۔" آنکھوں سے کرب جھلکنے لگا تھا۔

"آپ ذہن پر زور نہ دیں ابا۔ آپ بیمار ہو گئے تھے اس لیے کچھ باتیں بھول گئی ہیں آپ کو لیکن اب آپ ٹھیک ہو گئے ہیں تو یاد آ جائیں گی سب باتیں۔" زل نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

"ہاں اب تو میں ٹھیک ہوں۔" انہوں نے سر سے پاؤں تک اپنا جائزہ لیا۔

"میری صحت تو بہت اچھی ہے پھر پتا نہیں یاد کیوں نہیں آتا اس روز اور کیا ہوا تھا۔ کچھ بہت ہی غلط بہت ہی تکلیف دہ۔ کیا تمہیں کچھ پتا ہے اس روز وہاں ہاسپٹل میں کیا حادثہ ہوا تھا۔" وہ ایک بار پھر زل کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔

"مجھے نہیں پتا اس روز کیا ہوا تھا۔ مجھے بی بی اماں اور دادی جان کو ظفر چچا نے گھر بھیج دیا تھا تایا جان کے ساتھ۔"

غیر ارادی طور پر زل کی گرفت شاہ زیب بیگ کے ہاتھ پر مضبوط ہوئی تھی۔ مریم کی موت سے بڑھ کر اور کیا حادثہ ہو سکتا تھا۔ دادا جان صحیح ہی کہتے ہیں شاید میرے زیبی کو مریم کی موت کا دکھ کھا رہا ہے۔ پچھتاووں نے اسے چپ اوڑھا دی ہے۔

”اگر کوئی اور حادثہ ہوا ہوتا تو دادا جان کو علم ہوتا وہ کبھی تو اس کا ذکر کرتے آپ پلیز زیادہ نہ سوچیں۔“

”نہیں۔“ انہوں نے زنل کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑا کر شہادت کی انگلی اٹھائی۔

”وہ حادثہ میرے ساتھ ہوا تھا وہ جو کچھ غلط ہوا تھا میرے ساتھ ہوا تھا۔ کچھ حادثوں کی خبر خود کو ہوتی ہے صرف خود کو لیکن مجھے یاد کیوں نہیں آ تا زنل کیا ہوا تھا۔“ انہوں نے بے بسی سے مٹھیاں بھینچیں۔ پیشانی کی رگیں ابھر آئی تھیں، آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں۔ ”کچھ بہت غلط ہو گیا تھا میرے ساتھ جیسے کسی نے روشنی میں چلتے چلتے یکدم اندھیروں میں دھکیل دیا ہو گہرے اندھیرے جن میں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں ان اندھیروں میں بھٹک گیا تھا راستے اندھے تھے اور مجھے راستہ نہیں ملتا تھا۔“

انہوں نے وحشت بھری نظروں سے زنل کی طرف دیکھا جیسے اب بھی اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوں۔ آنکھوں کے سامنے دھندلے دھندلے سائے تھے جو بنتے اور گڈمڈ ہو جاتے تھے۔

وہ ہاسپٹل کے کوریڈور میں کھڑے تھے۔ انہیں مریم کی طرف جانا تھا جسے ایمرجنسی سے آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ وہ یہ چند گھنٹے مریم کے ساتھ گزارنا چاہتے تھے کہ ارباب بھائی ابھی ابھی انہیں بتا کر گئے تھے کہ چند گھنٹے بس زیادہ سے زیادہ چند گھنٹے ڈاکٹر یہ ہی کہتے ہیں۔ مریم جس کی ساڑھے تیرہ سالہ رفاقت میں انہوں نے بہت کم وقت اس کے ساتھ گزارا تھا انہیں مریم سے معافی مانگنی تھی اپنی کوتاہیوں کی۔ وہ ان مشکل لمحوں میں اس کے پاس رہنا چاہتے تھے اور منتظر تھے کہ کب انہیں آئی سی یو میں جانے کی اجازت ملتی ہے۔

کہ وہ جانے کہاں سے نکل کر آیا اور ان کا بازو پکڑ کر انہیں جانے سے روکنے لگا۔ پتا نہیں کون تھا وہ۔ انہوں نے سر کو ادھر ادھر جھٹکا۔ مبہم اور دھندلا سا سایہ ذہن کی اسکرین پر نمودار ہوا اور انہوں نے خود کو کہتے سنا۔

”بھائی اگر کوئی درخواست دینی ہے۔ کوئی کام ہے تو وہاں جہلم آنا آفس میں۔ یہاں میں ایک ایمرجنسی میں آیا ہوں۔ تمہارا اگر کوئی جائز کام ہے تو ہو جائے گا۔“ لیکن اس نے پھر انہیں روکا تھا۔ ”اوہ بھائی۔ میری بیوی اندر آئی سی یو میں صرف چند گھنٹوں کی مہمان ہے اور تم نے مجھے یہاں روکا ہوا ہے۔“

انہوں نے قدم آگے بڑھائے تھے اور پھر......

پھر کیا ہوا تھا زمین ان کے قدموں کے نیچے سے نکل گئی تھی اور آسمان ان کے سر پر آ گرا تھا۔ ”اس وقت ......اس وقت کیا ہوا تھا زنل۔“

دھندلے سائے اور نقش معدوم ہو چکے تھے اور وہ کربناک نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”کیوں سب کچھ یاد نہیں آتا۔ آدھا ادھورا ہی کیوں یاد آتا ہے۔“ انہوں نے ہاتھ زور زور سے بیڈ کی پٹی پر مارے اور اپنے سر کے بالوں کو مٹھیوں میں بھینچ کر کھینچا۔

”ابا......ابا پلیز سنبھالیں خود کو۔ آ جائے گا یاد سب یاد آ جائے گا۔ دادا جان اور ارباب تایا تھے نا وہاں انہیں ضرور پتا ہو گا۔ میں ان سے پوچھ کر آپ کو بتاؤں گی۔“

اس نے ان کا ہاتھ پکڑا کہ کہیں وہ اپنے ہاتھ زخمی ہی نہ کر لیں لیکن انہوں نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی وہ اسی طرح کبھی ہاتھ کا مکہ سا بنا کر بیڈ کی پٹی پر مارتے اور کبھی اپنے سر کے بال کھینچنے لگتے جیسے بے بسی کی انتہا پر ہوں۔ ان کی اس کیفیت پر زنل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”ابا۔“ اس نے ان کی طرف دیکھا اور نظریں بیڈ سائیڈ ٹیبل پر بڑے فون پر پڑیں تو وہ تیزی سے اٹھی اور ریسیور اٹھایا۔

”شینخو بابا! جلدی سے ابا کے کمرے میں آئیں۔ انہیں پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ بہت طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“

شینخو بابا کے جی شاہ بابا کہتے ہی اس نے جلدی سے کہا اور ریسیور کریڈل پر ڈال کر واپس شاہ زیب

بیگ کے بیڈ کے پاس آ گئی۔ شیخو بابا کے ساتھ ان کی وابستگی کے بعد آزین نے ان کے پاس یہ انٹرکام رکھ دیا تھا کہ اگر کبھی انہوں نے شیخو بابا کو بلانا ہو تو بلا لیں اور جب سے وہ بہتری کی طرف جا رہے تھے جب جی چاہتا انہیں بلا لیتے تھے اور شیخو بابا بھی ان کے پاس آنے میں دیر نہیں لگاتے تھے اور آج بھی انہوں نے صحن سے ان کے کمرے تک کا فاصلہ دو تین منٹوں میں طے کیا تھا۔

زل ان کے بیڈ کے پاس کھڑی آنکھوں میں آنسو لیے انہیں دیکھ رہی تھی اور وہ خالی خالی ویران نظروں سے سامنے دیوار کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پیشانی کی ابھری رگیں پھڑک رہی تھیں۔ ابھی تو وہ اس پر پوری طرح خوش بھی نہیں ہو پائی تھی کہ وہ اس سے باتیں کر رہے تھے اس کے متعلق پوچھ رہے تھے کہ یکدم کیا ہو گیا تھا۔

''ابا۔'' اس نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ انہوں نے دیوار سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ دکھ، بے بسی، اذیت، کرب کیا کچھ نہیں تھا ان کی آنکھوں میں وہ رو پڑی۔

''ابا میں ایسا کیا کروں کہ آپ کی یہ تکلیف اور اذیت دور ہو جائے۔'' تب ہی دروازہ کھول کر شیخو بابا اندر داخل ہوئے۔ اور سیدھے ان کے بیڈ کی طرف بڑھے تھے وہ پیچھے ہٹ گئی تھی۔

''السلام علیکم۔'' شاہ زیب نے شیخو بابا کی طرف دیکھا لیکن سلام کا جواب نہیں دیا تھا بس یوں ہی خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتے رہے۔

''کیا ہوا ہے شاہ بابا۔''

''یہ ہی تو یاد نہیں آ رہا کہ کیا ہوا تھا تمہیں یاد ہے اس روز کیا ہوا تھا جب مریم اپنی آخری سانس لے رہی تھی مجھے لگتا ہے جیسے کچھ بہت برا ہوا تھا میرے ساتھ جیسے کسی نے مجھے کند چھری سے ذبح کر دیا تھا۔ تمہیں پتا ہے۔ یاد ہے کچھ۔ شاید تم بھی ادھر ہی تھے۔''

''آپ کو پتا ہے نا شاہ بابا میں کتنا بھلکڑ اور کند ذہن ہوں اکثر باتیں بھول جاتا ہوں لیکن میں یاد کروں گا تو مجھے یاد آ جائے گا۔ ضرور یاد آ جائے گا۔''

وہ نرمی سے کہتے ہوئے بیڈ سائیڈ دراز سے کوئی دوا نکالنے لگے تھے پھر انہوں نے دو گولیاں ہاتھوں پر رکھیں اور زل کو اشارے سے پانی دینے کو کہا۔ زل نے ٹیبل پر پڑے جگ سے گلاس میں پانی ڈال کر ان کی طرف بڑھایا وہ اب شاہ زیب بیگ کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔

''شاہ بابا آپ یہ ٹیبلٹ لے لیں۔ آپ کو پتا ہے نا ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ جب کوئی بات بھول جائے تو یہ دوا لے لیا کریں۔ اس سے یادداشت اچھی ہوتی ہے۔''

''اچھا مجھے یاد نہیں ڈاکٹر صاحب نے ایسا کہا تھا۔''

انہوں نے بے یقینی سے شیخو بابا کو دیکھا تھا لیکن گولیاں کھا لی تھیں۔ انہیں شاہ زیب بیگ کو ہینڈل کرنا آتا تھا۔

''اس روز...... وہاں ہاسپٹل کے کوریڈور میں کون تھا۔ تمہیں پتا ہے۔''

''وہاں کوریڈور میں تو بہت سارے لوگ تھے آپ کس کا پوچھ رہے ہیں۔'' شیخو نے گلاس ان کے ہاتھ سے لے کر بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔

''اس کا۔'' انہوں نے شہادت کی انگلی ذرا سی بلند کی۔

''اس کا جو...... جس نے مجھے روکا تھا۔''

انہوں نے دہرایا۔ پیشانی کی رگیں ابھر کر پھڑکنے لگی تھیں۔ پھر پہلے ان کی آنکھیں نم ہوئیں پھر وہ زور زور سے رونے لگے۔

''ابا۔'' زل بے اختیار بیڈ کے قریب آئی تھی۔ شیخو بابا اب چپل اتار کر بیڈ پر بیٹھ گئے تھے اور ایک بازو ان کے گرد حمائل کر کے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور ان کا سر سینے سے لگائے ہولے ہولے تھپک رہے تھے۔ اور زل بیڈ کے پاس کھڑی شاہ زیب بیگ کو دیکھتی ہوئی خاموش آنسو بہا رہی تھی۔ پھر شیخو بابا کے

سینے سے سر لگائے لگائے ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں تو وہ گھبرا گئی۔

"یہ...... یہ انہیں کیا ہوا۔ یہ بے ہوش ہو گئے ہیں شیخو بابا۔" شیخو بابا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور ان کا سر سینے سے لگائے ایک بازو ان کے گرد حمائل کیے یوں ہی تھپکتے رہے اور جب انہیں لگا کہ وہ سو گئے ہیں تو آہستہ سے ان کا سر تکیے پر رکھا۔ اور انہیں لٹا کر چپل پہننے لگے۔ زل ابھی تک کھڑی تھی حیران پریشان اور افسردہ سی۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا تھا کہ کبھی کوئی واقعہ یا بات اچانک یاد آنے پر ایسی کیفیت ہو سکتی ہے خاص طور پر جب کوئی بات ذہن میں اٹک جائے یاد نہ آئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ روز بروز پہلے سے بہتر ہو رہے ہیں۔ ایک دو بار پہلے بھی ایسی کیفیت ہو چکی ہے۔ ایسی حالت میں پرسکون نیند بہت ضروری ہے۔ اب یہ کئی گھنٹے تک سکون سے سوتے رہیں گے اٹھیں گے تو کچھ یاد نہیں ہوگا۔ پھر بھی اگر کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بلا لیجیے گا میں ڈیوڑھی میں ہی ہوں زین صاحب نے چھٹی کے لیے کہا تھا۔" شیخو بابا نگاہیں جھکائے کھڑے تھے۔

"کب، ابا کب ٹھیک ہوں گے شیخو بابا۔" رکے ہوئے آنسو پھر بہہ نکلے تھے۔

"ان شاء اللہ بہت جلد۔" شیخو بابا نے جھک کر شاہ زیب بیگ کے گیلے رخسار اپنے ہاتھوں سے پونچھے اور بیڈ پر پڑی چادر انہیں اڑھاتے ہوئے غیر ارادی طور پر ان کی نظر زل پر پڑی تھی۔

"روئیں نہیں زل بی بی۔ اللہ بہت مہربان ہے۔ شاہ بابا بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہماری دعائیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔"

"کب...... کب شیخو بابا اب تو جیسے تھکنے لگی ہوں میں۔" زل کے آنسو مزید تیزی سے بہنے لگے تھے۔ بے اختیار شیخو بابا نے تسلی کے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر بنا کچھ کہے تیزی سے باہر نکل گئے۔ وہ کچھ دیر یوں ہی ساکت کھڑی رہی سر پر رکھے ان کے ہاتھ کے شفقت بھرے لمس سے من بھیگنے لگا تھا۔

ان گزرے دنوں میں کئی بار دل میں خیال آیا تھا کاش اس کا کوئی بھائی ہوتا، کوئی بہن ہوتی تو اس کے گلے لگ کر کندھے پر سر رکھے بہت سارے آنسو بہاتی۔ ایک زین کے بدلتے رویے نے کتنی کمیاں یاد دلا دی تھیں۔ ورنہ زین تھا تو سارے رشتے جیسے اس سے ہی جڑے ہوئے تھے۔ اس نے پہلے ہاتھوں کی پشت سے اپنا بھیگا چہرہ پونچھا اور پھر دوپٹے کے پلو سے صاف کیا اور کرسی پر بیٹھ کر شاہ زیب بیگ کو دیکھنے لگی، سوتے ہوئے بھی ان کے چہرے پر اضطراب سا تھا۔

☆☆☆

مغرب کی نماز اس نے ان کے کمرے میں پڑھی تھی۔ دعا مانگ کر اس نے شاہ زیب بیگ کی طرف دیکھا وہ گہری نیند میں تھے۔ باہر سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید زین کے دوست آ گئے تھے۔ اس کے سر میں درد ہو رہا تھا اس نے سوچا کہ اپنے کمرے میں جا کر سر درد کے لیے کوئی گولی کھا لے کہ شیخو بابا نے کہا تھا کہ ابا اب کافی دیر تک سوتے رہیں گے۔ ایک نظر ان پر ڈال کر آہستہ سے دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکلی تو صحن میں مرسل جماعت کروا رہا تھا۔ شاید وہ لیٹ ہو گئے تھے اور مسجد میں نماز ہو گئی تھی۔

مرسل کی عادت تھی کہ اگر وہ تین چار بھی ہوتے اور مسجد نہ جا پاتے تو گھر میں ہی جماعت کروا لیتا تھا۔ وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی پہلے بی بی اماں کے کمرے میں آئی جو نماز سے فارغ ہو کر معمول کی تسبیحات پڑھ رہی تھیں۔

"بی بی اماں میں اپنے کمرے میں ہوں کوئی کام ہو تو بلا لیجیے گا۔"

"تم پھر روئی ہو زل۔" بی بی اماں کی نظروں سے اس کی بھیگی پلکیں چھپ نہیں سکی تھیں۔

"اللہ پر بھروسا رکھو میری بچی۔ وہ ضرور تمہارے حق میں بہتر کرے گا۔ اور ہاں کام کی فکر نہ کرو ساجدہ ہے نا۔"

زل نے کوئی جواب نہیں دیا اور جانے کے لیے مڑی۔ لیکن مڑتے مڑتے خیال آیا کہ وہ دادا جان کے کمرے میں چلی جائے۔ شاید وہ کچھ بتائیں کہ زین نے کیا کہا۔ کوئی ایسی بات جس سے یہ ڈوبا ڈوبا دل تیرنے لگے۔

"دادا جان کیا کمرے میں ہیں بی بی اماں۔"

"نہیں وہ تو اذان ہوتے ہی چلے گئے تھے۔ اب عشاء پڑھ کر ہی آئیں گے۔ کہہ رہے تھے کچھ دیر راجہ صاحب کے پاس بیٹھیں گے۔"

بی بی اماں تاسف سے اسے دیکھ رہی تھیں وہ سر ہلاتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر یوں ہی بیٹھی رہی پھر تکیے کے پاس پڑی کتاب اٹھائی کہ شاید اس کے پڑھنے سے دھیان بٹ جائے کہ ایک بار پھر دھیان زین کی طرف چلا گیا تھا وہ کیوں جا رہا تھا۔ وہ کس بات پر اس سے اتنا خفا اور دور ہو گیا تھا کہ اس سے کچھ بھی شیئر نہیں کیا تھا۔ صبوحی چچی کا آنا اس کا ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کرنا کچھ بھی تو نہیں لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے کتاب رکھ دی۔

بی بی اماں مغرب کے وقت ناول، کہانیاں پڑھنے اور ٹی۔ وی دیکھنے سے منع کرتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں۔ ہم نے تو سنا ہے کہ مغرب کے وقت تو بہتے دریا بھی رک جاتے ہیں۔ اور تم لوگ ٹی۔ وی لگا کر بیٹھ جاتے ہو۔ تو کیا کرے کہ ذہن میں کوئی خیال کوئی سوچ نہ آئے۔ باہر سے کرسیاں آگے پیچھے کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کیوں نہ وہ بھی باہر چلی جائے اور ان کی باتیں سنے، زین چلا جائے گا تو پھر بھلا اس طرح کہاں کب سب نے یہاں اکٹھے ہونا تھا۔

پھر وہاں سب کے ساتھ زین بھی تو ہوگا اور اس کے ہونے کا احساس ہوگا۔ شاید اس کے بے قرار دل کو قرار آ جائے۔ تب ہی دروازے پر ہلکی دستک دے کر سمیرا اندر آ گئی۔ اس کا چہرا ستا ہوا تھا ہونٹ جو ہمیشہ ہونٹوں کی ہم رنگ لپ اسٹک سے چمک رہے ہوتے تھے خشک تھے۔ آنکھیں بجھی بجھی اور بے رنگ سی تھیں۔

"میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا زل۔" وہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔

"نہیں آ جاؤ بیٹھو سمیرا۔" زل نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر چونک گئی۔

"کیا ہوا ہے تمہیں طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

"نہیں...... میں ٹھیک نہیں ہوں زل۔" اس کی آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔

"گھر میں سب ٹھیک ہیں نا۔ خیریت ہے سب۔" زل یکدم اٹھ کر اس کے قریب آ گئی تھی اور اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ وہی اس کی ہمدرد اور مہربان فطرت دوسروں کو پریشان دیکھ کر اپنا دکھ بھول جانے والی۔

"ہاں گھر میں تو سب ٹھیک ہیں لیکن وہ مجھ سے ناراض ہو گیا ہے بات نہیں کرتا۔" نم آنکھوں سے اس نے زل کی طرف دیکھا۔

"کون۔" زل حیران ہوئی تھی۔

"وجدان بھائی۔"

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لیکن تم تو ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے تم نے بتایا تھا نا کہ حمیرا کی شادی کا مسئلہ حل ہوتے ہی تم دونوں کی بھی شادی ہو جائے گی۔" زل ابھی تک حیران سی تھی۔

"ہاں لیکن وہ اب مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ بس میری ایک چھوٹی سی غلطی پر مجھ سے یوں دور ہو گیا ہے جیسے مجھے کبھی جانتا ہی نہ تھا حالانکہ میں اسے غلطی نہیں سمجھتی بس میرا ردعمل تھا ایک لیکن وہ خود کو میری جگہ رکھ کر نہیں دیکھتا۔ بس اتنی سی چھوٹی سی بات پر مجھ سے خفا ہو گیا ہے بھاگتا پھر رہا ہے مجھ سے۔" لیکن وہ چھوٹی سی بات کیا تھی وہ اس نے نہیں بتائی تھی۔

"محبت تو بڑی فراخ دل ہوتی ہے بہت کشادہ دل۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ محبت میں محبوب کا غلط

بھی غلط نہیں لگتا۔ محبت میں تو بڑی سے بڑی غلطی اور گناہ کو معاف کر دینے کا ظرف ہوتا ہے لیکن اس نے اپنا دل تنگ کر لیا ہے۔ فرض کرو زین سے کچھ غلط ہو جاتا ہے تو کیا تم اس سے ناراض ہو جاؤ گی۔''

''نہیں میں زین سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتی۔'' زل کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''اور اگر وہ معافی مانگے تو کیا اسے معاف کر دو گی؟'' سمیرا اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی زل نے اثبات میں سر ہلایا۔

''لیکن اس نے مجھے معاف نہیں کیا زل...... حالانکہ میں نے جو کچھ کیا میں اسے غلط نہیں سمجھتی پھر بھی میں نے اس سے معافی مانگی سوری کیا۔ حالانکہ میں نے جو کچھ کیا تھا اس کا اس کے ساتھ تو کوئی تعلق نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے اپنا دل پتھر کر لیا ہے۔'' آنکھوں کی سطح پر چمکتے آنسو رخساروں پر پھسل آئے تھے۔

زل نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لگایا تو وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ اپنا ایک بازو اس کے گرد حمائل کیے زل ہولے ہولے اسے تھپکنے لگی۔

''پلیز سمیرا! یوں تو مت روؤ۔ زیادہ دیر تک وجدان بھائی تم سے ناراض نہیں رہ سکیں گے۔ وقتی غصہ ہے ان شاء اللہ جلدی اتر جائے گا۔''

''کیا تمہیں یقین ہے زل! وجدان مجھے معاف کر دے گا۔ بھول جائے گا میری غلطی، سب پہلے جیسا ہو جائے گا۔''

اس سے الگ ہو کر اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے کسی چھوٹے بچے کی طرح یقین دہانی چاہی تو زل نے اثبات میں سر ہلایا۔

''محبت کرنے والے زیادہ عرصہ تک ایک دوسرے سے ناراض نہیں رہ سکتے۔''

دل میں کہیں درد سا اٹھا تھا زین بھی تو اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ اس کے نکاح میں تھی کیا وہ بھی زیادہ عرصہ مجھ سے ناراض نہیں رہے گا اور مجھے تو یہ تک علم نہیں کہ وہ مجھ سے کیوں اتنا خفا ہے۔

''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو شاید۔ وجدان بھی زیادہ دیر تک مجھ سے ناراض نہیں رہ سکتا۔'' وہ اب بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

''میں ایسا کیا کروں زل کہ وہ مجھ سے ناراضی ختم کر دے۔ پھر پہلے جیسا ہو جائے۔ ثوبیہ نے فون کیا تھا مجھے کہ آج سب زین کی طرف جا رہے ہیں اس سے ملنے۔ وہ انگلینڈ جا رہا ہے۔ پھر شاید کبھی ہم اس طرح اکٹھے نہ ہو سکیں۔ طیب بھی کچھ دنوں تک شارجہ چلا جائے گا۔ وہاں اس کی جاب ہو گئی ہے۔ تو زین نے کہا تھا۔ سب ادھر ہی کھانا بھی کھانا۔ میرا خیال تھا وجدان بھی آئے گا لیکن وہ نہیں آیا۔ وہ مجھ سے بھاگ رہا ہے زل۔ وہ مجھے اب دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ سب آئے ہوئے ہیں۔ مرسل، اسد، عمار، طیب، عمر، ثوبی۔'' آنسو پھر اس کی آنکھوں میں اکٹھے ہونے لگے تھے۔

''نہ...... اب رونا نہیں سمیرا۔ شاباش اٹھو منہ ہاتھ دھو کر باہر چلو۔ کیا خبر اب تک آ چکے ہوں وجدان بھائی۔''

''تم بھی چلو۔ کیا زین نے منع کر رکھا ہے تمہیں۔''

''نہیں۔'' نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ اٹھی۔

''تم چلو میں ذرا کچن میں دیکھ لوں۔ ساجدہ کیا کر رہی ہے۔ اور بی بی اماں پتا نہیں فارغ ہو کر آئی ہیں یا نہیں۔''

''مجھے لگتا ہے جیسے زین کو تمہارا اپنے دوستوں کے سامنے آنا پسند نہیں ہے ڈرتا ہو گا کہ کہیں اس کی پیاری سی بیوی کو لے ہی نہ اڑے کوئی۔''

سمیرا نے باہر جاتے جاتے رک کر ایک گہری نظر زل پر ڈالی۔ زل کو اس کا یہ عامیانہ سا انداز اور بات بہت ناگوار گزری تھی تاہم اس نے اپنی ناگواری کا اظہار کیے بغیر نرمی سے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے سمیرا۔ نہ زین کے دوست ایسے ہیں اور نہ ہی وہ اتنی چھوٹی اور عامیانہ بات سوچ سکتا ہے، مرسل۔ عمر اور عمار وغیرہ کا تو بچپن

سے ہی یہاں آنا جانا ہے۔ خود میرا جی نہیں چاہتا نہ میں کوئی فلاحی کام کر سکتی ہوں ان کی طرح نہ کوئی فنڈ وغیرہ دیتی ہوں تمہاری طرح تو اس لیے۔"

"لیکن بیا تو کہتی تھی کہ تمہارے دل میں ملک و قوم کے لیے بہت درد اٹھتا ہے۔"

سمیرا جو کچھ دیر پہلے اس کے گلے لگے رو رہی تھی اب پتا نہیں کیوں یکدم تلخ ہوئی تھی لیکن زنل نے اسی نرمی اور تحمل سے جواب دیا۔ اس کا لہجہ متوازن تھا۔

"یہ تو فطری بات ہے سمیرا! ہر سچا پاکستانی اپنے دل میں ملک و قوم کے لیے درد رکھتا ہے۔ ہمارے بڑوں نے وطن سے محبت کا جو سبق بچپن سے پڑھایا ہے وہ ہماری رگوں میں خون کے ساتھ دوڑتا ہے۔ کچھ لوگ زین اور اس کے دوستوں کی طرح اپنی بساط بھر وطن اور قوم کی بہتری کے لیے عملی طور پر کچھ کر رہے ہیں اور کچھ میری طرح ہیں جو درد تو رکھتے ہیں لیکن کچھ کر نہیں پاتے۔"

سمیرا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے اور پھر کچھ کہے بنا باہر چلی گئی۔

اور زنل کچن میں جانے کے بجائے واپس بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وہ سمیرا کو ابھی تک سمجھ نہیں پائی تھی۔ شاید سحرش صحیح کہتی تھی کہ سمیرا کو سمجھنا آسان نہیں ہے وہ ایک مشکل لڑکی ہے۔ اسے مرتضیٰ کے حوالے سے تحفظات تھے وہ سمجھتی تھی کہ سمیرا مرتضیٰ کو بیوقوف بنا رہی ہے حالانکہ اصل حقیقت سے وہ بھی واقف نہیں تھی تاہم اس کے اندازے تھے جو بدلتے رہتے تھے۔

بہر حال آج جس طرح وہ وجدان کی ناراضی کے خیال سے روئی تھی اس سے زنل کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ سمیرا صرف وجدان سے محبت کرتی ہے اور سحرش کا یہ اندازہ غلط تھا کہ مرتضیٰ اور سمیرا ایک دوسرے میں انٹرسٹڈ ہیں۔ غیر ارادی طور پر ہاتھ گود میں دھرے وہ سمیرا، وجدان اور مرتضیٰ کے متعلق سوچنے لگی پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی اسے اندازہ نہیں ہوا تھا۔

"تم ابھی تک یہاں ہی بیٹھی ہو زنل۔" سمیرا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"میں منہ ہاتھ دھو کر کچن میں گئی تو دیکھا وہاں بی بی اماں اور ساجدہ تھیں صرف۔"

"اچھا بی بی اماں ہیں کچن میں۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں...... میں نے کچھ دیر ان سے باتیں کیں اور انہیں دعا کے لیے کہا مجھے ان کی دعاؤں کی بہت ضرورت ہے زنل۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں کس اذیت سے گزر رہی ہوں۔" وہ بات کرتے کرتے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی پھر وہاں پڑی چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔

"تمہارے پاس تو ڈھنگ کا کوئی میک اپ کا سامان بھی نہیں اب ایسی روتی شکل لے کر سب کے سامنے تو نہیں جاؤں گی۔ خیر گزارہ ہو جائے گا۔"

اس نے فیس پاؤڈر اٹھا کر چیک کیا اور رکھ دیا پھر بلشرز کے دو برش رخساروں پر پھیرے۔ لپ اسٹک اٹھا کر ہونٹوں پر لگائی۔ جو بالکل ہونٹوں کے ہم رنگ تھی۔

"لڑکیوں کے پاس تھوڑا بہت میک اپ کا سامان ہونا چاہیے۔ یار ٹھیک ہے اللہ نے آپ کو اتنا حسن دیا ہے کہ آپ کو میک اپ کی ضرورت نہیں لیکن کبھی کبھی اپنا آپ بھی چھپانا پڑتا ہے اور کبھی یوں ہی تبدیلی کے لیے۔"

وہ ہولے سے ہنسی اور شاید اپنی آمد کے بعد پہلی بار غور سے اسے دیکھا۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھوں کو اور سرخ رخساروں کو۔ زنل خاموش رہی۔ اسے میک اپ سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی یہ دو تین چیزیں بھی سحرش اس کے لیے لے کر آئی تھی۔

"اب جاب کرتی ہو زنل! تو ایسے روکھے پھیکے چہرے والی ٹیچرز کو تو بچے بھی پسند نہیں کرتے، زیادہ نہیں تو بلشر اور لپ اسٹک لگا کر جایا کرو۔ بچے تو بس

اتنے سے میں ہی تمہارے دیوانے ہو جائیں گے ۔زین کے جانے سے اداس ہو۔روئی بھی ہو شاید۔"

سمیرا نے ہاتھ میں پکڑی لپ اسٹک واپس ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ "تمہارا اداس ہونا اور رونا تو بنتا ہے یار۔"

"ابا کی طبیعت کچھ دیر پہلے بہت خراب ہو گئی تھی میں ڈر گئی تھی۔" زل کے آنسو کہیں اندر گرے تھے۔

"اب کیسے ہیں۔" سمیرا اس کے قریب آئی۔

"شیخو بابا نے دوا دی تھی سکون سے سو رہے ہیں۔" زل اب سمیرا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سمیرا نے تسلی کے انداز میں اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"خیر نکاح ہو چکا ہے تمہارا ذہن جلد ہی تمہیں بھی وہاں ہی بلا لے گا۔ پریشان مت ہونا۔ ویسے کب تک بلائے گا تمہیں۔" سمیرا کی کھوجتی نظروں سے زل کو الجھن ہوئی۔

"پتا نہیں۔" اس نے بیڈ پر پڑی کتاب اٹھائی تو سمیرا نے اس کے ہاتھ سے کتاب لے کر اسے واپس رکھ دیا۔

"کم آن زل......اب یہ کچھ پڑھنے کا کون سا وقت ہے۔ چلو باہر سب کے ساتھ بیٹھتے ہیں۔ میں جب واش روم سے نکل رہی تھی۔ تو میں نے مہرین اور سحرش کو دیکھا تھا نیچے آتے ہوئے۔ شاید یوں آخری بار سب اکٹھے ہوئے ہیں۔ بیا بھی کہہ رہی تھی مجھے کہ ضرور آنا۔ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ شادی کے بعد وہ ملتان چلی جائے گی۔ زین انگلینڈ جا رہا ہے۔ طیب بھی کچھ دنوں تک چلا جائے گا۔ ضیاء تو پہلے سے ہی اسلام آباد میں جاب کر رہا ہے تو اسی لیے اسد اور مرسل کے کہنے پر زین نے سب کو بلایا ہے کہ پھر شاید اس طرح زندگی میں کبھی مل بیٹھنے کا موقع ملے گا بھی یا نہیں۔ میرا بھی موڈ نہیں تھا پھر بھی میں آ گئی۔ تم بھی یہاں بیٹھی بور ہی ہو رہی ہو چلو سب کے ساتھ مل کر کچھ دیر بیٹھتے ہیں۔"

وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ زل نے سوچا کل نہ جانے کون کہاں ہو گا۔ اور پھر زین بھی تو ہو گا وہاں۔ وہ اسے دیکھے گی سنے گی۔ شاید دو تین دنوں تک وہ چلا جائے گا۔ اور ان دو تین دنوں میں پتا نہیں اسے دیکھنے کا موقع بھی ملے گا یا نہیں۔ گھر میں کم ہی نکلتا تھا ان دنوں ہوتا بھی تو زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتا تھا۔ بس ذرا سی دیر کو دکھائی دیتا تھا۔

"ہاں تم چلو میں ذرا بی بی اماں سے پوچھ کر آتی ہوں کہ کوئی کام تو نہیں ہے۔"

"اوکے۔ آنا ضرور پھر نہ بیٹھ جانا کمرے میں۔"

اسے تاکید کرتی ہوئی سمیرا چلی گئی تو زل اٹھی۔ اور کیا خبر۔ پھر زین کبھی لوٹ کر نہ آئے۔ اچھا ہے نا آج جی بھر کر اسے دیکھ لے گی۔ جیسے درد کی ایک لہر سی دل کے اندر اٹھی تھی لیکن دل کے درد کو دباتے ہوئے وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"کبھی کبھی اپنا آپ چھپانے کے لیے بھی میک اپ کرنا پڑتا ہے۔" سمیرا کی بات یاد آئی تو اس نے لپ اسٹک اٹھائی لیکن پھر رکھ دی۔ ہولے ہولے چلتی ہوئی دروازے تک آئی اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ باہر صحن اور برآمدے کی لائٹیں جل رہی تھیں۔ لڑکے سب صحن میں تھے جب کہ ثوبیہ اور سمیرا برآمدے میں تخت پر بیٹھی تھیں اور برآمدے میں ہی ان کے قریب پڑی کرسی پر ماہ وش بیٹھی تھی۔ اس نے باہر قدم رکھا تو عین اسی وقت ثوبیہ نے اس کی طرف دیکھا۔

"آ جاؤ زل۔ کب سے آئی ہوئی ہوں۔"

زین نے ثوبیہ کی آواز سن کر بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا تھا اور پھر فوراً ہی رخ موڑ لیا تھا۔ باقی سب بھی ثوبیہ کی آواز پر اچانک خاموش ہوئے تھے۔ اور وہ کچن کی طرف جاتے جاتے ان کی طرف چلی آئی اور سب کو مشترکہ سلام کر کے ثوبیہ کے قریب آئی۔

"کیسی ہو۔"

"اللہ کا شکر ہے۔ تم بتاؤ یہ تمہارا زین کیوں جا رہا ہے اچانک۔ تم نے روکا نہیں اسے۔" ثوبیہ کو جب

سے مرسل نے بتایا تھا زین جا رہا ہے وہ زل سے ملنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی لیکن پچھلے دو دن وہ بے حد مصروف رہی تھی۔

"جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی۔" جواب سمیرا نے دیا تھا۔

"لیکن اگر زل روکتی تو زین ضرور رک جاتا۔" ثوبیہ کو یقین تھا۔

"تو پھر زل نے روکا کیوں نہیں۔" سمیرا نے ثوبیہ کی طرف دیکھا۔

وہ بہت آہستہ __ بات کر رہی تھیں۔ صحن میں موجود وہ سب چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر باتیں کرنے لگے تھے۔ شاید کوئی بحث ہو رہی تھی، زل نے ایک نظر انہیں دیکھا ان کا دھیان ان کی طرف نہیں تھا۔ پھر سمیرا کی طرف متوجہ ہوئی۔

"میرے لیے اپنی خوشی اور خواہش سے زیادہ زین کی خوشی اور خواہش اہم ہے۔ وہ اگر جانا چاہتا ہے تو میں کیوں روکوں گی اسے۔"

سمیرا دل ہی دل میں جز بز سی ہوئی لیکن مسکرا کر اسے دیکھا۔

"لیکن تمہیں اسے روکنا چاہیے تھا ان مردوں کا کیا اعتبار، زل کیا خبر وہاں کسی گوری سے دل لگا بیٹھے تو کیا تب بھی تم اس کی خوشی میں خوش ہوگی۔"

"اول تو زین ایسا نہیں ہے۔ اور اگر ایسا ہوا بھی تو میں تب بھی اس کی خوشی میں خوش ہوں گی۔"

زل کہتے ہوئے ماہ وش کی کرسی کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں زل! اگر سچ میں تمہارے زین نے کسی گوری کے ساتھ بیاہ کر کے تمہیں چھوڑ دیا تب میں تم سے پوچھوں گی کہ اب بھی خوش ہو۔"

"اللہ نہ کرے کہ زین ایسا کچھ کرے۔" ماہ وش کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"کیسی باتیں کرتی ہو سمیرا۔" وہ ناراضی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ماہ وش کم گو سی تھی اور یہاں ان کی محفل میں شادی سے پہلے چند بار آئی تھی اور شادی کے بعد تو بالکل ہی آنا چھوڑ دیا تھا آج بھی سحرش اسے زبردستی لے آئی تھی۔

"سوری تمہیں برا لگا ماہی، میں نے تو زل سے یوں ہی پوچھا تھا لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔" سمیرا نے زل کی طرف دیکھا۔

"کچھ باتوں کے جواب وقت دیتا ہے سمیرا اور اس کا جواب بھی وقت ہی دے گا۔" زل کو سمیرا کی بات پر تکلیف ہوئی تھی۔ پچھلے کچھ عرصہ سے وہ یونہی باتوں ہی باتوں میں کوئی تکلیف دہ بات کر جاتی تھی۔ اور شاید اسے احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس کی عام سے انداز میں کہی ہوئی بات کسی کے لیے کتنی تکلیف دہ ہے۔ یہ زل کا خیال تھا جب کہ سمیرا ہر بات بہت سوچ سمجھ کر کرتی تھی اور جانتی تھی کہ اس کی کہی بات کسی کے لیے کتنی تکلیف دہ ہوگی۔

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو وقت ہی بتائے گا۔" اس کے لبوں پر ایک پراسرار سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہوگئی تھی۔

"اور وقت۔" اس نے دل میں سوچا۔

وقت تمہارے ساتھ جو کچھ کرنے والا ہے تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ مجھے تمہارے لیے افسوس ہے لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ مرتضیٰ نے اسے بتایا تھا کہ زین وہ خط پڑھ چکا ہے اور بہت جلد زل کو اپنی زندگی سے علیحدہ کرنے والا ہے اس نے زین کی کچھ باتوں سے اندازہ لگایا تھا اور اسے یقین تھا کہ خط پڑھنے کے بعد زین کسی صورت میں بھی رخصتی نہیں کروانے والا تھا اور ایسا ہی ہوا تھا۔

زین باہر جا رہا تھا شاید یہاں وہ اپنے دادا جان کی وجہ سے زل کو طلاق دینے سے گھبرا رہا تھا یقیناً باہر جاتے ہی وہ زل کو طلاق بھجوا دے گا۔ یہ مرتضیٰ کا ہی نہیں اس کا بھی خیال تھا۔

اس وقت وہ وجدان کی خفگی اور ناراضی کو بھولے ہوئے ان لمحوں کو انجوائے کر رہی تھی جب زین زل کو طلاق دے گا۔ اور اسے کھو کر تڑپے گا اور

اسے تڑپتے دیکھ کر صبوحی کو جو اذیت ہوگی وہ اذیت اس اذیت کے مقابلے میں کم ہی ہوگی جو اس نے اور اس کے خاندان نے سہی تھی۔ وقت پلٹ نہیں سکتا تھا لیکن دل کو سکون ملے گا کہ۔

"پریشان مت ہو زنل۔ زین ایسا نہیں ہے۔" ماہ وش نے زنل کو بے حد خاموش اور اداس دیکھ کر تسلی دی۔

"مجھے یقین ہے کہ زین ایسا نہیں ہے۔" وہ مسکرائی اور اٹھ کھڑی ہوئی اور سامنے سیڑھیوں کی طرف دیکھا سحرش اور مہرین سیڑھیوں میں بیٹھی سر جوڑے جانے کیا سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

"میں ذرا کچن میں جا رہی ہوں دیکھوں بی بی اماں کو کیا کر رہی ہیں۔" وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"ویسے زین بھائی بہت لکی ہیں جنہیں زنل جیسی بیوی ملی ہے۔" ثوبیہ کی نظریں جاتی ہوئی زنل کی پشت پر تھیں۔

"لیکن ابھی صرف نکاح ہوا ہے ان کا رخصتی نہیں ہوئی۔ اور کون جانے رخصتی ہوتی بھی ہے یا نہیں اس لیے تم زین کی قسمت پر رشک نہ کرو۔ جانے اس کے نصیب میں کیسی بیوی لکھی ہوئی ہے۔" ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نے سمیرا کے لبوں کو چھوا۔

"کیسی فضول بات کر رہی ہو تم۔" ثوبیہ کو برا لگا تھا۔

"فضول بات نہیں کر رہی۔ حقائق پر نظر رکھتی ہوں۔ اگر اسے رخصتی کروانی ہوتی تو جاتا ہی کیوں۔ سو سمجھ لو کہ دال میں کچھ کالا ہے۔" سمیرا یک دم پھر سے بے چین ہو گئی تھی اور اس کا دھیان مسلسل وجدان کی طرف تھا کہ وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں اس لیے وہ بغیر سوچے سمجھے بولے چلی جا رہی تھی۔

"تم صحافیوں کو تو ہر شے میں ہی کالا پیلا نظر آتا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے مرسل نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے ابا کے بے حد اصرار پر جا رہا ہے وہ چاہتے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ رہے۔ اگر اس کا دل لگ گیا تو وہ زنل کو بھی رخصت کروا کے لے جائے گا ورنہ واپس آجائے گا۔"

"اچھا ایسا کہا ہے زین نے مرسل سے۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ جا رہا ہے تو کبھی واپس نہیں آئے گا ویسے اسے واپس آنا ہوتا تو جاتا ہی کیوں۔" سمیرا کے لہجے میں اب بیزاری تھی۔

"بھلا کیوں واپس نہیں آئے گا۔ یہاں اس کا گھر ہے۔ دادا جان ہیں۔ تایا چچا سب عزیز و اقارب اور پھر سب سے بڑھ کر زنل ہے۔"

ثوبیہ حیران ہوئی تھی سمیرا خاموش ہی رہی تھی ذہن کے اندر کہیں جھکڑ چل رہے تھے۔ تو کیا اس کی ساری کوششیں بے کار گئیں۔ وجدان ناراض ہوا، مرتضیٰ جیسے فضول شخص کو اپنا راز دار بنانا پڑا اور نتیجہ کچھ نہیں۔ لیکن نہیں بھلا کچھ نتیجہ کیوں نہیں۔ زین ملک چھوڑ کر جا رہا ہے۔ زنل کھوئی کھوئی اور اداس نظر آتی ہے تو پھر۔

اس نے اپنے دل کو تسلی دی۔ اب زین ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ خط پڑھ کر بھی زنل کے ساتھ رشتہ جوڑے رکھے۔ تب ہی صحن کا دروازہ کھلا اور شینو بابا اندر داخل ہوئے۔ سمیرا جو ادھر دیکھنے لگی تھی کہ شاید وجدان آیا ہو مایوس سی ہو گئی۔ اور عین اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز پر زنل نے بھی کچن کے اندر قدم رکھتے ہوئے مڑ کر دیکھا تھا اور شینو بابا کو دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان بکھر گیا تھا کہ کچن کی طرف آتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ پہلے اسے ابا کو ایک نظر دیکھ آنا چاہیے تھا۔ کیا خبر جاگ گئے ہوں اور بے چین ہوں۔ لیکن شینو بابا ان سے کبھی غافل نہیں ہوتے تھے انہیں کب دوائی دینی ہے۔ انہوں نے کب کھانا ہے۔ کب ڈاکٹر کے پاس جانا ہے انہیں سب یاد رہتا تھا وہ مطمئن سی اندر داخل ہوئی تو بی بی اماں ساجدہ سے کہہ رہی تھیں۔

"ساجدہ کل یاد سے صحن کے دروازے کے قبضوں وغیرہ میں تیل ڈال دینا بہت شور کر رہا ہے دروازہ۔" وہ چولھے کے پاس کھڑی تھیں جب کہ ساجدہ کچن ٹیبل پر سلاد کا سامان سامنے رکھے سلاد بنا

رہی تھی۔
"بی بی اماں کوئی کام ہو تو بتائیں، میں کر دیتی ہوں۔ آپ صبح سے لگی ہوئی ہیں۔"
"تم کیوں اٹھ کر آ گئیں۔ تمہارے سر میں درد تھا، کچھ دیر اور آرام کر لیتیں۔" انہوں نے مڑ کر اسے دیکھا۔
"اور میں نے کون سا صبح سے دیگیں چڑھا رکھی ہیں جو تھک جاؤں گی۔ پلاؤ کے لیے یخنی اور قورمہ صبح ہی تیار کر دیا تھا شامی کباب پہلے کے بنے رکھے ہیں۔ وقت کے وقت فرائی کر لیں گے۔ زین تو کہہ رہا تھا کہ باہر سے کھانا آ جائے گا لیکن میں نے کہا ایک دو چیزیں تو میں گھر میں ہی تیار کر لوں گی باقی جو دل چاہے باہر سے منگواتے رہنا۔"
"کیا باہر سے بھی کچھ کھانا آئے گا۔" ساجدہ نے پوچھا۔
"قورمہ، پلاؤ اور کباب ہیں تو۔"
"ارے پہلی بار تو زین نے سب دوستوں کو باضابطہ دعوت دی ہے تو جو جی چاہے منگوائے چرغہ، سیخ کباب جو بھی۔ ویسے تو بچے بے چارے کبھی کھانے کے لیے رکے بھی تو جو گھر میں پکا ہوتا تھا وہی کھا لیتے۔ ویسے تو زل روسٹ بروسٹ سب گھر میں بنا لیتی ہے لیکن اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی میں نے کہا چلو بازار سے ہی آ جائے گا کچھ۔"
بی بی اماں نے تفصیل سے بتایا تو ساجدہ نے سر ہلایا۔
"تو بریانی بنا لیتیں بی بی اماں پلاؤ تو پکتا ہی رہتا ہے۔" ساجدہ نے رائے دینا ضروری سمجھا تھا۔
"میرے زین کو بریانی پسند نہیں ہے۔ پلاؤ شوق سے کھاتا ہے۔ وہاں انگلینڈ میں بھلا کہاں کون ایسا پلاؤ بنا کے کھلائے گا اسے۔"
ان کے لہجے سے ممتا چھلکتی تھی۔ صبوحی چچی کو کیا پلاؤ پکانا نہیں آتا زل پوچھنا چاہتی تھی لیکن پھر خاموشی سے ساجدہ کے پاس دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔
"ظفر میاں کہتے ہیں کہ وہاں گوشت میں یہ سواد نہیں ہوتا جو یہاں کے گوشت میں ہے۔"
بی بی اماں نے جیسے اس کے دل کی بات سن لی تھی۔
"یہ بی بی اماں بھی آدھی نجومی ہیں۔" زل نے پلیٹ سے مولی کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالا۔
"میرا خیال ہے اب دم لگا دوں۔" انہوں نے تھوڑے سے چاول پلیٹ میں ڈال کر زل کو دکھائے۔ تو زل نے اثبات میں سر ہلایا۔ بی بی اماں نے دم لگا کر آنچ دھیمی کی اور ساجدہ کی طرف دیکھا۔
"ڈیوڑھی سے ذرا شینو کو تو بلا لاؤ پوچھوں اس سے زین نے کیا کہا ہے اسے۔ نان لانے کا بھی کہایا نہیں۔"
"شینو بابا ابھی ابھی ابا کے کمرے میں گئے ہیں۔ بی بی اماں۔" زل نے بتایا۔
"اچھا پھر تم رہنے دو ساجدہ میں خود ہی شینو سے پوچھ لیتی ہوں۔ اور ہاں سات آٹھ منٹ بعد چولھا بند کر دینا لیکن دم ایسے ہی رہنے دینا نہ کھولنا۔" اب وہ زل کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ زل نے سر ہلایا تھا۔
"عشاء کی نماز پڑھ کر کھانا لگا دیں گے ساجدہ نے گھر بھی جانا ہوگا کیوں ساجدہ تیرا میاں آئے گا لینے۔" جاتے جاتے انہیں خیال آیا تھا۔
"جی بی بی اماں! کہہ دیا تھا میں نے اسے گھر پر ہی تھا بچوں کے پاس۔ تینوں باپ بیٹا ٹی۔ وی دیکھ رہے تھے جب میں آئی تھی۔" ساجدہ کے دو بیٹے تھے۔
"اچھا ٹھیک ہے۔ قورمہ تو میں نے پہلے ہی ڈبے میں ڈال کر رکھ دیا تھا۔ شینو نان وغیرہ لے آئے گا تو چاول اور کباب وغیرہ تب ڈال دوں گی۔"
بی بی اماں کو ایسی باتوں کا بہت خیال رہتا تھا کہ گھر میں اگر دعوت وغیرہ ہے تو ساجدہ اور اس کے بچوں کا حصہ پہلے نکالنا ہے۔
"میرے چھوٹے کو تو آپ کے گھر کا پلاؤ بہت پسند ہے۔" بی بی اماں کے جانے کے بعد ساجدہ نے زل کو بتایا۔

"اگر کبھی کسی عید تہوار پر میں پلاؤ پکاؤں تو کہتا ہے اماں تمہیں اچھا پکانا نہیں آتا۔ بی بی اماں سے سیکھ لو۔"

"تو سیکھ لونا۔ ان کے ساتھ ہی تو کچن میں کھڑی ہوتی ہو۔" زل نے مشورہ دیا۔

"پھوہڑ نہیں ہوں زل باجی۔ آتا ہے سب کچھ پکانا پر چار بوٹیوں اور چٹکی بھر گرم مسالے سے سواد تو نہیں آتا نا۔"

"ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو تم، کسی روز مجھ سے پیسے لے کر زیادہ گوشت ڈال کر پلاؤ پکا کر اپنے چھوٹے کو بتا دینا کہ تم بھی بی بی اماں جیسا ہی پکا سکتی ہو۔" زل مسکرائی۔

"اور اب برتن وغیرہ نکال دو۔ یہ سلاد میں بنا لیتی ہوں۔" ساجدہ ممنونیت سے اسے دیکھتی ہوئی اٹھ کر برتن نکالنے لگی۔ زل نے سلاد بنا کر فریج میں رکھا اور ساجدہ کو کام کرتے ہوئے دیکھنے لگی تب ہی سحرش نے کچن کے دروازے پر کھڑے ہو کر اندر جھانکا۔

"ہے...... زل کیا کر رہی ہو۔"

"کچھ نہیں۔" زل نے اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں کر رہی ہو تو آجاؤ باہر امان بھی تمہارا پوچھ رہا تھا۔"

"امان بھی آیا ہوا ہے۔" زل اٹھی تھی۔

"ہاں نا۔ وہ بڑھا کو صاحب بھی آج وقت نکال کر آ ہی گئے زین کو رخصت کرنے۔ ویسے زل یار...... سوری سوری زل بیبی۔" بی بی اماں اسے یار کہنے پر ٹوکتی تھیں تو وہ آج کل بیبی کا لفظ استعمال کر رہی تھی۔

"بی بی اماں نہیں ہیں سحرش بی بی آپ "یار" کہہ سکتی ہیں۔" ساجدہ اس کی طرف دیکھ کر ہنسی۔

"ویسے میرا میاں بھی نا کبھی کبھی مجھے یار ساجو کہہ دیتا ہے۔"

"شکر ہے بی بی اماں نے کبھی سنا نہیں ورنہ اسے بھی منع کر دیتیں۔" سحرش کے لبوں پر شرارت تھی۔

"ہاں یہ تو ہے۔" ساجدہ کھل کر ہنسی تھی۔

"تم کچھ کہہ رہی تھیں۔ سحری۔" زل نے اس کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں میں کہہ رہی تھی کہ تم نے روکا نہیں زین کو۔" اب وہ دونوں برآمدے کی طرف جا رہی تھیں۔

"نہیں۔" زل نے نفی میں سر ہلایا۔

"سمیرا کا خیال ہے کہ جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی۔"

"سمیرا۔" سحرش نے برا سا منہ بنایا۔

"تمہیں نہیں لگتا زل کہ وہ کچھ منافق سی ہے۔"

"نہیں تو۔ تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے۔"

"پتا نہیں لیکن مجھے لگتا ہے زل! وہ ایسی نہیں ہے۔ جیسے دکھتی ہے۔" زل نے دیکھا کہ مہرین ماہ وش، سمیرا اور ثوبیہ کسی بات پر ہنس رہی تھیں۔ برآمدے میں تخت کے پاس مزید کرسیاں بھی پڑی تھیں۔ وہ سحرش کی بات کا جواب دیے بغیر مہرین کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جب کہ سحرش تخت پر ثوبیہ کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ سحرش، ثوبیہ اور سمیرا کا رخ صحن کی طرف تھا جبکہ مہرین ماہ وش اور زل کی پشت تھی۔ امان نے زل اور سحرش کو آتے دیکھا تو صحن سے اٹھ کر برآمدے میں آیا۔

"السلام علیکم زل آپی! کیسی ہیں۔"

"اللہ کا شکر ہے۔ تم سناؤ کیسے ہو۔ بہت دنوں بعد چکر لگایا دادا جان بہت یاد کر رہے تھے۔" زل کو امان چھوٹے بھائیوں کی طرح ہی لگتا تھا۔

"بس کچھ مصروف رہا پہلے پھر چند دنوں کے لیے گھر چلا گیا تھا۔ کل ہی واپس آیا ہوں تو زین بھائی کا پیغام ملا۔"

امان گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھیں اور چہرے پر بکھری اداسی نے اسے بھی افسردہ کر دیا تھا۔

"ویسے یہ زین بھائی اچانک وہاں کیوں جا

رہے ہیں۔ کیا ظفر ماموں کی خواہش ہے۔
"کمال ہے سب ہی زنل سے پوچھتے ہیں کہ زین کیوں جا رہا ہے بھئی اس سے پوچھیں جو جا رہا ہے اس کو تو خود نہیں پتا کہ وہ آخر کیوں جا رہا ہے۔ اور یہ آپ کے زین بھائی انہیں اپنے ابا کی خواہش کی پروا نہیں ہے کچھ۔ اپنی ہی کسی خواہش کے چکر میں جا رہے ہیں حضرت۔"
سحرش کا بات کرنے کا وہی مخصوص انداز امان نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ وہ سحرش کی باتوں کو جب بھی یہاں آتا بہت انجوائے کرتا تھا۔ یونیورسٹی میں بھی کبھی کبھار سامنا ہو جاتا تھا۔
"یقیناً آپ بہتر جانتی ہیں اور بقول آپ کے اپنے آپ کا مشاہدہ غضب کا ہے۔"
"تو اور کیا۔" سحرش نے کندھے اچکائے۔
"آپ گھر گئے ہوئے تھے پھپھو کیسی ہیں اور ہمارے ریحان بھائی کے کیا ارادے ہیں۔"
"اللہ کا شکر ہے اماں جان ٹھیک ہیں بالکل اور آپ کے ریحان بھائی کے ارادے بھی نیک ہیں۔ جلد ہی دو تین ہفتوں کے لیے آنے والے ہیں اور اماں جان پروگرام بنا رہی ہیں کہ ان دو تین ہفتوں میں ہی مہرین بھابی کی رخصتی کروالی جائے۔ ریحان بھائی کے آنے کا پروگرام فائنل ہو جائے تو وہ اور ابا جان آئیں گے اس سلسلے میں ماموں جان سے بات کرنے۔"
امان نے مسکرا کر مہرین کی طرف دیکھا۔ جس کے رخساروں پر ہلکی سرخی تھی اور پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔ زنل بھی مہرین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جو امان کے دیکھنے پر مدھم سا مسکرائی تھی تو مہرین نے اس رشتے کو ذہنی طور پر قبول کر لیا ہے۔ پرانا نقش بھلے ابھی نہ مٹا ہو لیکن نئے نقش نے اپنے لیے جگہ بنا لی تھی۔ زنل نے اپنے دل میں بے حد اطمینان اور خوشی محسوس کی۔
"واؤ...... یہ تو بڑی خوشی کی خبر سنائی تم نے امان۔" سحرش زیادہ دیر تک آپ جناب نہیں کر سکتی

تھی۔ اس سے پہلے کہ اماں کچھ کہتا صحن کا دروازہ پھر کھلا تھا آنے والا مرتضیٰ تھا۔ سمیرا نے اب بھی دروازے کی آواز پر بے اختیار ادھر دیکھا تھا۔ مرتضیٰ کی نظریں سمیرا سے ملیں تو وہ صحن میں رکے بغیر برآمدے میں آ گیا۔
"کیسی ہو سمیرا۔ دو تین روز سے تمہیں فون کر رہا تھا تم اٹینڈ نہیں کر رہی تھیں۔ خیریت تھی۔"
"ہاں بس موڈ نہیں تھا کسی سے بات کرنے کا۔" سمیرا جو ایک بار پھر وجدان کے بجائے مرتضیٰ کو دیکھ کر مایوس ہوئی تھی۔ بیزاری سے بولی۔
"وجدان نہیں آیا۔" اس کی بے زاری کو نوٹس کیے بغیر مرتضیٰ نے صحن میں نظر دوڑائی۔ سمیرا نے سر ہلا دیا۔ نظر تو آ رہا ہے کہ وجدان نہیں ہے تو پھر خوامخواہ ہی پوچھ رہا ہے۔ سمیرا جھلائی اور سحرش کی طرف متوجہ ہوئی۔
"شانزہ بھی آئے گی نا۔"
"وہ اوپر ہی ہے ماہ وش کے شہزادے کو سنبھالے بیٹھی ہے۔" شانزہ اپنے سسرال سے ہمیشہ کے لیے آ گئی ہے سمیرا کو اس کا علم نہ تھا۔ اور نہ ہی سحرش نے تفصیل بتانا مناسب سمجھا تھا۔
"اور تم سناؤ کزن تمہارے برادر محترم کا کیا حال ہے۔ آئے نہیں ابھی تک واپس۔ خیر خبر رکھا کرو کہیں کسی گوری سے دل ہی نہ لگا بیٹھیں۔ اور بے چاری ہماری مہرو کا دل ٹوٹ جائے۔"
مرتضیٰ کو سمیرا کا اسے اگنور کرنا ناگوار محسوس ہوا تھا سو وہ امان کی طرف متوجہ ہوا تھا۔
امان کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ سحرش اور زنل کو بھی برا لگا۔ مہرین کا چہرہ سپاٹ تھا اور وہ جیسے اپنے دھیان میں مگن گود میں رکھی عینک کو اٹھا کر دیکھ رہی تھی پھر دوپٹے کے پلو سے اس کے شیشے صاف کرنے لگی۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد امان بولا۔ وہ بھی بات دل میں رکھنے کا قائل نہیں تھا۔
"ریحان بھائی پڑھنے گئے ہیں گوریوں سے دل لگانے نہیں، ویسے بھی جن کی مہرین بھابی جیسی

ہوی ہوا نہیں ادھر ادھر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی خوش قسمتی پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور بہت جلد مہرین بھابی کو لینے آ رہے ہیں۔" مہرین نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر ممنونیت سے امان کو دیکھا۔

"ہوں مہرین تو جیسے کوئی ملکہ عالیہ ہے۔ چشما ٹو۔" مرتضیٰ دل ہی دل میں کہتے ہوئے اپنی جھینپ مٹانے کے لیے ہنسا۔

"گیت تو پڑھنے ہی ہیں تمہارے ڈاکٹر صاحب لیکن بندے کا کیا پتا ہوتا ہے کب دل کسی پر آ جائے پھر ساری خوش قسمتی گئی بھاڑ میں۔"

"ہر بندہ تمہاری طرح نہیں ہوتا مرتضیٰ کہ ہر اچھی شکل دیکھ کر دل ہاتھوں سے نکلنے لگے۔" سمیرا کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ سحرش نے خوش ہو کر اسے دیکھا اور اس کے متعلق اپنی رائے تبدیل کی۔ خیر ایسی بھی منافق نہیں ہے سمیرا۔ مرتضیٰ جز بز سا ہوا تھا۔

"تم نے کہاں دیکھا میرے دل کو ہاتھ سے نکلتے۔"

"تم تو برا مان گئے مرتضیٰ، میں تو مذاق کر رہی تھی۔" سمیرا ابھی مرتضیٰ کو ناراض کرنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ وہ مسکرائی۔

"یہ اچھا مذاق ہے، لے کر میرے کردار کو ہی مشکوک بنا دیا۔"

وہ ناراضی سے کہتا ہوا صحن کی طرف جانے لگا تھا کہ سحرش کی بات سن کر رکا وہ مسکراتی ہوئی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"آپ بھی تو ریحان بھائی کے کردار کو مشکوک بنانے کی کوشش کر رہے تھے سو حساب برابر ہوا۔"

"تم تو اپنی چونچ بند ہی رکھا کرو۔" مرتضیٰ نے اپنا غصہ اس پر نکالا اور تیزی سے صحن کی طرف بڑھ گیا جہاں سب ابھی تک کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ امان نے مسکرا کر سحرش کی طرف دیکھا جس کے لبوں پر ابھی تک شریر سی مسکراہٹ ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ سحرش کی باتوں کو ہمیشہ انجوائے کرتا تھا۔ اسے اس کی کچی اور کھری باتیں اٹریکٹ کرتی تھیں۔ تنقید کرتے ہوئے وہ یہ نہیں دیکھتی تھی کہ اس کی زد میں اس کے اپنے آ رہے ہیں۔ شاید بہت سارے لوگوں کی نظروں میں یہ اچھی عادت نہ ہو۔ لیکن وہ جیسے اس کی اسی نیچر کا اسیر ہو رہا تھا۔ اگر زندگی کے سفر میں سحرش جیسا ہمسفر مل جائے تو زندگی خوب گزرے گی ابھی ابھی اس کے دل میں خیال آیا تھا اور وہ اپنے خیال میں مگن بے دھیانی سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو کیا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں۔" سحرش کی برداشت اتنی ہی تھی۔

"ہاں شاید۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تو سحرش نے بوکھلا کر اپنے سر پر ہاتھ رکھا۔

"کیا واقعی۔" اور امان بے اختیار ہنسا تو وہ جھینپ گئی اور اس کے رخساروں پر شفق سی نمودار ہوئی۔ دلچسپی سے اسے دیکھتا ہوا امان بھی واپس صحن میں چلا گیا تو سمیرا ایک دم اٹھی اسے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ وجدان نہیں آیا تھا اور شاید اب نہیں آنے والا تھا۔

"کیا ہوا۔ جا رہی ہو۔" زل نے پوچھا۔

"ہاں نہیں اب زین نے دعوت دی ہے تو اس کے ساتھ یہ آخری کھانا مس تو نہیں کر سکتی۔"

"آخری کھانا کیوں بھئی ابھی زین جب واپس آئے گا تو زبردست دعوت کریں گی تمہاری اور بہت بار تمہیں زین کے ساتھ کھانا کھانے کا موقع ملے گا۔" سحرش کو برا لگا تھا۔

"ہم سب یہاں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنائے بیٹھے ہیں چلو سب صحن میں ہی چلتے ہیں۔ سنتے ہیں کیا سماج سدھار منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔" اس نے سحرش کی بات کا جواب دینے کے بجائے کہا اور ثوبیہ کا بازو پکڑ کر اٹھایا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" سحرش فوراً کھڑی ہو گئی تھی۔

"اپنی اپنی کرسیاں اٹھا کر لے چلو۔ صحن میں تین چار کرسیاں ہی خالی ہیں۔"

اور کرسیاں اٹھائے انہیں صحن کی طرف آتے دیکھ کر مرسل وغیرہ نے اپنے دائرے کو وسیع کر لیا تھا لیکن انہوں نے ان کی خالی کی گئی جگہ پر کرسیاں رکھنے کے بجائے ذرا سے فاصلے پر نیم دائرے کی شکل میں اپنی کرسیاں رکھی تھیں یوں کہ ان کا رخ ان کی طرف تھا مرسل زین، اسد اور عمر بالکل ان کے سامنے تھے۔

''تم نے وجدان کو دعوت نہیں دی تھی مرسل۔'' اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے سمیرا نے پوچھا۔

''میں نے فون کیا تھا اسے۔ اس کے دادا جان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھے اس نے کہا تھا اگر ان کی طبیعت بہتر ہوئی تو وہ ضرور آئے گا زین سے ملنے۔''

مرسل کی بات سن کر وہ مضطرب سی ہوئی۔ اس کے دادا جان بیمار تھے اور اس نے اسے بتایا تک نہیں تھا۔ حالانکہ پہلے تو اس کی بہن کی کیٹو (بلی) بھی بیمار ہوتی تو وہ بتاتا تھا۔ اور اب اتنا خفا ہے اس سے کہ دادا جان کے متعلق بتایا تک نہیں۔

دل کے اندر درد کی لہری اٹھتی محسوس ہوئی تھی۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں ایسے جنہیں اپنی معمولی سی تکلیف بھی بہت محسوس ہوتی ہے اور دوسروں کی بڑی سے بڑی تکلیف کا احساس تک نہیں ہوتا۔ سمیرا بھی ان ہی لوگوں میں تھی۔

''کیا تمہیں علم نہیں تھا اس کے دادا جان کی بیماری کا۔'' مرسل ابھی تک اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

''ہاں۔'' وہ چونکی۔

دراصل گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے۔ اور پھر حمیرا کی شادی کا بھی مسئلہ تھا۔ بہت دنوں سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ خیال تھا آج یہاں ملاقات ہو جائے گی۔ ویسے کس ہاسپٹل میں ہیں وہ۔''

''عمر ہاسپٹل میں۔'' مرسل نے بتایا۔

''میرا خیال ہے کل ہم سب چلتے ہیں ان کی مزاج پرسی کے لیے۔ ملاقات بھی ہو جائے گی۔ مجھے تو پھر چلے ہی جانا ہے۔''

طیب نے رائے دی اور اپنی چھوڑی ہوئی بات کا سرا پکڑا۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا پچھلے سال یعنی دو ہزار تین میں اتنی پرانی بات تو نہیں ہے جب صدام کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو کتنے مسلم ممالک تھے جنہوں نے اس ظلم و بربریت کے کھیل کے خلاف آواز اٹھائی جو عراق کی سڑکوں پر کھیلا گیا۔ کسی ملک نے سوال اٹھایا کہ کہاں ہیں وہ کیمیائی بم اور ہتھیار جن کا بہانہ بنا کر عراق کو تباہ و برباد کیا گیا۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ پس پردہ کیا مقاصد تھے صرف تیل کے کنوؤں پر قبضہ ہی نہیں پوری مسلم اُمہ کو کمزور کرنا۔ یہ دو ہزار تین ہی کی تو بات ہے جب مسلم اُمہ کے خلاف باقاعدہ ایک منصوبہ تیار کیا گیا۔ صدام حکومت کا خاتمہ بھی اسی منصوبے کی ایک کڑی تھی۔''

طیب سانس لینے کے لیے رکا تو کم گو سے عمار نے جھرجھری سی لی۔

''کہتے ہیں 1502ء میں جو ظلم ازابیلا نے کیا تھا پانچ سو سال بعد امریکی افواج نے عراق میں کیا۔ اور یہ ہمارے سامنے کی بات ہے جب میں سوچتا ہوں اس روز کے متعلق جب پانچ اپریل کو امریکی فاتح عراق میں داخل ہوئے تھے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں بش نے سات ہزار سالہ تاریخی اور تہذیبی ورثے کو خاکستر کر ڈالا۔ 1258ء میں منگولوں نے بغداد میں تعلیمی اور علمی ورثے کو نذر آتش کیا تھا اور اب امریکہ۔ کیسی بدنصیب قوم ہیں ہم اور کیا قصور ہے ہمارا کہ۔''

''وہی قصور ہمارا ہے جو غرناطہ کا تھا۔'' مرسل کے لبوں سے یہ جملہ کسی آہ کی طرح نکلا تھا۔ اس سے پہلے کہ عمار مزید کچھ کہتا بچے کے رونے کی آواز سن کر سب سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگے۔ شازیہ شرقی سیڑھیوں سے ماہ وش کے بیٹے کو اٹھا کر لا رہی تھی۔ ماہ وش یکدم کھڑی ہو گئی تھی۔

''سنبھالو اپنے شہزادے کو۔ قابو میں ہی نہیں آ

رہے۔" شانزہ نے قریب آ کر بچہ ماہ وش کے حوالے کیا۔ جو اس کے پاس جاتے ہی خاموش ہو گیا تھا۔

"اچھا بھلا کھیلتے کھیلتے حلق پھاڑ پھاڑ کر رونے لگا۔"

"اس کے سونے کا وقت ہے۔ نیند آ رہی ہو گی۔ میں اسے سلا کر آتی ہوں۔" اسے کندھے سے لگاتے ہوئے ماہ وش اسے تھپکتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ شانزہ بھی اس کے پیچھے جانے لگی تو سحرش نے ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔

"تم کہاں جا رہی ہو۔ بیٹھو ادھر۔"

"میں بھلا کیا کروں گی یہاں بیٹھ کر۔" وہ جو کبھی بے حد سوشل ہوا کرتی تھی، اب لوگوں سے گھبرانے لگی تھی اسے لگتا تھا جیسے سب اسے ہی دیکھ رہے ہیں۔ اسی کے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔

"وہی جو ہم سب کریں گے۔ یعنی ماضی اور حال کے متعلق معلومات، یہ سب لوگ بڑے پہنچے ہوئے اور عالم فاضل حضرات ہیں۔" اس نے بائیں ہاتھ سے ان کی طرف اشارہ کیا۔ "ہم ان کے علم سے استفادہ کر رہے ہیں۔ تم بھی کر لینا۔"

عمار جھینپ سا گیا۔

"ہم تو بہت معمولی سا علم رکھتے ہیں۔ لیکن تم بھی نا سحرش لمحوں میں آدمی کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیتی ہو۔"

"اور لمحوں میں ہی آسمان سے زمین پر بھی لے آتی ہے۔" سمیرا کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ہاں یہ تو ہے۔" اس نے فخر کے اظہار کے لیے تھوڑی سی گردن اکڑائی۔ اور شانزہ کے ہاتھ کو ہلکا سا دباتے ہوئے پاس پڑی کرسی پر بٹھا لیا۔

"اب خود کو اس خوف سے نکال لو شانے۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا اس ٹراما سے خود کو باہر نکالو۔ سب سے گھلو ملو۔ زندگی میں دلچسپی لو۔" سحرش نے تقریباً اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"کوشش تو کرتی ہوں۔" زیرلب کہتے ہوئے اس نے غیر محسوس انداز میں اپنی کرسی تھوڑی سی پیچھے کھسکائی کہ اس کے بالکل سامنے عمر تھا۔ جو اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ ایک تاسف سا اس کی آنکھوں میں اترا تھا اور دوسرے ہی لمحے وہ مرسل کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

مہرین نے عینک کے شیشوں کے اوپر سے اسے دیکھا اور دل سے اٹھنے والی آہ کو اپنے اندر ہی دبا لیا۔ کیا تھا اگر اماں عقیل کی دولت سے متاثر نہ ہوتیں اور عمر بھائی کے رشتے سے انکار نہ کرتیں تو آج شانزہ کتنی خوش ہوتی۔

تب ہی صحن کا دروازہ کھلا اور ضیاء کندھے پر سفری بیگ لٹکائے اندر داخل ہوا۔

"السلام علیکم۔" سب کو سلام کرتا ہوا وہ عمر کے ساتھ والی خالی کرسی پر بیٹھ گیا اور بیگ کندھے سے اتار کر نیچے رکھا۔

"تھینک گاڈ تم آ گئے ورنہ ہم تو اب مایوس ہی ہو گئے تھے۔" اسد نے اس کے بازو پر ہلکے سے ہاتھ مارا۔

"میں تو اپنی طرف سے جلدی نکلا تھا راستے میں کوچ خراب ہو گئی تھی تو لیٹ ہو گیا اسی لیے تو بس اسٹاپ سے سیدھا ادھر ہی آ رہا ہوں گھر جاتا تو پھر لیٹ ہو جاتا۔ بہت دیر ہو جاتی تو آ ہی نہ پاتا۔" اس کا گھر شادمان میں تھا۔

"ہاں یہ تم نے اچھا کیا۔ کیا خبر پھر کبھی زندگی میں ملاقات ہو یا نہ ہو۔" اسد کو اس کا بس اسٹاپ سے سیدھا ادھر آنا ٹھیک لگا تھا۔

"خیر یہ پھر ملاقات نہ ہونے والی کہانی تو بھول جاؤ میں تو ہر چھ ماہ بعد ایک ماہ کی چھٹی پر گھر آ جایا کروں گا۔ چاچو نے بتایا ہے کہ جس کمپنی میں میری جاب ہوئی ہے وہاں ہر چھ ماہ بعد چھٹی مل سکتی ہے اور اگر سال بعد چھٹی لیں تو پھر دو ماہ کی۔" طیب کے چچا کئی سالوں سے شارجہ میں تھے اور انہوں نے ہی اسے وہاں بلوایا تھا۔

"تم تو خیر کب سے اڑان بھرنے کے لیے پر

تو لے بیٹھے تھے۔ لیکن جب [illegible] زین [illegible]
تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ زین بھی۔"

ضیاء جانتا تھا کہ طیب کو جب بھی موقع ملا وہ یہاں سے چلا جائے گا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ یہ ملک ہم جیسے لوگوں کے رہنے کے قابل نہیں ہے اور ہم جیسے ملک سے سچی محبت کرنے والے اس ہنر سے نا آشنا ہیں۔ سوان کی کوششوں اور خلوص کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔

"ہاں میں پچھلے ایک سال سے کوشش کر رہا تھا کیونکہ یہاں کے سیاست دانوں اور سیاست نے مجھے بے حد مایوس کیا ہے۔"
طیب نے اعتراف کیا۔

"ایسی بھی بات نہیں ہے یار! تم خوامخواہ مایوس ہو رہے ہو۔" ضیاء ہمیشہ پرامید رہتا تھا۔

بھاگ مسافر بھاگ
میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ

طیب نے لہک لہک کر کہا۔

"تم سب کے لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ موقع ملے تو نکل جاؤ کہیں کسی اور ملک میں۔"

"تم اپنے مشورے اپنے پاس ہی رکھو۔" ضیاء نے برا مانا اور آزین کی طرف دیکھا۔

"تو کیا تم بھی مایوس ہو کر جا رہے ہو۔"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے یار! میں نہ اپنے ملک سے مایوس ہوں نہ لوگوں سے۔ میرے دادا جان نے ہمیں مایوس ہونا نہیں سکھایا وہ کہتے ہیں کہ یہ ملک، یہ پاک سرزمین یہ چند سیاست دانوں اور حکمرانوں نے نہیں بنائی۔ یہ اللہ کا معجزہ ہے۔ اور جس دن ہم نے انفرادی طور پر خود غرضی اور کوتاہی کا دامن چھوڑا یہ ملک بھی ترقی یافتہ ملکوں میں شمار ہوگا۔"

"تو پھر کسی اور وجہ سے مایوس ہو کر جا رہے ہو۔" سمیرا کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔

آزین کی نظریں بے اختیار اس کی طرف اٹھیں۔ سمیرا یقیناً جانتی تھی کہ وجدان زنل سے محبت کرتا ہے اور آزین ہی متوجہ ہے۔ وجدان اور سمیرا کے درمیان گہری دوستی تھی اور پھر مرتضیٰ نے اسے بتایا تھا کہ سمیرا وجدان کو پسند کرتی تھی اور دونوں شادی کرنے والے تھے لیکن زنل۔ اس کی آنکھوں سے کرب جھلکا اور خود کو کمپوز کرنے کے لیے اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے اتنی زور سے دبایا کہ خون چھلکنے لگا لیکن جب وہ بولا تو اس کی آواز بہت متوازن اور ہموار تھی۔

"نہیں میں کسی سے بھی مایوس ہو کر نہیں جا رہا۔ دراصل میرے ابا بہت عرصہ سے چاہ رہے تھے کہ میں ان کے ساتھ رہوں۔ ان کی صحت بھی کچھ ٹھیک نہیں رہتی تو۔"

"لیکن یار تم تو کہتے تھے کہ تمہیں کسی دوسرے ملک کی شہریت نہیں چاہیے۔ اپنے ملک کی آدھی باہر کی پوری سے اچھی ہے۔" ضیاء نے اس کی بات کاٹی تھی۔

"بس یار وہ ابا ہمیشہ بلاتے تھے اور میں منع کر دیتا تھا۔ لیکن اب سوچا کہ ان کی بات مان لوں اور کچھ عرصہ ان کے پاس رہ لوں۔"

آزین کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اس نے صبوحی کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ظفریاب کو تو شاید ابھی تک اس کے وہاں آنے کا علم بھی نہیں تھا اس نے سوچ رکھا تھا آج رات انہیں فون کر کے اپنے وہاں آنے کے متعلق بتا دے گا۔

"میں نے انہیں ہمیشہ ناراض کیا۔ بہت دکھ دیا ہے انہیں۔"

"کیا واقعی۔" سمیرا کی آنکھوں میں تمسخر تھا۔

"ہاں ابا نے جب بھی وہاں بلایا میں نے منع کر دیا۔" آزین نے سادگی سے کہا۔

"اوہ اچھا۔" سمیرا کا جی چاہا کہ اس سے کہے تم نے نہیں آزین ظفریاب تمہاری والدہ محترمہ نے تمہارے ابا کو دکھ دیا ایک پانچ بچوں کے باپ کو اپنی اداؤں میں پھنسا کر۔ لیکن وہ خاموش ہی رہی تھی۔ اسے یہ تو علم تھا کہ اس بار ڈیڈ کے ساتھ ان کی بیگم بھی

پاکستان آئی ہوئی ہیں لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ صبوحی کی ملاقات زین سے ہو چکی ہے اور زین اس کے ساتھ ہی جا رہا ہے۔ ابرار شاہ سے اس کی ہمیشہ کی طرح رسمی سی بات ہی ہوئی تھی، البتہ وہ اس بات پر خوش تھی کہ انہوں نے حمیرا کے لیے اسٹینڈ لیا تھا اور اس کی پسند کی شادی کے لیے تقریباً سب کو ہی رضامند کر لیا تھا۔

''تمہارے رویے اور انداز سے تو ایسا لگتا ہے جیسے سارے بندھن توڑ کر جا رہے ہو پھر کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔'' سمیرا پتا نہیں کیا جاننا چاہتی تھی۔

''بندھن دلوں سے جڑے ہوتے ہیں سمیرا وہ اتنے کمزور نہیں ہوتے کہ ٹوٹ جائیں اور رویے حالات کے تابع ہوتے ہیں۔ وقت اور حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے رویے بدل بھی جائیں تو بندھن نہیں ٹوٹتے۔''

غیر ارادی طور پر زین کے لبوں سے نکلا تھا۔

''میں اپنی زندگی کی آخری سانس تک رشتوں کے اس بندھن سے جڑا ہوں۔ یہاں میرے سب ہیں دادا جان چچا جان۔'' لمحہ بھر کے لیے اس کی نظریں زنل کی طرف اٹھی تھیں۔

''اور سب سے بڑھ کر اس مٹی اور زمین سے جو رشتہ ہے وہ اٹوٹ ہے کچھ عرصہ ابا کے پاس رہ کر واپس آ جاؤں گا۔''

اس نے اپنے اور زنل کے رشتے کے حوالے سے بات نہیں کی تھی اس کا اشارہ دادا جان چچا جان اور دوسرے رشتوں سے تھا لیکن سمیرا کے اندر کہیں آگ سی بھڑکی تھی جب کہ زنل کے اندر کی بے قراری کو سکون سا ملا تھا اور سحرش کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی کہ اسے سمیرا کی بات اچھی نہیں لگی تھی اور زین کا جواب پسند آیا تھا۔

''شیور۔'' سمیرا کی آنکھوں میں بے یقینی تھی اور لبوں پر اب بھی طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔

''شیور۔''

آ زین نے پورے یقین سے کہا اسے بہرحال واپس آنا تھا وہ زیادہ عرصہ تک اپنے گھر اپنے لوگوں اور اپنی مٹی سے دور نہیں رہ سکتا تھا اسے بس کچھ وقت چاہیے تھا۔ خود کو مضبوط بنانے کے لیے بعض فیصلے بڑے جان لیوا اور روح کش ہوتے ہیں لیکن کرنے پڑتے ہیں اس نے بھی زنل کی خوشی کے لیے اسے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن پہلے وہ وجدان سے ملنا چاہتا تھا۔ یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ وہ زنل کے ساتھ مخلص ہے۔ اور کیا زنل اس کے ساتھ خوش رہے گی۔ اسے زنل کی خوشیوں کی ضمانت چاہیے تھی۔ اور اس کے لیے اسے وجدان سے کھل کر بات کرنی تھی۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ اس سے ملنے کا سوچ رہا تھا لیکن صبوحی کی آمد۔ اس کا یو۔ کے جانے کا فیصلہ وہ اتنا ڈسٹرب رہا تھا کہ باوجود خواہش کے مل نہیں پایا تھا۔ لیکن اب کل وہ اس سے ملے گا اس نے سوچ لیا تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ آنے والے چند سالوں تک وہ اس سے مل نہیں پائے گا۔

''پھر کب تک واپس آ رہے ہو۔'' سمیرا اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''کیوں کیا تم نے پھولوں کے ہار لے کر استقبال کے لیے ایئر پورٹ پر جانا ہے۔'' سحرش کی برداشت اتنی ہی تھی۔ اماں کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ اسے بھی سمیرا کا یوں زین کے دوستوں کے سامنے ایسی باتیں کرنا جن کا تعلق زین کی ذات سے تھا اچھا نہیں لگا تھا تو سحرش کے ساتھ زندگی کا سفر بہت مزے سے گزرنے والا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے سحرش کے حوالے سے جو خیال اس کے ذہن میں آیا تھا اس پر اس نے جیسے مہر لگا دی تھی۔ اور یقیناً اماں جان اور ابا جان کو اس پر اعتراض نہیں ہو گا۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

''جا بھی سکتی ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے کیا۔'' سمیرا وجدان کی ناراضی کا غصہ اور جلن اس

طرح کی بلامقصد باتیں کر کے نکال رہی تھی۔
"مجھے کیا اعتراض ہو گا تم بینڈ باجے بھی لے جانا۔" سحرش کی آنکھوں میں شریری چمک تھی۔ سمیرا نے جز بز ہو کر پہلو بدلا تھا اور ایک بار پھر زین کو مخاطب کیا تھا۔
"تم تو خیر واپس آنے کے لیے جا رہے ہو لیکن پیچھے رہ جانے والے کہیں تمہارے انتظار سے تھک کر راستہ ہی نہ بدل لیں دھیان رکھنا۔"
زین کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں نمودار ہوئیں۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ سمیرا اسے کیا جتانا چاہ رہی ہے۔ سحرش نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ پاس بیٹھی مہرین نے اس کے بازو پر چٹکی بھری اور آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش رہنے کا کہا۔ وہ نہیں چاہتی تھی خوامخواہ بات بڑھے اور بدمزگی ہو۔
"بعض لوگ ایسے درندے ہوتے ہیں جن کے دانت اور ناخن دکھائی نہیں دیتے اور اس وقت سمیرا مجھے اسی قطار میں کھڑی نظر آ رہی ہے۔" اپنا بازو مسلتے ہوئے اس نے مہرین کے کان میں سرگوشی کی۔
"اور یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جنہیں انسان دل ہی دل میں دس بار قتل کرتا ہے۔ اور میرا بھی اس وقت سمیرا کو قتل کرنے کا جی چاہ رہا ہے۔"
مہرین نے تائید میں سر ہلایا تھا۔ خود وہ دن میں پچاسوں بار عقیل کو کرتی تھی۔ اس کی آواز بھی سرگوشی جیسی تھی۔
"ہاں ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے مکروہ اور غلیظ کہ بعض اوقات جانوروں کے درجے سے بھی گر جاتے ہیں اور اپنے کردار کی غلاظت سے اردگرد کے ماحول کو بھی گندہ کر دیتے ہیں عقیل جیسے۔"
اس نے عقیل کے ساتھ بھائی لگانا چھوڑ دیا تھا۔
"سرگوشیاں کرنا آداب محفل کے خلاف ہے سسٹرز۔" اسد بہت دیر سے موضوع بدلنا چاہ رہا تھا۔
"کچھ باتیں سر محفل نہیں کی جا سکتیں نقص امن کا خطرہ ہوتا ہے۔ پھر بھی سوری۔" سحرش نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔
"ضیاء یار! وہ تم نے بتایا تھا ایک بار تمہاری کمپنی کو کالا باغ ڈیم کا کام مل رہا ہے۔"
مرسل بھی نہیں چاہتا تھا کہ سمیرا اور زین کے درمیان پھر کوئی ایسی بات چیت شروع ہو جس سے زین کا موڈ خراب ہو۔ اس لیے اس نے ضیاء کو مخاطب کیا۔
"ہاں۔"
ضیاء جو کرسی کی ہتھی پر کہنی ٹکائے رخسار کے نیچے ہاتھ کی مٹھی رکھے سمیرا اور زین کے درمیان ہونے والی گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا چونک کر اسے دیکھنے لگا۔
"ایسا ہی تھا کافی کام کر لیا تھا مطلب ابتدائی کام کچھ رہائشی کوارٹر وغیرہ بن رہے تھے شاید۔"
وہ آج کل کمپنی کی طرف سے کسی پراجیکٹ کے سلسلے میں اسلام آباد میں تھا۔
لیکن پھر اچانک کام روک دیا گیا۔
"ہمارے ہاں کالا باغ جیسے منصوبے بھی سیاست کی نذر ہو گئے۔ ہیں۔ کیا ہے یار ہماری سیاست، انسانیت کا زوال، قوم کا استحصال۔"
طیب کو تو موقع چاہیے ہوتا تھا سیاست پر بولنے کا سو وہ پورے جوش سے بول رہا تھا۔
"اب دیکھو نا بھارت میں وسیع پیمانے پر آبی ذخائر محفوظ کرنے کا کام ہو رہا ہے۔ لیکن پاکستان نے 1974ء کے بعد کوئی ڈیم نہیں بنایا۔ کشن گنگا ڈیم کی تعمیر پر اگر سخت موقف اختیار کیا جاتا تو پاکستان کو بنجر بنانے کی سازش نہ کی جاتی۔"
"کوئی اور بات کرو یار! چھوڑو یہ سیاست کی باتیں۔"
ضیا تھکا ہوا تھا سو بور ہو رہا تھا۔
"اوہ سوری ضیاء بھائی۔"
زل کی نظر اچانک ہی ضیاء پر پڑی تھی اور وہ کھڑی ہوئی تھی۔
"آپ سفر کر کے آئے ہیں، تھکے ہوئے ہوں

گے۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔"
"تھینک یو بہنا اس وقت سچ میں چائے کی بے حد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔"
ضیاء بھی بچپن سے ادھر آ رہا تھا۔ شادمان جانے سے پہلے وہ یہاں قریب ہی رہتے تھے۔ زین سے ایک سال بڑا تھا اور اس نے یونیورسٹی سے سول انجینئرنگ کی تھی۔
"کیا کسی اور کو بھی چائے چاہیے۔"
زل نے کچن کی طرف جاتے جاتے پوچھا تو سب نے انکار کر دیا۔
"نہیں شکریہ اب کھانا ہی کھائیں گے۔" زل کو جواب دے کر اسد نے سب کی طرف دیکھا۔
"ہاں تو دوستو میں بہت دیر سے ایک بات کرنا چاہ رہا تھا، سیاست پر بات نہیں ہوگی۔"
ضیاء نے ہاتھ بلند کیا۔
"بالکل بھی نہیں۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ زین اور طیب جا رہے ہیں۔ اور ہم میں سے بھی کوئی بھی کہیں جا سکتا ہے تو آج عہد کریں کہ ہم جہاں بھی ہوں گے جو کام ہم نے شروع کیا ہے اسے جاری رکھیں گے۔ یہ سلسلہ رکنا نہیں چاہیے۔ زین اور طیب فنڈ کی صورت میں ہماری مدد کریں گے اور ہم یہاں عملی طور پر کچھ نہ کچھ کرتے رہیں گے۔ اگر بکھر گئے تو اپنے اپنے طور پر اپنی جگہ اپنے آس پاس موجود لوگوں کے کام آئیں گے۔"
"وعدہ۔" سب سے پہلے مرسل نے ہاتھ آگے بڑھایا تھا اور پھر اس کے ہاتھ کے اوپر سب نے ہاتھ رکھے تھے۔ سب کی آنکھیں اور چہرے چمک رہے تھے۔ بھلا یہ چند لوگ کیا کر سکتے ہیں اس ملک اور ملک کے لوگوں کے لیے۔ سمیرا کے ذہن میں خیال آیا تھا لیکن وہ خاموش رہی تھی۔
"ہاں تو خواتین آپ بھی عہد کرتی ہیں کیا۔"
اسد نے ان کی طرف دیکھا اب سب نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے تھے۔
"ہاں اپنی حد تک جو ہوسکا کرتے رہیں گے۔"

مہرین نے ناک تک پھسل آنے والی عینک کو درست کیا تو مرتضیٰ نے بیزاری سے اسے دیکھا اس لڑکی کو کبھی بھی صحیح سے عینک خریدنا نہیں آئے گی اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی نظریں سمیرا کی نظروں سے ملی تھیں جو اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔
سحرش نے دونوں کی نظروں کا تال میل دیکھا تھا۔ پتا نہیں کیا چل رہا ہے ان دونوں کے بیچ ابھی تک وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ "اب پتا نہیں یہ آنکھوں آنکھوں میں کیا اشارے کیے جا رہے ہیں۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ تب ہی ٹیرس پر سے جھانکتی گل بکاؤلی نے آواز دی۔
"سحرش باجی...... سحرش باجی۔"
اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔
"او جی باجی ذرا اوپر آ کر گل (بات) تو سن لیں ایک۔"
"کیا مسئلہ ہے بھئی۔" سحرش کھڑی ہو گئی تھی۔
"نہ جی مسئلہ تو کوئی نہیں ہے۔ وہ بلال بھائی کا فون آیا تھا ٹھیک ہیں۔ کل واپس آئیں گے۔ بیگم صاحبہ صاحب جی کو بتا رہی تھیں۔" بلال ملتان گیا ہوا تھا کسی دوست کی شادی میں شرکت کے لیے۔
"اچھا بتانے کا شکریہ۔" سحرش بیٹھنے ہی لگی تھی کہ وہ ریلنگ پر تھوڑا سا اور جھکی تھی۔
"پر باجی جی گل تے آ کرسن لو۔"
"اچھا بڑی آپا آ رہی ہوں۔" سحرش سیڑھیوں کی طرف بڑھی تو اس نے ساجدہ کو ٹرے اٹھائے آتے دیکھا۔ ٹرے میں چائے کے علاوہ بھی کچھ لوازمات تھے۔ کھانے میں ابھی کچھ دیر تھی اور ضیاء سفر کر کے آیا تھا۔ جانے کب کا نکلا ہوا تھا۔ زل بی بی اماں کی صحیح جانشین ہے۔ زل کے علاوہ شاید کسی کو یہ خیال نہیں آیا تھا۔ وہ دبے قدموں چلتی ہوئی ٹیرس پر آئی تھی اور نیچے جھانکتی ہوئی گل بکاؤلی کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ اچھل پڑی۔
"اوہ ہو جی آپ نے تو ڈرا ہی دیا ہے۔"
"ہاں اب بول کیا آفت آئی ہے تجھ پر۔"

سحرش جانتی تھی کوئی بڑی بات نہ ہوگی۔
''اللہ نہ کرے جی مجھ غریب پر کوئی آفت آئے۔ وہ تو جی بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں سب کی آج نیچے دعوت ہے۔ بی بی اماں خود کہہ کر گئی ہیں۔'' اس نے آواز آہستہ کر لی تھی۔
''تو سحرش باجی کیا میں بھی...... مطلب میں بھی۔ اور کب تک کھانا لگے گا۔''
''نہیں تمہیں بھوک لگی ہے نا تو صبح کا سالن پڑا ہے نا فریج میں دو روٹیاں پکا کر کھا لینا۔''
''نہ جی۔ نہ مجھے تو جی مٹن پلاؤ بہت پسند ہے۔''
وہ کچن کی طرف چلی گئی تو سحرش کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی یہ گل بکاؤلی بھی اپنی قسم کا ایک نمونہ ہی تھی لیکن اس کے آنے سے مونا اماں اور رخسانہ تائی کو سہولت ہو گئی تھی۔ کچن کا بہت سارا کام اس نے سنبھال لیا تھا۔ جاتے جاتے اس نے لاؤنج میں جھانکا۔ رخسانہ تائی اور اماں جان ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ ان کا کوئی پسندیدہ پروگرام لگا ہوا تھا۔
''شاہ رخ بھائی اور ابا جان آ گئے۔''
''ہاں بھئی آ گئے تیرے ابا کمرے میں آرام کر رہے ہیں اور تم کیا اتنی دیر سے نیچے دیگیں پکا رہی تھیں۔ بندہ کبھی اوپر بھی چکر لگا لیتا ہے کہ کیا خیر ماں کو کوئی کام ہو۔ لیکن تم تو نیچے جا کر چپک ہی جاتی ہو۔'' مونا نے مڑ کر اسے دیکھا۔
''آ...... ہا۔'' اس نے ناک سکیڑی۔
''کچھ جلنے کی بو آ رہی ہے۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے نیچے صرف ایک ہی دیگ پکی ہے۔ پلاؤ کی۔''
''ہیں سب کی دعوت اور صرف پلاؤ۔'' مونا بیگم نے ٹی۔ وی کی آواز آہستہ کی تھی۔
''نہیں...... خیر صرف پلاؤ تو نہیں ہے۔'' وہ شرارت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔
''اور ہاں ایک بات کہوں اب یہ جلی کٹی باتیں کرنا چھوڑ دیں۔ خالہ تائی کو بھی تو دیکھیں نا اور ہاں ایک نیوز ہے گرما گرم اختر بانو پھپھو جلد آ رہی ہیں ریحان بھائی کی شادی کی تاریخ لینے۔''
''ہیں کیا...... تجھے الہام ہوا ہے کیا۔''
''امان نے بتایا ہے۔'' وہ واپس مڑی۔
''سنو...... سنو پوری بات تو بتا کر جاؤ۔ کب آ رہی ہیں وہ۔''
انہوں نے بلایا تھا لیکن وہ ہنستی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اس نے سمیرا کو صحن کے دروازے کی طرف جاتے دیکھا پھر مڑ کر صحن میں دیکھا۔ زل ابھی تک کچن سے واپس نہیں آئی تھی۔ مہرین، شانزہ اور ثوبیہ خاموشی سے لڑکوں کی باتیں سن رہی تھیں جانے اب کیا موضوع چھڑا ہوا تھا۔ آخری قدمچے پر قدم رکھتے ہوئے اس نے سمیرا کو دروازہ کھول کر باہر جاتے دیکھا تو تیزی سے صحن کے دروازے کی طرف بڑھی۔
یہ سمیرا کھانا کھائے بغیر ہی جا رہی ہے۔ زل ہوتی تو اسے اس طرح نہ جانے دیتی۔ یقیناً میری کسی بات کا برا مان گئی ہو گی۔ کچھ دیر سے سوچوں میں گم بیٹھی تھیں محترمہ مجھے اسے روک لینا چاہیے۔ اب یہ تو اچھا نہیں لگتا کہ کھانا کھائے بغیر چلی جائے اس نے دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھا لیکن مرتضیٰ کی آواز سن کر دروازہ کھولتے کھولتے رک گئی وہ کہہ رہا تھا۔
''کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ۔''
''ہاں بتایا تھا۔'' یہ سمیرا تھی۔ ''کہ عنقریب سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ وہ اس سے متنفر ہو چکا ہے لیکن مجھے تو ایسا کچھ سین نظر نہیں آیا۔ سنا نہیں تھا تم نے کیا کہہ رہا تھا وہ۔''
''ہاں تو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ وہ۔'' مرتضیٰ پتا نہیں کیا کہنا چاہتا تھا لیکن سمیرا نے اسے ٹوک دیا۔
''میں چاہتی ہوں مرتضیٰ کہ تم آج ہی کچھ ایسا

کرو کہ معاملہ ختم ہو جائے اس کے جانے سے پہلے ہی۔ اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے۔"

"میرا فائدہ۔"

"ہاں ہاں بنو مت میں تو جیسے جانتی نہیں ہوں تمہیں۔"

"سحرش۔" مہرین کی نظر اس پر پڑی تو اس نے بلایا۔

"یہ مہرو بھی نا...... اکثر غلط وقت پر انٹری دیتی ہے۔" پوری بات نہیں سن سکی تھی وہ تیزی سے واپس مڑی تھی۔

"کہاں جا رہی تھیں۔" قریب آنے پر اس نے پوچھا۔

"کہیں نہیں...... ذرا شینو بابا کو دیکھنے جا رہی تھی کہ اگر ہیں تو اپنے لیے الرجی کی گولیاں منگوالوں ختم ہو گئی ہیں۔ پھر خیال آیا وہ تو کھانا وغیرہ لینے چلے گئے تھے۔" اسے بھی کبھار ڈسٹ سے الرجی ہو جاتی تھی۔

"میرے پاس ہیں، لے لینا۔"

مہرین نے بتایا تو وہ بیٹھ گئی۔ ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ آدھی ادھوری سنی گئی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یہ سمیرا کیا چلی گئی ہے۔ میں تو سوچ رہا تھا اسے کہوں گا واپسی پر مجھے ڈراپ کر دے گی۔"

ضیاء کو یکدم ہی خیال آیا تھا کہ سمیرا صحن کی طرف جا رہی تھی لیکن واپس نہیں آئی تھی۔

"نہیں۔" جواب ثوبیہ نے دیا تھا۔

"مرتضیٰ سگریٹ لینے جا رہا تھا تو وہ اس سے یہ کہنے گئی تھی کہ اس کے لیے ہوسٹ بھی لیتا آئے اس کا گلا دکھ رہا ہے۔"

"لگتا ہے مرتضیٰ کے ساتھ خود بھی چلی گئی ہے ہوسٹ لینے۔" اسد ہنسا تھا۔ تب ہی سمیرا اکیلی آتی ہوئی دکھائی دی۔ کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے ہی لگی تھی کہ یکدم اچھلی۔

"پاؤں پر کسی چیز نے کاٹ لیا ہے۔ بچھو...... بچھو نے کاٹ لیا ہے۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"یہاں بھلا بچھو کہاں سے آیا...... اور پھر اس موسم میں نہیں ہوتے بچھو کسی کیڑے نے کاٹا ہو گا۔"

مہرین نے جھک کر اس کے پاؤں کا جائزہ لیا اور فرش پر دو تین موٹے موٹے کالے کیڑوں (چیونٹے) پر نظر پڑی۔

"اوہ بہت ظالم کاٹتے ہیں یہ ادھر کسی کیاری میں بل بنا رکھا ہے انہوں نے اس روز میرے ہاتھ پر کاٹا تو خون نکل آیا تھا۔"

"شکر ہے بچھو نہیں تھا۔" ثوبیہ نے اطمینان بھری سانس لی۔

"بچھو کے کاٹے سے نہیں انسان کے کاٹے سے ڈرنا چاہیے۔" سحرش ابھی تک سمیرا اور مرتضیٰ کی گفتگو میں الجھی ہوئی۔ وہ دونوں کیا سازش کر رہے تھے۔ شاید نہیں بلکہ یقیناً زل اور زین کے خلاف کاش وہ مہرین کے بلانے پر واپس نہ آتی ساری بات سن لیتی۔

"کیا مطلب۔" مہرین نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"مطلب یہ کہ بچھو کھلا دشمن ہے کاٹ بھی لے تو نظر آتا ہے۔ انسان بار بار ڈستا ہے تو پھر بھی نظر نہیں آتا۔ سو کھلے دشمن سے نہیں چھپے دشمن سے ڈرنا چاہیے۔" اس کی نگاہیں سمیرا پر تھیں۔ سمیرا بے چین سی ہوئی۔ کیا سحرش اسے کچھ جتا رہی ہے۔ تو کیا فرق پڑتا ہے یوں بھی اسے تو عادت بلا جواز اور بلا وجہ ادھر ادھر سے پڑھے ہوئے جملے ٹانکنے کی۔ اس نے کندھے اچکائے۔ اسے جیتی ہوئی بازی ہارنی نہیں تھی اور وہ ہاری ہوئی بازی جیتنا جانتی تھی اور اس کھیل میں تو اس کی محبت داؤ پر لگی ہوئی تھی اگر اسے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ وجدان اس طرح ری ایکٹ کرے گا تو وہ صبوحی کو تکلیف دینے کے لیے اس طرح کی احمقانہ بات نہ سوچتی لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور اس کا ہدف پر

پہنچنا ضروری تھا۔
"لو جی...... اللہ اللہ کر کے سیاست سے جان چھوٹی ہے تو فلسفے کی کلاس شروع ہو گئی ہے۔" اسد ہولے سے ہنسا۔
"کوئی اچھی اچھی باتیں کرو بلکہ آج بہت دنوں بعد ضیاء ۔ ہمارے ساتھ ہے اس سے کوئی گیت سنتے ہیں۔ کوئی گانا، کوئی غزل۔"
ضیاء کی آواز خوب صورت تھی۔ وہ کالج یونیورسٹی کے فنکشنز میں گایا کرتا تھا۔
"نہیں یار میرا گلا بہت خراب ہے یہ عمر ہے نا اس سے سنو۔" سب عمر کی طرف دیکھنے لگے تھے۔
"اب انکار نہ کرنا عمر پلیز۔" مرسل نے بھی کہا تو وہ ہولے سے کھنکارا۔
فیض کی غزل کے چند اشعار سنا دیتا ہوں۔
گر مجھے اس کا یقین ہو میرے ہمدم میرے دوست
گر مجھے اس کا یقین ہو میرے ہمدم تیرے دل کی تھکن
اس کی نظروں نے لحہ بھر کے لیے شانزہ کو حصار میں لیا تھا پھر فوراً ہی نظریں ہٹالی تھیں۔
تیری آنکھوں کی اداسی تیرے سینے کی جلن
میری دلجوئی میرے پیار سے مٹ جائے گی
وہ گا رہا تھا اس کی آواز سحر طاری کرتی تھی۔
شانزہ گود میں رکھے ہاتھوں پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ اس کے اور عمر کے درمیان کوئی شدید قسم کی محبت رہی تھی اور انہوں نے ایک دوسرے سے عمر بھر ساتھ نبھانے کے وعدے کیے تھے بس وہ اسے اپنی عادات اور اچھی نیچر کی وجہ سے اچھا لگتا تھا اور دونوں نے شاید اپنی اپنی جگہ یہ ضرور سوچا تھا کہ اگر دونوں کا ساتھ ہوا تو اچھی گزر جائے گی۔ لیکن ساری بات نصیب کی ہوتی ہے۔ عمر نے بس اس کا رشتہ طے ہونے کے بعد ایک ہی بات کی تھی۔
"میں تمہارے لیے ہمیشہ دعا گو رہوں گا شانزے۔ میں اپنے نصیب کا گلہ کس سے کروں کہ دلوں کے بندھن ان سے کیوں جڑتے ہیں جن سے ہاتھ کی لکیریں نہیں ملتیں۔ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔"
یہ محبت کا اظہار تھا یا جدائی کا نوحہ اس نے شادی سے پہلے اسے ہفتوں رلایا تھا۔ اور اب کئی آنسو اس کے اندر گرے تھے۔ اضطراری انداز میں وہ گود میں رکھے ہاتھوں کو کھولنے اور بند کرنے لگی تھی۔
گر میرا حرف تسلی وہ دعا ہو جس سے
جی اٹھے تیرا اجڑا ہوا بے نور
اور وہ یکدم خاموش ہو گیا تھا
"بس اتنا ہی یاد تھا۔"
"تم نے تو اداس ہی کر دیا ہے یار کوئی پھڑکتا ہوا سا گانا سناتا تھا جو ہنسا دیتا خوش کر دیتا۔"
عمار فطرتاً ہنس مکھ اور خوش مزاج تھا۔" اس غزل نے اداسی پھیلا دی۔"
"میں تو کسی وداعی گیت کی توقع کر رہی تھی۔" اس طرح کی جلی بھنی باتیں سمیرا نے کبھی نہیں کی تھیں مزاج کا یہ رنگ سب پہلی بار دیکھ رہے تھے۔
تو پھر ہو جائے بدی کے کانٹے
اس نے قدرے بلند آواز میں کہا۔
"نہ...... نہ سب بکواس۔"
وہ ایک ساتھ سب بولے تھے۔ تب ہی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی تو سب یکدم خاموش ہو گئے۔
دعا مانگ کر مرسل نے سب کی طرف دیکھا۔
"نماز مسجد میں ہی پڑھتے ہیں کسی نے وضو وغیرہ کرنا ہو تو کر لے۔" ضیاء سیڑھیوں کے نیچے بنے واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ بی بی اماں نے کچن سے جھانک کر باہر دیکھا اور پھر برآمدے میں چلی آئیں۔
"جب تک یہ نماز پڑھ کر آتے ہیں تم

دسترخوان بچھا کر برتن لگا دو۔" وہ لڑکیوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"اور ہاں میں نے ڈائننگ روم صبح ساجدہ سے صاف کروا دیا تھا۔ ارباب، اورنگ زیب اور سب بڑے ادھر ہی کھا لیں گے۔" یوں تو ڈرائنگ روم کافی کشادہ تھا۔ فرش پر چٹائیاں بچھا کر آرام سے انتیس تیس بندے کھا سکتے تھے لیکن انہوں نے سوچا تھا بچے بڑوں کی موجودگی میں بے تکلفی سے کھا پی نہیں سکیں گے۔

انہوں نے صبح ہی ساجدہ اور شیخو بابا سے کہہ کر صوفے وغیرہ دیواروں کے ساتھ لگوا کر کارپٹ پر چٹائی بچھوا دی تھی۔ گو ڈائننگ ڈرائنگ روم سے ملحق تھا اور اس کا ایک دروازہ ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا لیکن سحرش خوش ہوئی تھی۔

"یہ آپ نے اچھا کیا بی بی اماں۔ آپ کے ہاتھ کا بنا پلاؤ اور میں ہاتھ روک کر کھاؤں ناممکن اور موٹا اماں نے تو مجھے گھورتے ہی رہنا تھا۔ اور آنکھوں سے مواصلاتی پیغام بھیجتے رہنا تھا کہ بس کرو کم کھاؤ۔"

"لو بھلا وہ کیوں۔" بی بی اماں حیران ہوئی تھیں۔

"دراصل۔" اس نے ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی کی جو سرگوشی ہرگز نہیں تھی۔

"دراصل میری اماں میری شادی کسی امیر کبیر، جاگیردار، صنعت کار گھرانے میں کرنا چاہتی ہیں اور انہیں ڈر ہے کہ کھا کھا کر اگر میں موٹی بھینس بقول ان کے ہو گئی تو وہ جو رشتے والی مائیاں، ماسیاں بمشکل کوئی رشتہ گھیر گھار کر لائیں گی انہوں نے دیکھتے ہی انکار کر دینا ہے۔" اس کا جسم بھرا بھرا اور گداز تھا۔

امان کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ صحن کے دروازے کی طرف جاتے جاتے وہ غیر محسوس لمحے کے لیے اس کے پاس رکا تھا۔

"خوب جی بھر کر کھانا اس جاگیردار، امیر کبیر لڑکے کو تمہارے موٹاپے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اپنی موٹا اماں کو بتا دینا۔"

سحرش کا منہ پہلے کھلا پھر بند ہوا تھا۔ رخسار تپ اٹھے تھے۔

"یعنی یہ ...... مطلب امان۔" دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئیں۔

"شرط صرف امیر کبیر، جاگیردار کی ہے نا تو کیا رنڈوا، بوڑھا چھ سات بچوں کا باپ بھی چلے گا تو میں اپنے خاندان میں دیکھوں۔" سمیرا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔

"ویسے بھی تمہارے ہاں دولت کے لالچ میں چار پانچ بچوں کے باپ سے شادی کی روایت موجود ہے تو۔"

سحرش نے ناگواری سے اسے دیکھا تو وہ مسکرا کر ثوبیہ کی طرف متوجہ ہو گئی کہ وہ بھی سمیرا پر ارشاہ تھی جو حساب برابر کرنے میں دیر نہیں لگاتی تھی اور اسے سحرش کی بچھو اور انسان کے ڈسنے والی بات چبھ رہی تھی پتا نہیں کیوں اسے لگا تھا جیسے یہ بات سحرش نے اسے سنائی ہو کیا خبر اسے کچھ اندازہ ہو گیا ہو کہ اسے وہ موروں والی حویلی کی ساری لڑکیوں سے زیادہ چالاک اور ہوشیار لگتی تھی۔

اس سے پہلے کہ سحرش اس کی بات کا جواب دیتی برآمدے میں رکھے فون کی گھنٹی بجی تو بی بی اماں جو پاس ہی کھڑی تھیں انہوں نے ریسیور اٹھا لیا۔ مرسل وغیرہ اب صحن کے دروازے کی طرف جا رہے تھے۔

"کس کا فون تھا...... بی بی اماں۔"

بی بی اماں نے بات کر کے ریسیور کریڈل پر ڈالا تو سحرش نے پوچھا۔

"اختر بانو کا ہے، صبح بھی فون آیا تھا اس کا لیکن بڑے صاحب اسی وقت باہر نکلے تھے اور اب بھی وہ گھر پر نہیں ہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے کچھ دیر بعد کر لینا نماز پڑھنے گئے ہیں۔"

"ضرور پھپھو نے ریحان بھائی اور تمہاری شادی کی بات کرنی ہوگی دادا جان سے۔" سحرش نے مہرین کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"اب تم یہاں کھڑی ہو کر باتیں نہ بناتی رہو۔ بچوں کے واپس آنے سے پہلے کام ختم کرلو۔ لو شینو بھی آ گیا۔"

شاپرز اٹھائے شینو بابا صحن میں داخل ہوئے تھے بی بی اماں ان کی طرف بڑھیں تا کہ کچھ شاپرز ان سے لے لیں۔ سحرش مسکراتی نظروں سے مہرین کو دیکھتی اس کا بازو پکڑے کچن کی طرف بڑھ گئی سمیرا اور ثوبیہ برآمدے میں تخت پر بیٹھ گئی تھیں۔

☆☆☆

اختر بانو کبھی ہاتھ میں پکڑے نکاح نامے کو دیکھتی تھیں کبھی تصویر کو اور پھر سامنے بیٹھی زیتون کو جو آس بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"یہ نکاح نامہ۔" اختر بانو نے ہاتھ میں پکڑے نکاح نامے کی طرف اشارہ کیا۔

"اصلی ہے ناجی۔" زیتون نے بے قراری سے پوچھا تو اختر بانو نے سر ہلایا۔

"اصلی نکاح نامے کی ہی کاپی ہے۔ میں یہ پوچھ رہی تھی کہ اس میں زیب النساء کے خاوند کا نام پتا لکھا ہوا ہے تو کیا تمہارے شوہر نے اس پتے پر جا کر پتا نہیں کیا۔"

"وہ جی۔ گیا تھا وہ استانی جی کا بھانجا لاہور اور اس نے آ کر بتایا تھا کہ اس پتے پر اس نام کا کوئی بندہ نہیں رہتا۔ زیبو کے خاوند نے جھوٹ بولا تھا۔ غلط پتا لکھوایا تھا۔" وہ ایک بار پھر زور و شور سے بتانے لگی تھی۔

"وہ استانی جی کا بھانجا بھی تو جھوٹ بول سکتا ہے نا زیتون۔" اختر بانو کی نگاہیں اب بھی تصویر پر تھیں۔

"ہاں جی بالکل یہ ہی تو زیبو کہتی تھی۔ اس کے دل نے اعتبار نہیں کیا تھا استانی جی کے اس بھانجے کی بات پر اور پھر جب اسے استانی جی کی بٹی کا خط ملا تھا تب سے تو اسے پکا یقین تھا کہ شہزادے کا باپ زندہ ہے۔" زیتون کو بہت بولنے کی عادت تھی۔

"جھلی تھی چپ بیٹھی خیالوں میں اس سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ ویسے یہ جس جگہ کا پتا لکھا ہوا ہے۔ آپ بھی اس محلے میں گئی ہیں اور آپ کو کیا لگتا ہے یہ مل جائے گا۔"

ان شاء اللہ پتا چل جائے گا لیکن اگر اس کا پتا چل بھی گیا تو کیا فائدہ نہ زیب النساء زندہ ہے نہ اس کا بیٹا تمہارے پاس ہے۔ اب کیا کرو گی اسے تلاش کر کے اپنے بیٹے اور زیب النساء کا جان کر اسے دکھ ہی ہوگا۔" اختر بانو کی آنکھوں میں اب تاسف تھا۔

"وہ جی ہاتھ جوڑ کر پاؤں پڑ کے معافی مانگوں گی۔ میری منی کے ابا کو معاف کر دے۔ وہ معاف کر دے گا تو شاید وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا بہت تکلیف اور اذیت میں ہے۔ یتیم کا مال پچتا (ہضم) نہیں ہے بی بی جی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی یتیم کا مال کھانے......"

"یتیم تو نہ کہو زیتون۔"

اختر بانو نے تڑپ کر اس کی بات کاٹی۔ دل پر گھونسا پڑا تھا "یوں شہزادے کو یتیم تو نہ کہو۔ اس کا باپ۔"

کیا پتا وہ زندہ ہو۔ موجود ہو۔ کسی مجبوری سے نہ آ سکا ہو۔

"جی میں بھی زیب النساء کے اسی یقین کے سہارے آپ کے پاس چلی آئی ہوں۔ ورنہ سچی بات ہے میرے دل کو اتنا یقین نہیں ہے کہ وہ ہے۔"

"اگر ہوتا تو کبھی تو واپس آتا۔ لیکن اگر ہونے کے باوجود نہیں آیا تو وہ ایسا نہیں تھا جیسا زیب کہتی تھی سمجھتی تھی۔ فلموں والے شہری بابو کی طرح وہ وقت گزاری کر کے چلا گیا۔ نکاح کا

ڈرامہ کیا۔" زیتون نے چند ہفتے پہلے ہی فلم دیکھی تھی ایک وی۔سی۔آر پر فضل کرائے پر وی۔سی۔آر لے کر آیا تھا۔

"خیر چھوڑیں وہ جیسا بھی تھا بس ایک بنتی (درخواست) ہے آپ سے۔ مجھے اپنے ساتھ لے جائیے گا۔ اور مجھے اس سے معافی دلوا دیجیے گا۔ صفدر...... مطلب منی کا ابا دل کا برا نہیں تھا جی بہت خیال کرتا تھا زیب النساء اور شہزادے کا۔ جب جب میں نے کہا ساتھ جانے کو اپنے سارے کام چھوڑ کر چل پڑا ساتھ، پر آپ تو جانتی ہو نا کہ آدمی کا نفس بڑا کمزور ہوتا ہے۔ اور شیطان اس پر حملہ کرتا رہتا ہے کبھی دولت اور جائداد کا لالچ دے کر کبھی عورت کے حسن کا لالچ دے کر اور یہ جو بندہ ہوتا ہے نا ہوس کا مارا ہوتا ہے۔ بھوکا ہے ازلی پیسے کی ہوس، عورت کی ہوس شہرت کی ہوس۔

اور یہ ہوس اسے بھٹکا دیتی ہے مار دیتی ہے۔ صفدر کو بھی پیسے کی ہوس مار گئی۔ شیطان اس پر حاوی ہو گیا...... اور وہ برا نہیں تھا بی بی! بس اس کا نفس کمزور تھا جی۔" اختر بانو خاموشی سے اسے سن رہی تھیں۔ یہ عورت ان پڑھ تھی سیدھی سادھی دیہاتی عورت ایک طرف اسے اپنی سہیلی کے ساتھ کیے گئے وعدے کو نہ نبھا سکنے کا دکھ تھا تو دوسری طرف اسے اپنے شوہر سے محبت بھی تھی وہ اس کی تکلیف دور کرنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی اس نے جو جرم کیا ہے وہ معاف کر دیا جائے۔ اس کو مجرم بھی مانتی تھی اور صفائی بھی دیتی تھی۔

"فرض کرو اس نے معاف نہ کیا تو۔"

"تو۔" زیتون چند لمحوں کے لیے پریشان سی ہو گئی تھی۔

"تو جی اس کی مرضی یہ تو اس کا حق ہے نا معاف کرے یا نہ کرے اس کا شہزادوں جیسا بیٹا گنوا دیا، ہم نے، اس کی حفاظت نہ کر سکے تو وہ جو چاہے کہے، جو چاہے کرے پر میرے دل کو تو قرار آجائے گا کچھ کہ میں نے منی کے ابا کی تکلیف کم کرنے کی کوشش تو کی۔ اگر وہ ایسا ہی ہے جیسا زیب النساء بتاتی تھی تو وہ ضرور معاف کر دے گا۔ بڑا آدمی تھا تو دل بھی بڑا ہوگا اس کا۔"

"چلو فرض کرو وہ معاف کر دیتا ہے تو کیا اللہ بھی معاف کر دے گا منی کے ابا کے جرم کو۔" اختر بانو اب زیتون کی باتیں دلچسپی سے سن رہی تھیں۔

"پتا نہیں جی اللہ کے کام تو اللہ ہی جانے پر اس کے بندے نے معاف کر دیا تو وہ بھی معاف کر دے گا۔ اتنے سالوں سے بہائے گئے آنسوؤں میں سے کوئی ایک آنسو تو اس کی بارگاہ میں قبول ہوگا نا۔ پھر مایوسی تو کفر ہے نا جی۔ شیطان مایوس ہوتا ہے۔ ہم بندوں کو تو آخری سانس تک معافی کی امید ہوتی ہے اور وہ سوہنا رب اپنے بندوں کو نا امید تھوڑا ہی کرے گا۔" زیتون کی آنکھوں میں امید کی ہلکی سی لو دمک رہی تھی۔

"اچھا یہ بتاؤ یہ تمہاری زیب النساء کیسی تھی۔ کیا بہت خوب صورت تھی۔" اختر بانو کی نظریں پھر کاغذ کے اس ٹکڑے اور تصویر پر بھٹکنے لگی تھیں۔

"زیب النساء۔" زیتون کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں زیب النساء کے متعلق تو وہ گھنٹوں باتیں کر سکتی تھی۔

"ایسی ویسی...... وہ اتنی خوب صورت تھی کہ نگاہیں ایک بار اس کی طرف اٹھتیں تو واپس آنا بھول جاتی تھیں۔ رنگت ایسی جیسے دودھ میں کسی نے ذرا سا سیندور گھول دیا ہو۔ ہاتھ لگانے سے میلی ہونے والی۔ آنکھیں اتنی خوب صورت کہ بندہ ان میں ڈوب جائے یہ بڑی بڑی آنکھیں جو کبھی سرمئی سرمئی لگتیں کبھی سنہری سنہری سی اور اس پر پلکوں کی وہ لمبی لمبی جھالریں جو اٹھتی گرتیں تو دھرتی ہل جاتی۔ ایسے حسین گھنے لمبے چمکدار ریشمی سے بال جیسے سیاہ ریشم کا ڈھیر، قد بت جیسے سانچے میں ڈھلا۔ نقوش ایسے تیکھے تیکھے کہ کیا بتاؤں۔

پھر پڑھی لکھی باتیں کرتی تو جی چاہتا سنتے چلے جاؤ۔ ایسا نرم، مہربان سا لہجہ۔ مزاج میں اتنا

تحمل، اتنا حسن کہ دل کھینچ لیتا۔ میرے افضل نے جی وہ میرا بڑا بیٹا...... اس نے جب پہلی بار دیکھا تو بھاگتا ہوا گھر آیا کہ ماسی جنتاں کے گھر پری آئی ہے۔ سارے گاؤں کی لڑکیاں ہی اسے دیکھنے ماسی جنتاں کے گھر گئی تھیں۔ یوں ہی تو وہ شہری بابو دل نہیں ہارا تھا۔"

اختر بانو کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"تمہیں تو کوئی کہانی نگار ہونا چاہیے تھا زیتون۔ اس کے متعلق تم سے سن کر اسے ملنے کو جی چاہنے لگا ہے۔"

"کاش وہ زندہ ہوتی کاش اسے کچھ نہ ہوتا۔" زیتون کے لبوں سے آہ نکلی تھی۔

"تو آپ دیکھتیں اسے دیکھ کر اللہ پر پیار آتا تھا وہ سوہنا رب جس کی مخلوق اتنی حسین ہے وہ خود کتنا حسین و جمیل ہوگا اور اس کی مخلوق بھی کیسی کیسی حسین ہوگی۔ یہ اتنی بڑی دنیا ہے اس میں زیبو سے زیادہ خوب صورت اور حسین لوگ ہوں گے پر منی کی دادی کہتی تھی ہمارے گاؤں میں آج تک ایسی خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی انہوں نے۔ اور وہ زیب النساء کہتی تھی کہ اگر میں شہزادے کے ابا کو دیکھ لیتی تو اس کی تعریف کرنا بھول جاتی۔ ٹھیک ہی تو کہتی تھی عورت کا حسن تو مرد کے حسن کے سامنے ماند پڑ جاتا ہے۔ اس کی مردانگی کا ایک اپنا ہی حسن ہوتا ہے جی۔ اچھا اور نیک مرد، عورت کو تحفظ اور عزت دینے والا ماڑے (برے) نقشے (نقوش) والا بھی ہو تو حسین ہی ہوتا ہے۔"

بہت دھیان اور دلچسپی سے اس کی باتیں سنتی اختر بانو کے تصور میں کوئی سراپا لہرایا تھا۔ مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

"زیب النساء خالہ کے متعلق باتیں کرتے ہوئے اماں ایسی ہی داستان گو بن جاتی ہے۔ ایسے ایسے لفظ بولتی ہے کہ اگلا حیران رہ جاتا ہے کہ یہ چٹی ان پڑھ جاہل زیتون کو کہاں سے ایسے بولنا آ گیا۔" منیرہ کی نظریں اختر بانو کی مسکراہٹ پر پڑیں تو وہ جھینپ سی گئی تھی۔

"نہ منی نہ کتنی بار تجھے کہا ہے مجھے چٹی ان پڑھ جاہل نہ کہا کر۔" اس نے ناراضی سے منیرہ کی طرف دیکھا۔ "جس نے قرآن پڑھ رکھا ہو وہ بھلا کیسے چٹی ان پڑھ ہو سکتی ہے۔ چھ بار مولوی صاحب کے پاس قرآن ختم کیا تھا میں نے۔ کئی صورتیں تو انہوں نے ترجمے کے ساتھ یاد کروائی تھیں۔ زیب النساء کہتی تھی بس دنیاوی تعلیم نہیں ہے تمہارے پاس ورنہ تم ان پڑھ نہیں ہو۔"

"ٹھیک ہی کہتی تھی زیب النساء تم ان پڑھ نہیں ہو۔" اختر بانو کھڑی ہو گئی تھیں۔

"یہ میں رکھ لوں۔ ہفتہ دس دن تک مجھے لاہور جانا ہے۔ یہ لے جاؤں گی ساتھ ابا جان کو دکھاؤں گی۔" انہوں نے نکاح نامے اور تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

"جی لے جائیں جی۔ اس کے بغیر کیسے وہ اسے ڈھونڈیں گے۔ پر میں تو جی دو چار دن تک واپس چلی جاؤں گی۔ آپ بتا دینا منی کو۔ میں آ جاؤں گی جی پھر۔"

اس کی آنکھوں میں لحہ بھر کے لیے مایوسی سی نظر آئی تھی جیسے اسے یقین تھا کہ اختر بانو لاہور سے ہیں تو بس نام و پتا اور تصویر دیکھتے ہی پہچان لیں گی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مسکرائی۔

"وہ جی آپ فون کر کے اپنے ابا جان سے پوچھ لیں نا کہ اس نام و پتے کے بندے کو وہ جانتے ہیں کیا۔ میں تو اس بار خاص اسی کام کے لیے آئی تھی۔"

اختر بانو نے سر ہلایا وہ واقعی سیانی اور سمجھ دار تھی۔

"منیرہ اپنی اماں کو آئندہ کبھی ان پڑھ جاہل مت کہنا۔" منیرہ کی طرف دیکھ کر وہ مسکرائیں اور برآمدے میں رکھے فون کی طرف بڑھ گئیں۔

☆☆

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

قانتہ رابعہ

لازوال

"نضال، ایک بات تو بتاؤ، وہاں تم فجر کی نماز کے لیے کیسے اٹھتے ہو، یہاں تو سارا گھر اس مشن پر جت جاتا تھا تب بھی نماز کی اول وقت پر ادائیگی کم کم ہی ہو پاتی تھی۔"

نجیبہ نے گفتگو کرتے ہوئے ایک دم غیر متوقع سوال کیا۔

"فجر کی نماز؟ ہاں تو پڑھ لیتا ہوں جیسے تیسے، چھوڑو کوئی اور بات کرو۔"

شدید بیزاری کے عالم میں نضال نے کہا۔

"لو یہاں چچی سے باتیں کرتے ہوئے دس میں سے نو گھنٹے موضوع تمہاری گہری نیند اور اس سے بیداری کا مرحلہ ہی ہوتا ہے اور تم کہتے ہو چھوڑو اسے!"

"کیا بات ہے نضال! تم یونی کے ماحول سے مطمئن نہیں ہو؟ بات کروں چچی سے تمہیں واپس بلائیں آسٹریلیا سے، آخر یہاں بھی تو اچھے تعلیمی ادارے ہیں، یہ معیار پر پورے نہیں تو جامعہ ازہر چلے جاؤ کہیں قریب ہی۔"

بات کرتے کرتے اچانک نجیبہ چپ ہوگئی عزت نفس بھی کوئی چیز ہوتی ہے آخر منہ بھر کے کیسے کہہ دیتی۔

"نضال! تمہارے جانے سے میں اداس ہوگئی ہوں، عاتکہ اور فہیمہ کی شادی کے بعد تو اتنا بڑا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔

چچی کے پاس سوائے حالات حاضرہ کی گفتگو کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں میں کیسے بتاؤں گھر کے دالان میں زیتون کے درخت پر اب پرندے آنا بند ہوگئے ہیں، گلیاں سونی اور سڑکیں ویران ہوگئی ہیں، نضال تم واپس آجاؤ میرا دل اداس رہتا ہے تمہارے جانے کے بعد میرے ہونٹ مسکرانا بھول گئے ہیں میں تمہیں کیسے بتاؤں ابھی چند دن قبل تو ہمارے نکاح کی تقریب ہوئی تھی۔ نضال!"

لیکن نجیبہ کچھ نہ کہہ سکی۔ ہاں رہ رہ کر اسے نضال کا فجر کی نماز کے ذکر پر جھنجلاہٹ میں مبتلا ہونا حیران کن لگ رہا تھا۔ اس کے کانوں میں آنے والے دنوں کے لیے خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ "خیر بات کروں گی چچی سے نہیں نہیں، چچی تو اس بات کا ذکر فوری طور پر نضال سے کردیں گی نضال کا مجھ پر اعتماد ختم ہوجائے گا، میاں بیوی کے درمیان ہر طرح کی باتیں ہوتی ہیں، اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ انہیں نشر کردیا جائے۔"

میاں بیوی لفظ ذہن میں کیا آیا، نجیبہ نے شرما کر منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

اسے وہ دن یاد آئے جب وہ الخلیل سے آئی تھی تو دکھ، صدمہ اور بے یقینی کی کس کیفیت میں تھی۔

وہ دن مرتے دم تک اسے نہیں بھول سکتا تھا اللہ رب العالمین نے دس سال کے طویل انتظار کے بعد ان کے ہاں بھائی بھیجا۔

اس کی والدہ قریبی ہسپتال سے جب نومولود بچے کو لے کر آئیں تو سارے محلے میں محمود الخماش کے ہاں بیٹے کی پیدائش کی خبر پھیل چکی تھی۔

اردگرد کے سب گھروں سے خواتین جمع تھیں کوئی پلیٹ میں نمورا (مصری مٹھائی) لیے ہوئے تھی اور کوئی بکلاوا۔

سب کے چہروں پر چمک تھی۔
والدہ کی سہیلیوں میں سے کچھ نے تو زغارید شروع کر دیے جونہی وہ منہ میں انگلی ڈال کر سیٹی بجاتیں دوسری، عورتیں تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کرتیں ہنسی، حلق سے ابلتے قہقہے واللہ خوب رونق لگی ہوئی تھی ایسے میں پتا نہیں کیسے دھڑ سے دروازہ کھلا اور کسی بدبخت نے للکار کر اس کے باپ کا نام لیا۔
آنے والے خوں خوار نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے مکروہ انداز میں گالی دے کر بولے۔
''کہاں ہے وہ خنزیر کا بچہ؟''
نجیبہ کا منا سا دل کسی انہونی کے احساس سے کانپ رہا تھا محلے کی عورتیں پلک جھپکنے میں وہاں سے کھسک گئیں مہمان خانے میں مبارک باد دینے والوں کو سرخ مشروب پلاتے ہوئے ابو نجیبہ دوڑ کر باہر آئے ان بدبخت نابلس کے کتوں نے نجیبہ کے باپ کو بالوں سے گھسیٹتے ہوئے کہا۔
''ہماری مخبری کرتے ہو اور فدائیوں کو ہمارے بارے میں بتاتے ہو؟ ہمارے ساتھ جو غداری کرتے ہیں ہمارے بارے میں بتاتے ہیں جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟''
چار سیکنڈ میں بندوق سے گولی نکلی اور نجیبہ کے ابا کے دل کو کھا گئی والدہ چیختے ہوئے ان کے پیچھے بھاگیں تو ایک اندھی گولی ان کے سر کو نشانہ بناتے ہوئے سیدھی دروازے پر لگی جاتے جاتے ان بدبختوں نے نجیبہ کے نومولود بھائی کو ایک ہاتھ سے اٹھا کر بے دردی سے دیوار پر پٹخا وہ بچہ جس کی دنیا میں آمد کی خبر عزیز و اقارب کو پہنچی بھی نہ تھی، دنیا سے رخصت ہو گیا۔
چند گھنٹے قبل رونق اور ہنگامے کا مرکز اب ماتم کدہ میں بدل گیا تھا۔
سارے محلے میں سانپ سونگھ گیا اور ماں باپ

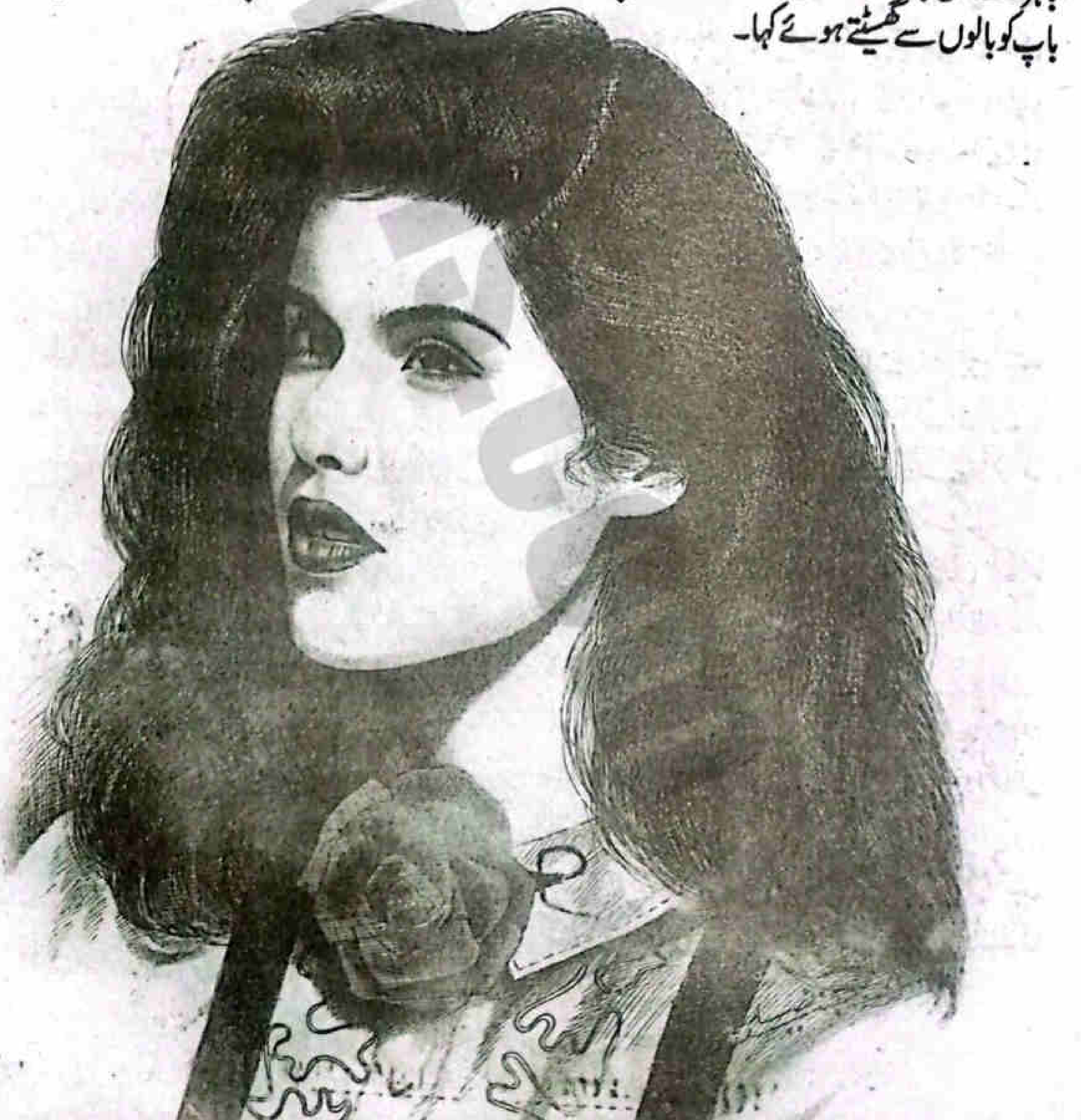

کے ساتھ نومولود کی میت بھی گھر کے کچے صحن میں پڑی تھی۔ بھری دنیا میں نجیبہ کا کوئی نہ رہا، سوائے عسقلان والے ماموں اور غزہ ہاشمی والے چچا کے اس کے والدین اور نومولود کی تدفین کے بعد نجیبہ کو جیسے تیسے غزہ میں اس کے چچا کے گھر پہنچا دیا گیا۔

دس سالہ نجیبہ کو زندگی کی طرف لوٹانے میں اس کے چچا، چچی اور ان کے چھوٹے بیٹے نضال کا بہت ہاتھ تھا، چچا کی دونوں بیٹیاں عاتکہ اور فہیمہ پڑھائی کے ساتھ گھر کے کاموں میں مصروف رہتیں، ایک نضال ہی تھا جو اس کے ساتھ بچوں جیسا سلوک کرتا۔

اپنے جیب خرچ سے اس کے لیے زیتون کے تیل میں تلی چیزیں لاتا، کبھی بند مٹھی کو منہ کی طرف لے جاتا اور اس میں سے فاختہ کی آواز نکالتا اس کے ساتھ چھپن چھپائی کھیلتا اپنی بہادری کے جھوٹے سچے لمبے قصے سناتا۔ اور بعد میں معصومیت سے پوچھتا۔

”نجیبہ اب تو تایا اور تائی یاد نہیں آتے ناں؟“

ماں باپ کے تذکرے پر نجیبہ پھر سے رونا شروع کر دیتی۔

آہستہ آہستہ دونوں کی سوچ ایک جیسی ہوتی گئی دونوں کی پسند ناپسند ایک دوسرے کی پسند ناپسند میں ڈھلتی گئی۔

دونوں کی ذہنی ہم آہنگی گھر والوں کو بھی نظر آ رہی تھی۔ نضال کے والدین کے لیے یتیم بھتیجی کو بہو بنانے سے زیادہ بہتر راستہ بھی نہیں تھا۔

یوں سب گھر والوں کے دلوں میں دونوں کے تعلق کو نکاح کے رشتے سے مضبوط کرنے کی صرف خواہش ہی نہیں پکا پروگرام بھی بن چکا تھا۔

نجیبہ کے چچا نے جب نضال کو تعلیم کے لیے آسٹریلیا بھیجنے کا فیصلہ کیا تو ساتھ ہی دونوں کا نکاح سے تعلق مضبوط کر دیا۔

بے شک یہ بہت اچھا فیصلہ تھا۔ نجیبہ بن ماں باپ کی بچی تھی لیکن چچی اور چچا دونوں نے ہتھیلی کے چھالے کی طرح رکھا۔

چچا خان یونس کے ناصر ہسپتال کے شعبہ انتظامی امور کے سربراہ تھے۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ گھر میں کئی کئی مہینوں کے بعد آتے ان کی غیر موجودگی میں ان کی اہلیہ بہت ذمہ داری سے گھر کے اندر اور باہر کے امور سرانجام دے رہی تھیں۔

نضال اور نجیبہ کے رشتے کا فیصلہ بھی ان کا ہی تھا لیکن یہ وہ فیصلہ تھا جس پر سب خوش تھے۔

بس فکر تھی تو اس بات کی کہ نضال کی شعبہ طب کی تعلیم مکمل ہو اور دونوں کی شادی کی بڑی یادگار تقریب کا انعقاد کیا جائے۔

ہر ہفتے کی شام نجیبہ فون کے ذریعے نضال سے رابطہ کرتی۔

چھوٹی چھوٹی باتوں میں جب بھی وہ نماز یا تلاوت قرآن کی بابت دریافت کرتی نضال ہر مرتبہ جواب گول کر جاتا۔

وہ رات نجیبہ کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتی۔

وہ اکثر سوچتی۔

”کیا دار الکفر میں جانے سے سب ہی کی عبادات متاثر ہوتی ہیں یا نضال کے ساتھ ایسا ہو رہا ہے؟“، وہ ساری رات کشمکش کا شکار رہتی اور کروٹیں بدل بدل کر جاگتے ہوئے رات گزار دیتی۔

اسے کیا کرنا چاہیے کہ وہ نماز کا ایسے ہی خشوع خضوع سے ذکر کرے جیسے نضال غزہ میں پڑھتا تھا۔ بالآخر نجیبہ نے سوچا کہ وہ چچی سے ذکر کرے گی شاید ماں ہونے کے ناتے وہ واضح دوٹوک انداز میں بتائیں کہ وہ کیوں نمازیں ادا کرنے کے ذکر پر اشتعال میں آ جاتا ہے۔

یا یہ صرف نجیبہ کا ہی وہم ہے؟ بہرحال وہ چچی سے بات ضرور کرے گی۔

اور جب اس نے چچی سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تو تاریخ کا ایک اور سیاہ باب سامنے تھا۔

یہودیوں کی مذہبی تقریب پر حملے کے جواب میں 7، اکتوبر کو غزہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا فیصلہ کیا گیا شروع میں تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ یہ کارروائی کب تک چلتی رہے گی، دو دن چار دن، دن سے ہفتے اور ہفتوں سے بات آگے نکل گئی۔

خان یونس کے ناصر ہسپتال میں بم کے دھماکے سے جہاں درجنوں نومولود شہید ہوئے انہیں میں بہت سے معالج بھی شامل تھے۔

نضال کے والد عبدالکبیر ہسپتال کے تہہ خانے میں میٹنگ میں مصروف تھے اسی حالت میں ان کی بھی شہادت ہوئی خان یونس، رفاح، جبالیا کون سا شہر تھا جہاں بم دھماکوں اور میزائل حملوں سے لوگ نہیں مر رہے تھے۔

نضال سے رابطہ ہوا، اسے باپ کی شہادت کا علم ہوا تو نجیبہ نے پہلی مرتبہ نضال کا انوکھا روپ دیکھا۔ عجیب لاتعلق اور سرد مہری سے بولنے والا نضال!

وہ گھنٹوں اس سے بات کرتی لیکن وہ مجاہدین کے متعلق ایک لفظ بولتی تو نضال ایسے ہی گم صم ہو جاتا جیسے نماز تلاوت کے بارے میں پوچھنے پر ہوتا تھا۔

وہ چچی کو یہ بتا کر مزید غم زدہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے سوچا، وہ خود اس سے پوچھ کر رہے گی کہ اس کی صحبت کیسے لڑکوں کی ہے؟

اس سے قبل سوشل میڈیا کے استعمال میں نجیبہ بہت نکمی تھی لیکن اسے محسوس ہوا کہ آنے والا دور سوشل میڈیا کا ہی ہوگا تو اس نے محدود مدت کے کورس میں داخلہ لے کر سیکھنے کا فیصلہ کیا۔

وہ فیس بک، انسٹا کے ذریعے بہت جلد نضال کی یونیورسٹی کے بارے میں سرچ کر کے اس بھیانک حقیقت تک پہنچ چکی تھی کہ نضال کی صحبت لادین اور امیر ترین بگڑے لڑکوں کی بن چکی ہے۔

یہ بہت اذیت ناک دن تھے۔

کبھی کبھار تو وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بچوں کی طرح روتی۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ جاتیں۔

اس کی بھوک ختم ہو چکی تھی۔

وہ جب بھی اردگرد کے بے یقینی کے حالات اور ظلم بے بسی کی زندگی کا تذکرہ کرتی، ہمیشہ نضال کی طرف سے موضوع بدل دیا جاتا۔

عجیب ناقابل فہم بات یہ تھی وہ اپنی ماں اور بہنوں کے ساتھ ویسا ہی نضال تھا جو بیرون ملک روانہ ہونے سے قبل تھا۔

اگر اس کا رویہ تبدیل ہوا تھا تو صرف نجیبہ سے!

نجیبہ نے اپنی سہیلی ریحانہ سے تذکرہ کیا اور اس خدشہ کا اظہار بھی کہ کہیں نضال اس رشتے سے تو ناخوش نہیں ہو گیا، آخر یونیورسٹی میں ایک سے ایک بڑھ کر لڑکی موجود ہے، نضال فرشتہ تو نہیں ہے تو انسان ہی ہے نا!

یہ بات سنتے ہی نجیبہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اسے کچھ دکھائی دے رہا تھا نہ سنائی دے رہا تھا اسے پتا ہی نہیں چلا، وہ کتنی دیر تک ہوش وحواس کی دنیا سے غافل رہی۔

ہاں جب ہوش میں آئی تو چچی اور عاتکہ اس کے پاس بیٹھی تھیں۔

چچی نے اس کا ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں لیا ہوا تھا۔

کتنی دیر تک وہ اس کے بال سہلاتی رہیں، اس سے نرم لفظوں میں باتیں کرتی رہیں۔

اور کتنی دیر تک نجیبہ کے گرم لاوے کی طرح ابلتے آنسو اس کا تکیہ بھگوتے رہے۔

بہت دیر کی خاموشی کے بعد چچی نے اسے پشت سے سہارا دے کر بٹھایا۔

”نجیبہ! اللہ بہتر کرے گا۔ تم پریشان مت ہو نضال بھلا کیوں کسی اور لڑکی کی طرف دیکھے گا، وہ میرا بیٹا ہے، اس نے میرا دودھ پیا ہے۔ رفیدہ بنت اسماعیل کا! غزہ ہاشم کے سب سے متقی انسان کی بیٹی کا!

میں نے جتنے ماہ اسے پیٹ میں رکھا، میں نے قرآن کی زبان میں لوگوں سے کلام کیا۔

جب وہ پیدا ہوا تو میں نے اس کے کانوں میں مسجد اقصیٰ کے موذن سے اذان دلوائی میں نے دو سال اسے حالت وضو میں دودھ پلایا ہے اور

رضاعیت کے دورانیہ میں میں پورا سیپارہ پڑھ لیا کرتی تھی میں نے اور میرے شہید زوج نے اللہ سے وعدہ کیا اسے ہر طرح سے حرام رزق سے دور رکھیں گے۔ اسی لیے میں نے ہمیشہ اسے حلال کا لقمہ کھلایا ہے بھلا وہ کیوں ایسا کر کے رب کو ناراض کرے گا؟"

نجیبہ نے دکھیا ماں کی طرف دیکھا اور نم آلود آواز میں بولی۔

"بات کسی دوسری لڑکی سے دلچسپی کی نہیں بات اس کی لادین لڑکوں سے صحبت رکھنے کی ہے۔"

پھر نجیبہ نے انہیں بتایا کہ کس طرح وہ دنیا کے ہر موضوع پر دلچسپی سے بات کرتا ہے لیکن جوں ہی عبادات، جذبہ جہاد یا یہاں کے حالات کی بات ہو تو وہ بری طرح الجھن میں پڑ جاتا ہے۔"

کئی منٹ لگے انہیں اس بات کو سہنے کی ہمت پیدا کرنے میں پھر انہوں نے فیصلہ کیا انوکھا فیصلہ!

ان کے جاننے والوں میں ایک گھرانہ آسٹریلیا میں مقیم تھا انہوں نے فیصلہ کیا نجیبہ آسٹریلیا جائے گی۔

اور جو کچھ ہو چکا ہے اسے سامنے رکھتے ہوئے ہر صورت میں نضال کو واپس لائے گی۔

اپنے اصل کی طرف!

ان سارے مراحل کے طے ہونے میں چار ماہ لگے۔ یہ چار ماہ، گنتی کے ایک سو بیس دن بہت سے مظلوموں کو نگل گئے۔

غزہ کھنڈر میں بدل گیا۔ لوگوں سے بھرے پرے گھر خالی ہو گئے کچھ نے نقل مکانی کی اور کچھ دنیا سے ہی رخصت ہو گئے۔

پوری دنیا میں ان بے بس فلسطینی عوام کے لیے ریلیاں نکالی جا رہی تھیں۔

مظاہرے ہو رہے تھے۔

سینکڑوں جیتے جاگتے لوگ بم دھماکوں اور بمباری میں لقمہ اجل بن جاتے آئے روز ظلم کی نئی داستان سننے کو ملتی۔

غزہ کے لوگوں کی بے بسی اور دنیا کے مسلمانوں کی بے حسی بہت بڑا المیہ تھی۔

تاریخ کا نقشہ بدل رہا تھا۔

عالم اصغر اور عالم اکبر دونوں کا!

نجیبہ کے کاغذات بہت مشکل مراحل سے گزرنے کے بعد مکمل ہوئے، بالآخر جاتی سردیوں کے دنوں میں نجیبہ سڈنی پہنچ چکی تھی۔

مسز نضال ابراہیم کی شناخت لیے ایک مشن پر، اس کی آمد کا نضال بے چینی سے منتظر تھا۔ نجیبہ بہت حیرت میں تھی، نضال پہلے والا ہی تھا کچھ بھی نہیں بدلا تھا عبادات میں پہلے نمبر پر نماز ہے، گھر سے قریب ہی وہ اسے سوڈانی مصلے (مسجد) میں ساتھ لے کر جاتا۔ تجوید تفسیر سب کچھ تھا لیکن اکثر وہ چپ ہو جاتا۔ وہ الجھتی، بار بار پوچھتی لیکن کوئی جواب نہ پا کر مزید پریشان ہو جاتی۔ کوئی سرا اسے نہیں مل رہا تھا۔

اسکرین والے نضال اور جیتے جاگتے سامنے بیٹھے نضال میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

غزہ میں حالات انتہائی خراب تھے۔ اسرائیلی جارحیت کے جواب میں مزاحمت جاری تھی۔ نجیبہ کی دو پیاری سہیلیاں گھر والوں کے ساتھ شہید ہو چکی تھیں نجیبہ کو بھی قدرت نے امومت کے منصب کے لیے چن لیا تھا۔

یہ اس کی زندگی کے عجیب دن تھے۔ اس کی کوکھ میں نئے وجود کی خبر اسے جتنا سرور دیتی۔ اس کے پیاروں پر ظلم اور قہر کی خبریں اسے غم زدہ کر دیتیں۔ وہ بھی پوری کوشش کر کے پچی کی طرح باوضو رہتی، اٹھتے بیٹھتے تلاوت قرآن میں مصروف رہتی لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کی طرح اس نے بھی قائدین کی شہادت کی خبریں غم کی حالت میں سنیں۔ اس کے لیے یہ دکھ بہت بڑا تھا کہ وہ کسی کے کندھے پر سر رکھ کر رو نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

بچی جب بھی اس سے رابطہ کرتیں، نضال کے لیے دعا میں شدت کی تلقین کرتیں سرا تو نجیبہ کو مل ہی گیا تھا، یروشلم اور لبنان کے کچھ لادین لڑکوں نے نضال کی برین واشنگ شروع کی تھی تب۔ تب، سرگوشی میں نضال نے بتایا۔

"یہ وہ لڑکے تھے جو کلمہ گو ہوتے ہوئے صیہونیوں کے ایجنٹ تھے جب ان کا مجھ پر اعتماد قائم ہو گیا تو امی کی دعائیں اور تمہاری فکر عرش تک پہنچ گئی ایک دو باتوں نے میرا جی اچاٹ کر دیا پھر— میں نے ان کی تحریک کے بارے میں معلومات کرنے کا فیصلہ کیا، نضال نے سرگوشی میں بتایا۔

"واللہ مجھے بہت فائدہ ہوا اگر تمہاری اور میری ماں کی دعائیں نہ ہوتیں تو شاید میں ڈگمگا جاتا۔ الحمد للہ دعائیں ڈوبتے کو بچا لیتی ہیں۔ بندے کو ضائع نہیں ہونے دیتیں میں حالت امتحان میں ہوں بہت دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

معمول کے چیک اپ کے لیے نجیبہ کو وہاں کے چھوٹے سے ہسپتال لے کر جاتے ہوئے وہ نجیبہ کو اپنی کتھا سنا رہا تھا۔

"میری کال ریکارڈ ہوتی تھیں، میری آمد ورفت کی نگرانی رہتی تھی۔ اس لیے فون پر کچھ بھی کہنا آسان نہیں تھا۔ اپنے آپ کو دین سے بیزار ظاہر کرنا میری مجبوری تھی۔

الحمدللہ رب العالمین وہ لڑکے یہاں سے چلے گئے اللہ کی طرف سے کچھ ایسا سلسلہ ہوا کہ یونیورسٹی کی انتظامیہ سے ان لڑکوں نے الجھ کر اپنا کام خراب کر لیا، انہیں یونی سے نہ صرف نکال دیا گیا بلکہ سڈنی میں داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔"

ہسپتال میں داخل ہوتے ہوئے نجیبہ کے کانوں نے غزہ میں جنگ بندی کی خبر سن لی تھی۔ اور وہ ایک وجود کو دنیا میں لانے کے کٹھن مراحل سے گزر رہی تھی۔

رات گئے جب اس کے پہلو میں بچے کو لٹایا گیا تو وہ ہو بہو نضال کی شکل کا محسوس ہوا۔

اسے نضال کمرے میں نظر نہیں آیا اس کے دوست کی بیوی یخنی اور خشک میوہ جات سے بھرپور مقوی حلوہ لیے باہر استقبالیہ پر موجود تھی سب بہت خوش تھے۔

سترہ اٹھارہ سال پہلے یہی منظر تھا اس کی ماں، نومولود بھائی، اس کا باپ منہ میں انگلی ڈال کر منہ کو گول شکل میں حرکت دے کر زغارید پڑھتی عورتیں خوشیاں، قہقہے اور دھڑ سے دروازہ کھلنے کی آواز پر صیہونی کتوں کا اندر آنا۔ باپ کو گھسیٹتے ہوئے گولی مارنا۔

"آہ......"

نجیبہ ایک مرتبہ پھر بے ہوش ہو چکی تھی۔

نجیبہ ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آئی تو اسے اردگرد دیکھنے سمجھنے میں بہت وقت لگا۔

"نہیں وہ زندہ ہے، اس کا بے بی بھی زندہ ہے اس نے شکرانے کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

☆☆☆

غزہ کے شجاعیہ محلے میں رفیدہ بنت اسماعیل جنگ بندی کی خوشی میں اپنے شہید شوہر کو یاد کر رہی تھیں جب انہیں دادی بننے کی اطلاع ملی۔

شجاعیہ محلے میں آنے والے کی خوشی میں مٹھائی تقسیم ہو رہی تھی اور یہاں سڈنی کے ہسپتال میں مریضوں کے مخصوص لباس کو تبدیل کر کے جب نجیبہ اپنے کمرے میں آئی تو اس کے قدم زمین نے جکڑ لیے۔ نضال نے بچے کو گود میں اٹھایا ہوا تھا اور دیوانہ وار چومتے ہوئے رو رہا تھا اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"اے ابو عبیدہ جہاد کی دنیا میں خوش آمدید بالروح بالدم نفدیک یا فلسطین اے اسماعیل ہنیہ اے یحیی سنوار کے جانشین بے حسوں کی دنیا میں آپ کا آنا مبارک ہو۔ اے ابو عبیدہ۔"

نضال بچے کو فلسطین کے ہیروز کے نام لے کر سینے سے لگائے بولے جا رہا تھا۔

نجیبہ کی آنکھوں سے آنسو جھرنے کی طرح بہہ

نکلے۔اس کی زندگی کے سارے تکلیف دہ مناظر رخصت ہوگئے۔سب سے اچھوتا لازوال منظر آنکھوں میں جم گیا۔

وہ مسکرائی اور بولی۔

''اے ابوعبیدہ کے والد! آج سے سارے گلے شکوے ختم، آپ کو بھی جیش محمد کے کارکن کی دنیا میں آمد مبارک ہو۔میرا آپ سے وعدہ ہے یہ قبلہ اول کی حفاظت کے لیے ایک سپاہی بنے گا اپنے دادا کی طرح دلیر اور نانا کی طرح۔''

نجیبہ کی آواز بھرا گئی تھی۔

وہ لاعلم تھی جنگ بندی تو مکروفریب کا گورکھ دھندہ تھی۔اپنے قیدیوں کی رہائی کے لیے ایک فریب۔کبھی یہودی بھی مسلمانوں کے خیرخواہ ہوئے ہیں؟

اگلے چالیس دن نجیبہ کی زندگی میں حسین ترین دن تھے۔

ابوعبیدہ کی طرف ایک نظر ڈال کر وہ اپنے اندر نئی توانائی محسوس کرتی۔

نضال کی پڑھائی آخری مراحل میں تھی جب نضال کو ماں کی طرف سے عیدالفطر غزہ میں منانے کی تلقین ہوئی۔

پہلے چار پانچ رمضان تک کسی ائر لائن سے کوئی ٹکٹ نہ مل سکی۔نویں روزے کی آن لائن بکنگ ہوئی۔

نجیبہ،نضال اور گود میں ہمکتا ابوعبیدہ تینوں دو ہفتے کی چھٹی پر گھر روانہ ہوچکے تھے۔

☆☆☆

جنگ بندی کے بعد حالات بہت بدل گئے تھے۔

امید اور آس کے ساتھ جانے والوں کا غم ساتھ لیے تینوں شجاعیہ محلے میں داخل ہوئے تو وعدہ شکن قوم کے اچانک حملے،بم دھماکے سے ابوعبیدہ اور نضال کے چیتھڑے اڑ چکے تھے۔

نجیبہ پر سترہ اٹھارہ سال قبل والی قیامت پھر سے گزری تھی۔

اب اس کے پہلو میں نولود بھائی اور والدین کے بجائے اس کے نومولود بچے اور شوہر کی لاشیں تھیں۔وہ پتھرائی آنکھوں سے کچھ دیر دیکھنے کے بعد دیوار کے سہارے سے اٹھی۔

اور اسے مرتے دم تک زندہ رہنا تھا۔

اس کی چچی، استقامت کی مثال اس سے چند گز کے فاصلے پر موجود تھیں۔

دونوں گلے لگ کر خوب روئیں پھر چچی اس کے آنسو پونچھتے اس کے لیے پانی لائیں۔

چاروں طرف دھوئیں کے بادل تھے۔

فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں چند منٹوں سے کم ہوچکی تھیں۔

چچی اس کے کانوں میں ہمت حوصلہ کے کلمات انڈیل رہی تھیں۔

''اٹھو نجیبہ! قبلہ اول کی حفاظت کے لیے۔جنت کے آٹھوں دروازوں میں داخل ہونے کے لیے، آسان حساب کتاب کے لیے اور اور۔'' انہوں نے نمناک لہجے میں کہا۔

''ظلم کو برداشت نہیں کیا جاتا۔رہتی دنیا تک اللہ کی زمین پر بسنے والوں کو بہادری اور اپنے نصب العین پر جمے رہنے کا ثبوت دینا ہوتا ہے اور اور۔'' بھل بھل بہتے آنسو صاف کرتے ہوئے رفیدہ بنت اسماعیل بولیں۔

''اور یہ کہ ہم انبیاء کرام کی اولاد ہیں۔ہم یہاں رہنے کے لیے آئے ہی نہیں، جہاں اکٹھے رہنا ہے اس کے لیے یہ قربانیاں، یہ بے سروسامانی ہی وہ قیمتی سکے ہیں جن کے عوض جنت کا سودا ہوسکتا ہے اٹھو اپنے سے زیادہ غم زدہ کے لیے۔اٹھنا تو پڑے گا اگر ہم نہیں اٹھیں گی تو سوا ارب مسلمانوں میں سے کوئی بھی نہیں اٹھے گا۔''

چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے دونوں وضو کے لیے کمرے کے کونے میں لگے سنک پر پہنچیں کہ وضو کر کے ہی وہ سر سجدہ میں جھک سکے گا جس کی قیمت صرف رب العالمین ہی ادا کرسکتا ہے۔

☆☆

ایمن علی

چاندی کے گھر

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

بارش ایک تواتر سے برس رہی تھی۔ یہ سردیوں کی بارش تھی ہڈیوں کو جما دینے والی۔ ایک متوسط طبقے کی تنگ گلیوں میں بارش نے کیچڑ کر دی تھی۔ بارش کی تیز بوندوں کے ساتھ ٹھنڈی یخ بستہ ہوا بند کواڑوں کی جھریوں سے اندر گھسے چلی آ رہی تھی۔

وہ تاریک کمرے کی ایک بوسیدہ چارپائی پر پڑی تھی۔ ناکافی گرم کپڑوں میں۔ درد کی تیز لہر بجلی کی چمک کی طرح اس کے سر سے اٹھتی اور ایڑھیوں تک جاتی۔ بھوک درد۔ سردی تنہائی۔ کیا چیز اس وقت زیادہ اذیت ناک تھی۔ تب ہی اس کے برابر سے اس کے نومولود کے کراہنے کی آواز بلند ہوئی اور اس کو پتا چلا کہ زیادہ تکلیف دہ کیا ہے۔ گرم پانی کی لکیر اس کی جلتی ہوئی آنکھوں سے بہتی ہوئی اس کے کانوں میں گھسنے لگی۔ بارش کو مسلسل برستے ہوئے چار گھنٹے ہونے والے تھے۔ ٹپ ٹپ ٹپ...... چارپائی پر چھت سے پانی ٹپکنے لگا تھا۔ ”یا اللہ......“ تب ہی اس کے منہ سے نکلا۔

”یا اللہ۔“

☆☆☆

”میں خود نہیں آتا۔ میرے قدم یہاں تک لاتے ہیں۔ مجھے میری قسمت یہاں تک لاتی ہے۔ میں کیا کروں؟“

اس نے کار ایک طرف پارک کر کے بے بسی سے سوچا اور موبائل، والٹ، کار کی چابی اور ایک کرسٹل کی نازک سی کی چین اس کے لیے لے کر اس کی گلی میں

مکمل ناول

داخل ہوا۔ چوتھا گھر تھا اس کا، بائیں ہاتھ کا اس گلی میں جس کا اپنا گھر اس کے دل میں تھا اور تب ہی اس نے اس کے براؤن گیٹ سے ایک لڑکی کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ گہرے نیلے رنگ کا برینڈڈ سوٹ پہنے جس کا نیلا ہی دوپٹہ ایک طرف کندھے پر بے نیازی سے پڑا ہوا تھا جو دونوں طرف سے پیروں کو چھو رہا تھا۔ ہلکا نیلا ننگ ٹراؤزر گھٹنوں سے ذرا سا ہی نیچے رہا ہوگا۔ سفید چمکتے پیروں میں کرسٹل جیسی فلیٹ چپل پر بھی اس کا دراز قد بے حد نمایاں ہو رہا تھا۔ اس کو ہیلو پہننے کی ضرورت تھی ہی نہیں۔ اعتماد سے تنی ہوئی گردن اور صبیح چہرے پر اس قدر خوب صورت مسکراہٹ کہ اسے نظر بھر کر دیکھا جائے اور مدتوں یاد رکھا جائے۔ اور اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

وہ وہاں کیوں آیا تھا کس کے لیے آیا تھا ابھی چند لمحوں پہلے تک اس کی کیا فیلنگز رہی تھیں۔ اس کے ذہن سے سب محو ہو چکا تھا قدم جم چکے تھے۔ آنکھیں اس ایک لڑکی کے تعاقب میں تھیں جو اس کے بالکل برابر سے گزر گئی تھی بغیر اس پر بلکہ کسی پر بھی ایک نگاہ غلط ڈالے۔ جیسے اسے عادت رہی ہو اس سب کی اسے علم ہو کہ جہاں سے بھی گزرے گی لوگوں کا اس کو ٹھٹک کر دیکھنا اور فریز ہو جانا ہوگا ہی ہوگا۔ مگر وہ

......

کسی خیال نے اس کو جکڑ ڈالا تھا۔ اس نے اسے کہیں دیکھا تھا۔ مگر کہاں اور اس کے پرفیوم کی خوشبو کتنی مانوس سی تھی۔ اس قدر شناسا سا۔ کہاں سونگھی تھی یہ خوشبو۔ اس نے ذہن پر زور ڈالا اور پلٹ کر اس کی پشت کو تکنے گیا۔ وہ اب گلی میں مڑ رہی تھی۔

☆☆☆

''مجھے نہیں لگتا کہ یہاں سے نکلنے کے بعد پچیس، تیس یا زیادہ سے زیادہ چالیس ہزار کی نوکری ملے گی ہمیں۔ ہمیں زندگی سے جو چاہیے ناں اس لیے ہمیں فوراً کوئی بڑا کام کرنا ہوگا۔''

ماہم نے چپس کھاتے ہوئے کیمپس کی سیڑھیوں پہ بیٹھی ہوئی بیلا سے کہا تھا۔ وہ دونوں ایم اے فائنل ایئر میں تھیں۔

''بڑا تو صحیح ہے مگر فوراً؟'' بیلا نے ہاتھ میں پکڑی کتاب بند کر دی تھی۔

''ہاں فوراً''

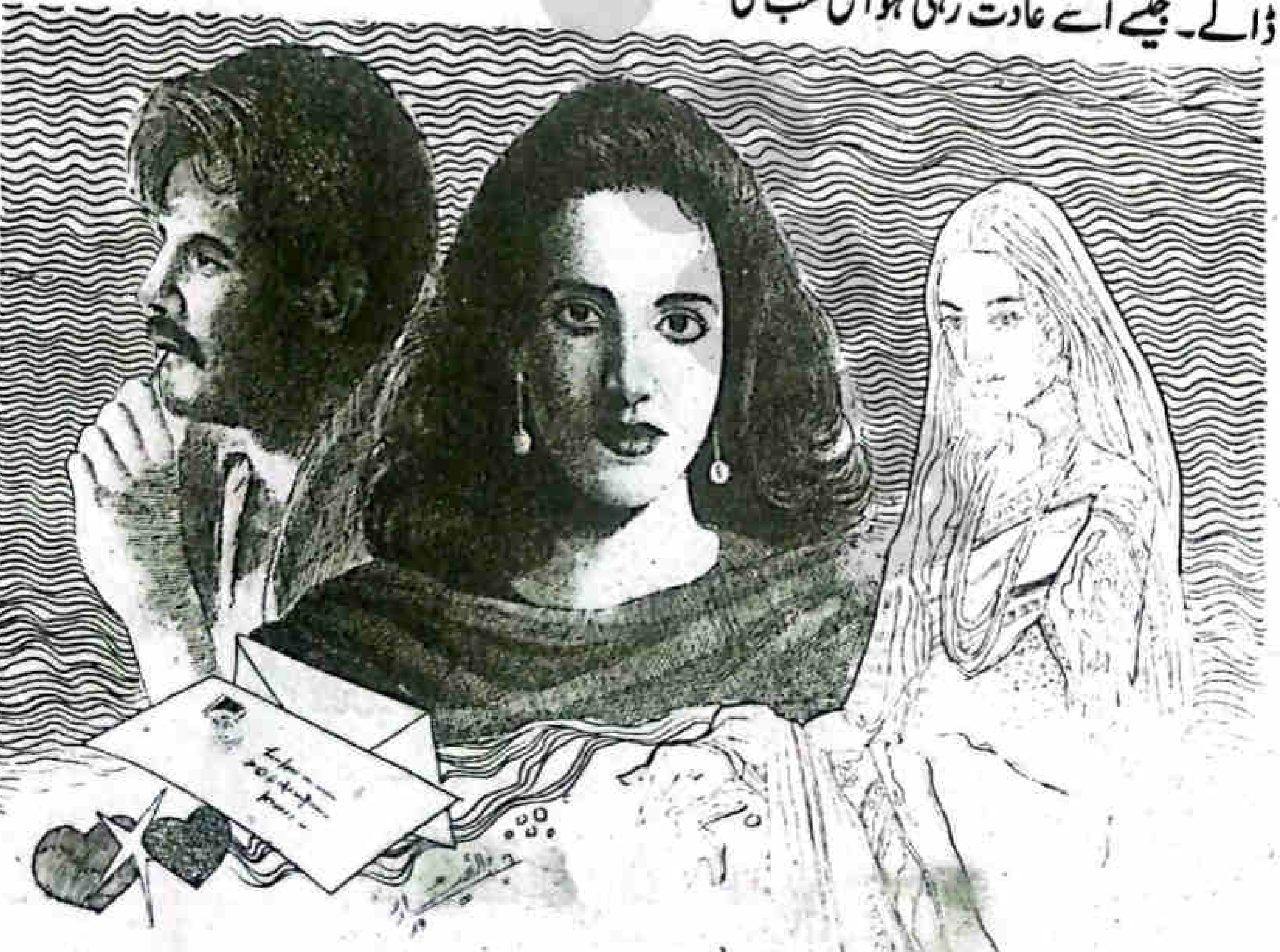

"فوراً تو کچھ بھی نہیں ہوتا لائف میں ماہم ڈیئر! کچھ بھی نہیں۔ مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ صبر کرنا پڑتا ہے۔" بیلا نے اس کے ہاتھ سے چپس کا پیکٹ لیتے ہوئے کہا تھا۔

"ہوتا ہے...... اور ہو گا بھی۔" ماہم نے ایک ادائے بے نیازی سے ہاتھ جھاڑے تھے۔ "ہم کوئی بزنس کریں گے کوئی بوتیک یا فوڈ کا بزنس۔"

ماہم پرشوق انداز میں کہتے ہوئے اس کے قریب ہوئی۔ اس وقت اس کے اندر جوش ولولہ تھا۔ کچھ بڑا کرنے، کچھ کر گزرنے کے جذبے سے بے قرار سی ماہم، بیلا کے کان کے قریب ہو کر جلدی جلدی اپنے پلانز شیئر کرنے لگی تھی۔

بیلا کچھ دیر تو سانس روکے اس کے منصوبے سنتی گئی پھر ایک دم سے پیچھے ہوئی۔

"واؤ تم تو ایک ہی سانس میں بزنس اسٹارٹ کر کے کروڑ پتی بھی بن گئیں اور ایبٹ آباد میں اپنے ووکیشن ہوم میں چھٹیاں گزارنے بھی پہنچ گئیں یار۔" ساری توانائی ہوا میں تحلیل ہو گئی تھی۔

"ہاں تو خواب تو اونچے ہی دیکھنے چاہئیں ناں۔"

"ہاں خواب دیکھنا بے شک اچھی بات ہے مگر تم شیخ چلی بن رہی ہو۔" بیلا نے کتابیں اٹھا کر بیگ میں ٹھونسنی شروع کر دی تھیں۔

"اوئے شیخ چلی نہیں ہوں میں...... وژن کے ساتھ ساتھ ایکشن بھی ہے یہاں پر۔"

"اور وہ کیا ہے؟" بیلا نے اس کی بڑی بڑی خمار آلود آنکھوں میں جھانکا تھا۔ ماہم ذرا سا گڑبڑائی۔

"مطلب ہو جائے گا۔ تم نے پڑھا ہے ناں۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھ آخری پر نظر...... اور سنو تم نے روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ تو سن رکھا ہے ناں۔ جو ہمارے آباؤ اجداد نے لگایا تھا۔"

"ایکسکیوزمی میرے نہیں تمہارے آباؤ اجداد نے لگایا ہو گا۔" بیلا کھڑی ہو گئی تھی ان کی کلاس کا ٹائم ہونے والا تھا۔

"اوہو۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ کراچی میں روٹی کپڑا اور مکان کا بزنس بھی فلاپ نہیں ہو سکتا۔ سمجھیں۔"

"سمجھ گئی۔ لیکن مجھے ابھی بڑی ٹینشن ہیں یار میری تیاری مکمل نہیں ہے اور امی کی طبیعت بھی خراب ہے بہت۔" بیلا نے چپس کا خالی پیکٹ دور رکھی ڈسٹ بن میں اچھالا اور آگے بڑھ گئی۔

"بالکل درست۔ ان ٹینشنز ہی سے تو نکلنا ہے۔" ماہم اس کے پیچھے لپکی تھی۔

"اور تمہیں لگتا ہے کہ بہت سارا پیسہ کمانے سے ٹینشنز ختم ہو جائیں گی؟"

"ہاں سب نہ سہی جو غربت کی وجہ سے ہیں کم از کم وہ تو ختم ہو جائیں گی ناں۔" ماہم مسکرائی تھی۔

"اچھا میں شام میں چکر لگاؤں گی تمہاری طرف آنٹی کو دیکھنے کے لیے۔"

"ضرور۔" وہ ٹھیک ٹائم پر کلاس میں پہنچ چکی تھیں۔

☆☆☆

جب سے ان کا فائنل سمسٹر قریب آیا تھا۔ تب سے ان کی باتیں ایسی ہی ہونے لگی تھیں۔ روز نئے آئیڈیاز۔ فیوچر پلاننگز۔ مسائل سے فرار کی باتیں۔ ان کی دوستی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ کالج سے وہ ایک دوسرے کی دوست تھیں۔ ایک علاقے اور تقریباً ایک جیسے مسائل کے علاوہ ان کی اس دوستی کے پیچھے بیلا کا ہمدرد اور انسان دوست رویہ بھی تھا۔ ماہم جن حالات میں پیدا ہوئی تھی اور پلی بڑھی تھی اس کا اس یونی ورسٹی تک پہنچ جانا بھی ایک بڑا معجزہ تھا۔

ماں باپ اور بہن بھائیوں کے بغیر ماموں ممانی کے گھر وہ اس طرح رہتی تھی، جیسے قید با مشقت کا قیدی۔ بیلا البتہ اس کے مقابلے میں تھوڑی سی خوش قسمت واقع ہوئی تھی۔ وہ بس دو ہی بہنیں تھیں۔ بیلا

سے بڑی بہن شادی شدہ تھی، اپنے گھر میں خوش تھی۔ اس کے باپ کا بھی انتقال ہو چکا تھا اور ماں ایک ہاؤس وائف تھیں۔ انہوں نے اپنے گھر کا نیچے کا پورشن کرائے پر چڑھا دیا تھا جس سے ان کی گزر بسر بمشکل تمام ہوتی تھی۔

میٹرک کلاس سے بیلا نے چھوٹے بچوں کو ٹیوشنز پڑھا کر اپنی پڑھائی کا خرچا خود اٹھانا شروع کر دیا تھا۔

زندگی نے ماہم کی طرح بیلا کو بھی ترسایا تھا۔ اور ماہم کی طرح بیلا کے ارادے بھی بلند اور خواب بڑے تھے۔

مگر بیلا کی شخصیت دھیمی دھیمی بہتی پرسکون سی ندی کی طرح تھی۔ اس کے اندر قناعت پسندی اور شکر گزاری تھی، یہ دو ایسے گوہر نایاب ہیں جو اگر کسی کے اندر ہوں تو اس کی قسمت بدل سکتے ہیں۔

جبکہ ماہم عجلت پسند۔ مگر اس کے اندر ایک چنگاری سی تھی، کچھ ایسا جو مقابل کو چونکا دیتا تھا۔ ٹھہر کر اس کو دوبارہ دیکھنے پر مجبور کرتا تھا۔

اور اپنی اس خوبی سے ماہم اچھی طرح واقف بھی تھی۔

☆☆☆

”ٹھیک ہے آپ یہ بتائیں کہ آپ کو یہ جاب کیوں ملنی چاہیے جبکہ آپ کے پاس تجربہ ہے نہ مطلوبہ ڈگری۔“

انٹرویو پینل میں موجود دو افراد میں سے ایک نے اس کے ڈاکیومنٹس کی فائل بند کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس نے اپنی براؤن کانچ جیسی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر خود اعتمادی سے کہا تھا۔

”آپ مجھے یہ جاب دیں ایک دن آپ اپنے اس فیصلہ پر پراؤڈ فیل کریں گے۔“

ان کے سوال کا جواب نہیں تھا مگر اس کا اعتماد اور ذہانت کی چمک تھی جو اس کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی، جس نے اس شخص کو حیران اور لاجواب کر دیا تھا اور اس کے اس اعتماد نے اس کی خوب صورتی کے بعد ان کو اسے ہائر کرنے کا ایک اور اچھا جواز جو وہ اس سے مانگ رہے تھے دے بھی دیا تھا۔

☆☆☆

”میں نے تمہارے لیے ایک بہت اچھا رشتہ دیکھا ہے۔ لڑکا ایک فیکٹری میں سپروائزر ہے چار بہنیں ہیں سب کی سب شادی شدہ اور ماں باپ۔“

ماہم کچن میں کھڑی آٹا گوندھ رہی تھی جب اس کی ممانی نے آ کر اس کو اطلاع دی۔ ماہم نے اطمینان سے دوسرے ہاتھ سے اپنے کندھوں تک آتے سلکی بال کان کے پیچھے اڑسے اور ممانی کی بات کاٹ دی۔

”میں نے جاب کر لی ہے۔“

ممانی کچھ دیر کے لیے بالکل چپ ہو گئیں، جیسے اندازہ لگا رہی ہوں کہ اس کا جاب کرنا زیادہ سود مند ہو گا یا ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلے جانا۔ ماہم کو اس جاب سے کال آ گئی تھی اس کے یقین کے عین مطابق اور وہ بہت خوش تھی۔

”کس سے پوچھ کر جاب کی ہے تم نے۔ اور کہاں کی ہے؟“ کچھ سوچنے کے بعد وہ تیز لہجے میں کہتی ہوئی اس کے سامنے آ کر کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئیں۔ وہ ایک پینتالیس سالہ خاتون تھیں۔ سستے فیشل اور بلیچ نے ان کے چہرے کو مصنوعی گورا پن اور چمک دے رکھی تھی۔

جنڈا اور بلیک برینڈڈ لان کے سوٹ میں اپنی کمان سی بھنویں چڑھائے ہوئے وہ غضب ناک

نظروں سے اسے دیکھے گئیں۔ تاہم ماہم کے اطمینان میں ذرا فرق نہیں آیا نہ ہی اس نے کوئی جواب دیا۔ بس آٹا گوندھ کر ایک طرف رکھا اور ساتھ لگے سنک میں ہاتھ دھونے لگی۔ ماہم کا پرسکون انداز اور جواب نہ دینا گوہر ممانی کو غصہ دلاتا تھا۔ ان کا بس چلتا تو اب بھی اسے روئی کی طرح دھنک ڈالتیں مگر جب سے وہ بڑی ہوئی تھی ان کے قابو میں نہیں آتی تھی۔ اس کا قد ان کے قد سے کافی لمبا ہو گیا تھا۔

جوان خون وہ بھی جوش مارتا ہوا وہ خود کو سنبھال لیتی تھیں اور اس سے ذرا کم ہی مخاطب ہوا کرتیں۔ اس کا بلا کا اعتماد۔ حسن اور بے نیازی اس کے اردگرد ایک ان دیکھا حصار سا بنائے رکھتے تھے۔ سورج کی تپش کی طرح۔ انہیں لگتا کہ وہ اس کے قریب گئیں تو جل جائیں گی۔ اس کو زیادہ دیکھنے سے ان کی آنکھیں چندھیانے لگتی تھیں۔ وہ ہڑبڑا جاتیں اور کمپلیکس کا شکار ہونے لگتی تھیں۔ پارلر کے چکر بڑھا دیتیں۔ نئے نئے برینڈز کے چند سوٹ مزید خرید لاتیں۔

وہ اندر ہی اندر اس کی چڑھتی عمر سے اپنی ڈھلتی عمر کا موازنہ کرتیں اور جلتی کڑھتی رہتی تھیں۔

جب سے وہ ان کے گھر آئی تھی تب سے مستقل ان کے اعصاب پر سوار تھی۔ پیدا ہوئی تو بوجھ۔ کچھ بڑی ہوئی تو ہڈ حرام۔ جوان ہوئی تو مد مقابل اور ایک مستقل خوف۔ دو جوان بیٹوں کا جو اس کے گرد پروانوں کی طرح پھرتے تھے۔ کہیں لے نہ اڑے۔ زندگی گزارنے کے بہانے۔

"بات کرتی ہوں میں تمہارے ماموں سے آج۔ کیا تماشا لگا رکھا ہے اس لڑکی نے۔ آوارگی کی کوئی حد ہوتی ہے یا نہیں، گھر سے باہر رہنے کے بہانے۔ مطلب۔ سمجھ کیا رکھا ہے تم نے تمہارے باپ نے فیکٹریاں لگا کر دی ہوئی ہیں ہمیں کہ یوں تم ہمارے سینوں پر مونگ دلتی رہو گی زندگی بھر۔"

وہ ہاتھ نچا نچا کر بولتی رہیں۔ ماہم کھل کر مسکرائی۔ وہ سکون سے سلیب سے ٹیک لگائے کھڑی تھی ان کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی۔ جیسے کوئی بڑا کسی بچے کو بولتے دیکھتا ہے۔ وہ اور نروس ہو گئیں۔ انہیں اس کی آنکھوں میں دیکھتے رہنا مشکل ہو گیا، مڑ کر خوامخواہ پتیلی کا ڈھکن ہٹا کر زور سے پٹخا اور تیار سالن میں چمچہ چلانے لگیں۔

"میں نے بلا لیا ہے ان لوگوں کو اس ہفتے۔ سمجھ میں آ گیا۔ اس ہفتہ کو۔" انہوں نے اس ہفتہ پر زور دے کر کہا۔

"تمہارا باپ بھی کرے گا شادی۔ عمر نکلی جا رہی ہے اور شہزادی کو فرصت نہیں آوارہ گردیاں کرنے سے۔ تمہاری عمر میں میرے احمد اور عفان دونوں ہو چکے تھے۔"

"ہاہاہا......" ماہم ہنسنے لگی سر پیچھے کر کے اور گوہر ممانی کا بی پی شوٹ کرنے لگا۔

"تمہارا باپ تو تمہارے پیدا ہونے سے پہلے ہی تمہاری ماں اور تمہیں چھوڑ کر بھاگ گیا تھا شکل تک نہیں دیکھی آج تک تمہاری۔ پلٹ کر پوچھا تک نہیں کہ زندہ بھی ہو یا مر کھپ گئیں۔ میں نے تمہیں پالا۔ کھلایا پلایا۔ پڑھایا۔ عزت سے رکھا۔ اب کیا جان لو گی ہماری۔" وہ نفرت سے گھسے پٹے طعنے دینے لگیں۔ اس کا اطمینان اور ہنسی ختم کرنے کا ان کے پاس یہی آخری حربہ ہوتا تھا اور کسی حد تک کامیاب بھی۔

"ممانی! پیر سے میری جوائننگ ہے آٹھ سے چھ بجے، اور ہاں ماموں کو میں بتا چکی ہوں۔ ان کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔" ممانی کی کاجل زدہ آنکھیں پھیل گئیں۔

"اور ویسے بھی میری شادی کی عمر تو نکل ہی چکی ہے آپ ایسا کریں اپنے احمد کے لیے رشتہ ڈھونڈنا شروع کر دیں اب۔"

اس نے یہ کہہ کر لب بھینچ لیے اور تیزی سے کچن سے نکل گئی۔

گوہر ممانی نفرت اور غصے سے مٹھیاں بھینچ کر رہ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں لہو اتر آیا تھا۔ وہ ہمیشہ ان

کی پلاننگ پر پانی پھیرتی آئی تھی۔ انہوں نے لمبے لمبے سانس لے کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی اور ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی کر اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئیں۔ انہیں ابھی نئے سرے سے پلاننگ کرنی تھی اور یہ کام وہ لیٹ کر اچھا کرتی تھیں۔

☆☆☆

اس کو جاب پر جاتے ہوئے پندرہ دن ہو گئے تھے۔ ابھی وہ ٹرائل پیریڈ جاب پر تھی فی الحال مگر وہ کام بہت جلدی سیکھ گئی تھی اور اسے امید تھی کہ وہ کانٹریکٹ کے مطابق دو مہینے سے پہلے ہی پرمننٹ ہو جائے گی۔

آج اس نے بلیک جینز پر سادہ سی وہائٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ پرنٹڈ اسکارف گلے میں ڈالا تھا ابھی اس نے اپنی جگہ پر آ کر لیپ ٹاپ لاگ ان ہی کیا تھا کہ انٹر کام پر باس نے اسے اپنے آفس میں آنے کا کہا۔ اس نے ایک نظر لیپ ٹاپ پر ڈالی اپنی ای میل چیک کی۔ کل تک کا سارا کام مکمل تھا۔ سارا ڈیٹا کمپنی کے سوفٹ ویئر میں فیڈ کر کے وہ باس کو جانے سے پہلے ای میل کر کے گئی تھی۔ لہٰذا اعتماد سے وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنے بمشکل کندھوں تک آتے سلکی بال ہاتھ سے سنوارتی ان کے آفس میں داخل ہوئی۔

''مارننگ سر!'' اس نے ان کی میز کے پاس جا کر کہا۔

''پلیز۔'' باس نے دراز سے ایک لفافہ نکال کر سامنے رکھا اور ٹیبل کے دوسری طرف رکھی چیئر پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ ان کے مقابل کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔

باس نے نظر کے چشمے کے پیچھے سے اپنی کشادہ براؤن آنکھیں ماہم پر مرکوز کیں۔ وہ ایک درمیانی عمر کے گریس فل مرد تھے۔ براؤن بالوں فرنچ کٹ داڑھی اور نفیس سے گلاسز نے ان کو بہت باوقار بنا دیا تھا۔ کھڑی ناک تھی اور چہرے کی سرخی مائل سفید رنگت میں خوش حالی اور بے فکری جھلکتی تھی۔ گرے دھاریوں والی شرٹ کی آستین فولڈ کیے چہرے پر اپنائیت بھری مسکراہٹ لیے وہ اسے دیکھ رہے تھے۔

''یہ کیا ہے سر؟'' ماہم نے سامنے رکھے لفافہ کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

''آپ کی جاب کا کنفرمیشن لیٹر۔'' انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر مسکرا کر کہا۔

ماہم کو امید تھی کہ اسے وقت سے پہلے مستقل کر دیا جائے گا اسی لیے اس نے سنجیدگی سے لفافہ کھول کر اندر رکھا کاغذ نکال کر اپنے سامنے سیدھا کیا اور اسے پڑھنے لگی۔

''آپ نے توقع سے زیادہ اچھا کام کیا ہے۔ آپ کی اور آپ کے ہارڈ ورک کی سب تعریف کرتے ہیں۔ بلکہ اسمارٹ ورک کہنا زیادہ مناسب رہے گا۔ نہیں؟''

ماہم نے ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اس لیٹر کو دوبارہ سے تہہ کر کے لفافہ میں رکھا ایسی مسکراہٹ جو مقابل کو گھائل کر دے اور تب خاص طور پر جب کہ وہ صنف مخالف بھی ہو۔

''تھینک یو سر!''

علی کو اس پر سے نظریں ہٹانا مشکل لگ رہا تھا۔ اور تب ہی اچانک انہوں نے اسے اپنے ساتھ باہر کافی پینے کی آفر کر دی۔ وہ ذرا سا چونکی تھی۔ پھر فوراً ہی سنبھل گئی یہ سب اس کی توقع کے خلاف نہیں تھا مگر اتنی جلدی کی بھی اسے امید نہیں تھی۔

''ایکچوئلی یہاں کا رول ہے پہلی سیلری پر یا پروموشن اور جاب کنفرم ہونے پر سب ہی ٹریٹ دیتے ہیں۔ مگر اس دفعہ یہ ٹریٹ میری طرف سے۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو۔''

''شیور۔'' وہ بس ذرا سا ہچکچائی تھی پھر ان کی براؤن آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے آرام سے کہا تھا۔

ماہم کی آنکھوں میں ایسا کچھ تھا کہ علی زیادہ دیر ان میں دیکھ نہیں سکے تھے۔ سامنے پڑے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر بے مقصد نظریں جمائی تھیں ماہم ان

سے اجازت لے کر اپنے آفس میں آ گئی تھی۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر ایک گہرا سانس لے کر سامنے رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ اس کی نظریں کسی نادیدہ شے پر جمی تھیں اور وہ کسی بہت گہری سوچ میں ڈوب چکی تھی۔

☆☆☆

"تمہیں نہیں لگتا ماہم! کہ تم صحیح نہیں کر رہی ہو۔"

بیلا نے اس کو آڑوؤں کی پلیٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت بیلا کے گھر آئی ہوئی تھی اس کو بیلا کے کچھ سوٹ چاہیے تھے آفس کے لیے کیونکہ اس کے پاس اتنے کپڑے نہیں تھے کہ وہ آفس میں ہر روز بدل کر جا سکے۔

اتوار کا دن تھا اور وہ دونوں ہی فرصت سے تھیں۔ آڑو ماہم کے پسندیدہ تھے وہ جب بھی اس کے گھر آتی اور آڑو کا سیزن ہوتا تو بیلا اسے آڑو ضرور کھلاتی تھی ماہم نے چھری اٹھائی اور آڑو کاٹ کر کھانے لگی اس نے جان بوجھ کر بیلا کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ بیلا بیڈ پر اس کے برابر بیٹھ کر اس کو خاموشی سے دیکھتی رہی۔

"تم سناؤ تمہاری ٹیوشنز کیسی جا رہی ہیں۔ اور ڈپلوما؟" ماہم نے آڑو کھا کر پلیٹ سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور ٹشو سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی بولی۔

"صحیح بٹ لف روٹین یار تھک جاتی ہوں۔"

بیلا صبح میں مانٹیسوری ڈپلوما کر رہی تھی اور شام میں ہوم ٹیوشن لیتی تھی۔

"تھکن تو کس کو نہیں ہے جناب، اس دنیا کے ہر بندے کو کسی نہ کسی چیز کی تھکن ہے کسی کو کام کی تھکن ہے۔ کسی کو کچھ نہ کرنے کی تھکن ہے۔ کسی کو رشتوں کی کسی کو محبت کی۔ کسی کو بے وفائی کی۔"

"تم مفکر کب سے بن گئیں۔"

"جب سے اس نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔"

ماہم نے گنگنانے کے اسٹائل میں معنی خیزی سے کہا۔

"اس کے دو بچے ہیں ماہم!"

بیلا نے پھر وہی بات کہی جو وہ کب سے کرنا چاہتی تھی۔

"قسم سے یار۔ دال سبزی کھا کھا کر مجھے تو سیخ کباب اور مٹن بریانی کا ذائقہ تک بھول گیا تھا۔"

ماہم نے پھر بات گھمائی۔ اپنے اور علی کے متعلق اگرچہ اسی نے فون پر بیلا کو سب بتایا تھا۔ مگر اب یہاں اس کے گھر پر کسی سبب کے ماہم یہ سب ڈسکس نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"یہ جو پیٹ ہے ناں یہ زندہ رہنے کے لیے لگا ہے مگر یہی انسان کو مار ڈالتا ہے۔" بیلا نے جواباً کہا۔

"یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا"

"بہت گھسا پٹا شعر ہے ماہم تمہاری فلاسفی کی طرح۔"

"ابھی اتنا کچھ ہے اپ ڈیٹ کرنے کے لیے یار کہ شاعری اور فلاسفی کو تم گھسا پٹا ہی رہنے دو پلیز۔ اور ویسے بھی تمہاری طرح فلسفی نہیں ہوں میں۔"

"رئیلی پھر کیا ہو؟"

"بس ایک سیدھی سادھی پریکٹیکل بندی۔"

"پریکٹیکل تو خیر میں بھی ہوں مگر تمہاری طرح شارٹ کٹس نہیں ڈھونڈتی میں پیاری سنڈریلا۔"

"کبھی تم مجھے سنو وائٹ کہتی ہو، کبھی سنڈریلا۔"

اس نے برابر رکھا اپنا موبائل اٹھا لیا مطلب اب وہ ان باتوں سے بالکل بور ہو چکی تھی۔

"میں تو تمہیں رپنزل بھی کہتی مگر تمہارے بال اس قدر چھوٹے ہیں۔ اور تعریفیں نہیں، میں تمہیں فیری ٹیلز کے نام تمہاری سوتیلی ماں جیسی ممانی کی وجہ سے دیتی ہوں۔"

"ہاں یار صحیح کہا سوتیلی ماں جیسی ممانی، ابھی گھر جا کر اس مدر گوتھل کو بھی سننا ہے۔ تم مجھے جلدی سے کپڑے دکھاؤ اپنے۔" ماہم ایک جھرجھری لے کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور موبائل سائیڈ پر رکھ دیا۔

اپنی گوہر ممانی کو وہ مدر گوتھل کہتی تھی ان کی بے حد انچ کا شیئس ہونے کی وجہ سے بھی۔ بیلا اٹھ کر کمرے کے ایک طرف بنی لکڑی کی الماری میں سے اپنے کچھ ہینگ کیے کپڑے نکال نکال کر بیڈ پر رکھنے لگی۔

"قسم سے دل تو چاہتا ہے کہ اس گوتھل کے دونوں بیٹوں کو بے وقوف بنا کر اس سے سارے بدلے اتارلوں۔ پر کیا کروں میرے پاس ٹائم نہیں ہے ناں۔"

وہ مظلوم سی شکل بنا کر کپڑے دیکھنے لگی۔

"خیر بے وقوف تو تم انہیں بناتی رہتی ہو۔ کافی کام نکلوائے ہیں تم نے ان سے اپنے۔ تب ہی وہ بھی ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں۔ ورنہ......"

بیلا کہتے کہتے رکی کیونکہ بیلا کی امی کمرے میں آئی تھیں۔ ماہم ہاتھ روک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"میں نے پلاؤ دم پر رکھ دیا ہے بیلا۔ آ کر سلاد، رائتہ بنا لو اور کھانا کھا لو دونوں۔" انہوں نے ایک نظر ماہم پر ڈال کر کہا۔ ماہم کی ان سے سلام دعا دروازے پر ہی ہو چکی تھی۔

"ٹھیک ہے امی......" بیلا نے کہا اور مسز انیسہ مڑ کر کمرے سے چلی گئیں۔ ماہم اور بیلا نے ایک دوسرے کو دیکھا ماہم ذرا دیر کو ٹھہر سی گئی پھر اس نے دو سوٹ نکال کر ایک طرف رکھے اور جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

"بس یار! کھانا نہیں کھاؤں گی۔ مجھے دیر ہو رہی ہے گھر جا کر بہت کام کرنے ہیں۔ تم یہ دو سوٹ بیگ میں ڈال دو۔"

"رک جاؤ کھانا کھا کر جانا اب۔ امی نے بنا دیا ہے تمہارے لیے جلدی۔ تم نہیں کھاؤ گی تو ڈانٹ مجھے پڑے گی۔" بیلا باقی سوٹ اٹھا کر الماری میں واپس ہنگ کرنے لگی تھی۔

"کھا لینا میرے لیے تھوڑی سی ڈانٹ۔ موٹی نہیں ہو جاؤ گی۔"

"ابھی تو اچھے کھانے کو ترسنے کی بات کر رہی تھیں تم۔" بیلا اس کے قریب آئی۔

"ہاں یہی تو کہہ رہی تھی کہ وہ ترسنے کا فیز اب ختم ہو چکا ہے۔" ماہم نے نظریں چرا کر کہا تھا۔

"ماہم، کیا کر رہی ہو یار تم۔ یہ تم نہیں ہو۔ ہم نے تو ابھی سرمایہ اکٹھا کرنا تھا ناں اپنے بزنس کے لیے۔ بزنس کرنا تھا بہت آگے جانا تھا۔ اور وہ ایبٹ آباد میں اپنا ویکیشن ہوم۔" بیلا نے ماہم کے ہاتھ تھامے تھے ماہم نے چھڑا لیے۔ اور سامنے دیوار پر لگے آئینے کے سامنے جا کر کہنے لگی۔ سرخ عام سے کپڑوں میں ماہم کا عکس جھلملا رہا تھا۔

"ہر چیز پلان کے مطابق ہی تو ہو رہی ہے بیلا۔" اس نے عجیب کھوئے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

"کچھ نہیں ہو رہا پلان کے مطابق۔ تم غلط سمت میں جا رہی ہو ماہم۔ یہ تم کس سے انتقام لے رہی ہو۔ خود سے؟"

خود ہی ہیں باعث آزار ہم اپنے واسطے ورنہ

نہ ہم ہوتے نہ دل ہوتا نہ دل آزاریاں ہوتیں

اس نے ایک دم بات پلٹی تھی۔ بیلا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس کے نکالے دونوں سوٹ ایک بیگ میں ڈالنے لگی۔

"یہ تم نے ہی ڈیزائن کر کے سلائی کیے تھے یاد ہے۔" بیلا اسے کچھ جتا رہی تھی۔

"یاد ہے کیسے بھول سکتی ہوں۔"

"تم بہت ٹیلینٹڈ ہو ماہم۔ کتنے خوب صورت ڈیزائن کرتی ہو تم کپڑے کٹ پیس سے۔ کتنی صفائی ہے تمہارے ہاتھوں میں۔ اپنے ٹیلنٹ کو ضائع مت کرنا۔ اللہ نے تمہیں ہنر دیا ہے ذہانت دی ہے اسے استعمال نہ کر کے کفران نعمت مت کرنا۔"

بیلا نے کپڑوں کا بیگ اسے تھماتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ امی کو بچپن سے ممانی اور ان کے پورے خاندان کے کپڑے سیتے دیکھ کر میں نے خود ہی کپڑے سینے سیکھ لیے۔ پھر ضرورت ایجاد کی ماں

ہوتی ہے بیلا۔ ممانی کے پرانے کپڑے مجھ پر کتنے برے لگتے تھے۔ ڈھیلے، بڑے، پھٹے ہوئے۔ ان کو ٹھیک کرتے کرتے میں ٹیلر ہی بن گئی اور اچھے کپڑے پہننے کی چاہ نے مجھے ڈیزائنر بنا دیا۔ سارے گھر کے کام۔ پڑھائی اور پھر سلائی۔ ممانی کے کپڑے۔ محلے والوں کے اجرت پر کپڑے۔ وہ اجرت جو ممانی وصول کرتی تھیں پھر مجھے بعد میں ترسا ترسا کر بھیک کی طرح فیس اور کتابوں کے پیسے دیتی تھیں۔"

وہ بے رحمی سے مسکرائی تو اس کی مسکراہٹ زخمی تھی اور اس میں زمانوں کی تھکن تھی۔ وہ خودترسی میں مبتلا ہو رہی تھی۔ اور خودترسی بری چیز ہوتی ہے۔ اس میں مبتلا ہو کر انسان اپنے لیے غلط کو صحیح اور ناجائز کو جائز سمجھنے لگتا ہے۔

"ماہم کم آن ......" بیلا نے تنبیہی انداز میں کہا تھا۔" جو بھی تھا۔ وہ وقت تو اب تقریباً گزر گیا ناں میری جان۔ تمہارے پاس ایک ہنر ہے۔ اور یہ قدرت کا عطیہ ہے ماہم! ہم جیسوں سے پوچھو، جنہیں سوئی بھی پکڑنی نہیں آتی ایسا لگتا ہے کہ تم کوئی سنڈریلا ہو، ماورائی طاقتوں والی۔"

وہ اس کی تعریفیں کر کے اس کی ہمت بندھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا موڈ بحال کرنے کے لیے وہ اسے بچوں کی طرح بہلا رہی تھی۔ وہ اسے ہمیشہ ایسے ہی بہلاتی تھی اور وہ بہل جاتی تھی۔ مگر آج وہ نہیں بہلی تھی۔ سنڈریلا اب بڑی ہو گئی تھی۔

"گفٹ ......جس سے سب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یوز ہی کرتے ہیں۔ اور ہنر اس فیلڈ میں آنے کے لیے فیشن ڈیزائننگ کی تعلیم کے اخراجات اٹھانے کی اوقات نہیں ہے میری۔ تم جانتی ہو سب۔ خیر اللہ حافظ۔"

وہ کہہ کر رکی نہیں تھی۔ ویسے بھی اسے دیر ہو رہی تھی۔

"ہونہہ ...... پہلے جاب کر کے پیسہ جمع کرو۔ پھر فیشن ڈیزائننگ کی ڈگری لو۔ پھر ایک دفعہ پھر سرمایہ اکٹھا کر کے ......اور قدم جمانے میں بھی لگ جائیں گے یہی کوئی سات آٹھ سال۔ مطلب۔"

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

اور جب عیش کرنے کا وقت آئے گا تب تک جوانی نہیں رہے گی۔ کیا فائدہ۔ پھر بچے بیماریاں بڑھاپا اور موت۔

استغفراللہ۔" وہ بیلا کے گھر کی سیڑھیاں اترتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔" اس سے اچھا یہ نہیں کہ بندہ شاٹ کٹ......"

اور پھر شام کو جب درختوں اور تمام چیزوں کے سائے عاجزی کے ساتھ اللہ کو سجدہ کر رہے تھے ماہم اپنے بوجھل قدم گھسیٹتی ہوئی سارے راستے مستقبل کے متعلق پلاننگ کرتی ہوئی گھر آئی تھی اس مستقبل کے متعلق جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ یہ بھی نہیں کہ اس میں وہ ہے بھی یا نہیں۔

☆☆☆

گھر آ کر اس نے ممانی کی بہت ساری صلواتیں ایک کان سے سنیں اور دوسرے سے نکال دیں اور کپڑے دھونے کھڑی ہوئی۔ شام ڈھل رہی تھی وہ جلدی جلدی کام نمٹانا چاہتی تھی کھانا وہ پکا کے گئی تھی۔

ماموں، احمد اور عفان وغیرہ کے کپڑے سائیڈ پر رکھ کر صرف اپنے کپڑے دھونے لگی ممانی کمرے کی چوکھٹ پر کھڑی غور سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"یہ باقی کے کپڑے تمہاری ماں قبر سے آ کر دھوئے گی کیا؟" قریب آ کر کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر ممانی نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

"نہیں ممانی! میری ماں کو قبر سے آنے میں دیر لگے گی۔ آپ کی ماں ہاں آ سکتی ہے اگلے محلے سے۔ مگر ان کی تو ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے ناں۔" وہ غصے سے بولتے بولتے دھیمی پڑی تھی کیونکہ سامنے سے مین گیٹ چابی سے کھول کر عفان آ رہا تھا۔

"ممانی! میں دھوؤں گی آف کورس۔ ہمیشہ کی طرح کپڑے آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔" ماہم نے فوراً

پینترا بدلا۔ لہجے میں مصنوعی مٹھاس گھول کر اس نے آنکھیں گھمائی تھیں۔ براؤن کانچ جیسی آنکھوں میں لہجے کے برعکس نفرت اور تلخی کی دھندلاہٹ تھی۔ ممانی کا خون کھول گیا۔ کمان سی بھنویں سکڑ گئیں اور ناک غصے سے مزید پھیل گئی۔

"میسنی خوب جانتی ہوں تیرے چلتر میں۔" وہ دانت پیس کر اس پر جھپٹیں اور اس کے بال مٹھی میں جکڑے، تب تک عفان چھلانگ مار کر بیچ میں آ گیا۔

"کیا مما...... ہر وقت۔" وہ اپنی ماں کو پیچھے ہٹاتا ہوا بے زاری سے بولا۔

"ہٹ پرے تو بے غیرت جانتا کیا ہے۔" انہوں نے عفان کو زور سے دو تھپڑ لگائے۔

"جیسی ماں ویسی بیٹی ہے۔ دھو یہ سارے کپڑے ساری زندگی میرا خون چوسا ہے ان ماں بیٹیوں نے مل کر اور تم تو اندر چلو۔ یہاں کیا چپک کر کھڑے ہو گئے ہو۔" انہوں نے عفان کو اندر کی طرف دھکا دیا اور خود گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے اس کو بکتی جھکتی اندر چلی گئیں۔ عفان ٹھہر کر ماہم کو دیکھتا گیا۔ "جامنی سوٹ میں جامن لگ رہی ہے بالکل مدر گوتھل۔" ماہم نے جذبات میں گوتھل کچھ زیادہ ہی اونچی آواز میں کہہ دیا تھا کچھ فاصلے پر کھڑے عفان نے سن لیا۔

"گوتھل!" عفان نے سوالیہ انداز میں دہرایا۔

"مطلب ایک غم گسار ماں......" وہ گڑبڑائی تھی پھر کندھے اچکا کر اٹک اٹک کر بولی۔ عفان کی تسلی نہیں ہوئی تھی وہ اسے مشکوک نظروں سے دیکھتا ہوا اندر کمرے میں چلا گیا۔

"گدھا۔ اب کہیں جا کر گوگل ہی نہ کرنے لگے باؤلا۔"

وہ بڑبڑائی۔ "خیر مجھے کیا اب۔" اس نے غصے سے نیچے زمین پر پڑے ماموں ممانی کے کپڑوں کے ڈھیر کو ٹھوکر ماری تھی۔

☆☆☆

بیلا اپنے اسٹوڈنٹس کو ان کے قریبی پارک لے کر آئی تھی احد اور ایلان وہ دونوں ایلمنٹری اسکول میں پڑھتے تھے۔ کل چھوٹی ایلان کی برتھ ڈے تھی اور ان کے انوائیٹ کرنے کے باوجود بیلا نہیں گئی تھی تو وہ دونوں آج اسے بے حد اصرار کر کے پارک لے آئے تھے۔ بیلا کو بچے ویسے بھی بہت پسند تھے۔ وہ بچوں کے ساتھ بہت جلدی ایڈجسٹ ہو جاتی تھی اور بہت آرام سے ان کے ساتھ گھنٹوں گزار سکتی تھی۔ وہ بچوں اور بوڑھوں کے ساتھ خود کو بہت کمفرٹیبل محسوس کرتی تھی۔ اس کو لگتا تھا دونوں معصوم ہوتے ہیں۔ سیاست سے دور۔ اسی لیے وہ مونٹیسوری ڈپلوما کر رہی تھی اس نے بہت پہلے سے سوچ رکھا تھا کسی اسکول، یتیم خانہ یا اولڈ ایج ہوم میں جاب کرنے کا۔ پارک آ کر وہ دونوں بچوں کے ساتھ فٹ بال کھیلنے لگی تھی تب ہی احد نے فٹ بال کو ہٹ کیا اور بال ڈائریکٹ جا کر سامنے جاگنگ کرتے ہوئے لڑکے کو لگی۔ دونوں بچے ذرا ڈر گئے وہ لڑکا ضرور اپنی طرف آتی بال کو کیچ کر لیتا اگر وہ میوزک میں اتنا مگن نہ ہوتا۔ اس لڑکے نے رک کر دور گری بال کو اٹھایا اور ذرا غصے سے ان کی طرف دوبارہ اچھال کر آگے چل پڑا۔ وہ لوگ مطمئن سے دوبارہ کھیل میں مصروف ہو گئے۔ مگر یہ صرف اتفاق تھا یا کچھ اور کہ دوسرے چکر میں جب وہ لڑکا دوبارہ ٹریک پر آیا تو پھر سے ایلان سے بال اسی لڑکے کی کمر پر جا کر لگی۔ بیلا نے بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ لڑکا اب کے اپنی ہینڈز فری اتار کر اور بال پکڑ کر ان کی طرف آیا۔ بیلا منہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"یہ تو معصوم ہیں مگر آپ نے لگتا ہے جان بوجھ کر مجھے ٹارگٹ کیا ہوا ہے۔" اس نے باری باری سب کو غور سے دیکھا اور بیلا سے مخاطب ہوا۔

"ایکسکیوز می!" بیلا حیرت سے بولی۔

"ہم نے یہ جان بوجھ کر نہیں کیا ہارون، یہ صرف اتفاق تھا۔"

احد نے اس لڑکے کا نام لے کر کہا تو بیلا سمجھ گئی کہ بچے اسے جانتے ہیں۔

''میں تمہارے ڈیڈ سے شکایت کروں گا۔'' اس نے دھمکی دینے والے انداز میں بچوں سے کہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ ان کی اچھی انڈرسٹینڈنگ ہے۔

''نو ہارون! یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔'' ایلان خفگی سے چلائی۔ وہ ابھی اور بھی بہت کہتی کہ بیلا نے اسے بیچ میں ٹوک دیا۔

''چلو بچو! ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔''

اور پھر وہ زبردستی بچوں کو لے کر باہر نکلی بچوں کو ان کے گھر چھوڑا اور پھر اپنے گھر کے لیے روانہ ہوئی۔

ہارون اور بیلا کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ پھر ہارون کا بیلا سے اپنے کزن عالیان (جن کے بچوں کو بیلا ٹیوشن پڑھاتی تھی) کے گھر دو تین دفعہ سامنا ہوا اور پھر اکثر ہی ہارون شام کو اس وقت ان کے گھر آنے لگا جب بیلا بچوں کو ٹیوشن دے رہی ہوتی تھی۔

بیلا کے سانولے رنگ پر بڑی گہری سیاہ آنکھیں اور گھنی پلکیں تھیں، گھنگھریالے بال کمر تک آتے تھے وہ زیادہ تر میک اپ سے بے نیاز رہتی اور غضب ڈھاتی تھی۔

کبھی کبھی جو آنکھوں میں کاجل لگا لیتی تو ہارون کا اس کو دیکھنا مشکل ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب حزن اور معصومیت تھی۔ وہ اکثر جینز یا ڈھیلے سے ٹراؤزر پر زیادہ تر کالی یا سفید رنگ کی لانگ شرٹس یا فراکیں پہنتی تھی۔ وہ عام سی ہو کر بھی خاص لگتی تھی۔ پتا نہیں کیوں جیسے کلرفل لوگوں کی بھیڑ میں کوئی بلیک اینڈ وائٹ آ جائے۔

ہارون نے تھوڑے ہی وقت میں بیلا کے متعلق تمام تر معلومات حاصل کر لی تھیں۔ کہاں رہتی ہے۔ کہاں تک کہاں سے تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کی سرگرمیاں کیا کیا ہیں۔ خود اس نے تازہ تازہ انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کیا تھا۔ اپنے بزنس ٹائیکون بیک گراؤنڈ کے باوجود۔ وہ الگ سا تھا۔ بظاہر تو وہ بھی بالکل عام سا دکھتا تھا۔ لیکن جو عام سے ہوتے ہیں وہی تو خاص ہوتے ہیں ناں۔ دبلا پتلا لمبا سا۔ عام سے نقوش اور کرلی بالوں والا۔ اسے شاعری۔ بارش اور سب لڑکوں کی طرح لڑکیاں اچھی لگتی تھیں۔

اس نے بہت ساری لڑکیوں سے دوستی کی تھی۔ ان کے ساتھ ٹائم گزارا تھا۔ مگر کسی کے ساتھ بھی نہیں کوئی گھنٹی نہیں بجی تھی۔ کسی کے ساتھ نے بھی اس کی نیندیں نہیں اڑائی تھیں۔ نہ کسی سے دوبارہ ملنے کے لیے دل مچلا۔ نہ کبھی کوئی اتنی اچھی لگی کہ اس کی تصویر اپنے موبائل اور والٹ میں رکھنے کا دل کیا ہو۔ لیکن اب سب کچھ بدل گیا تھا۔ اور پھر کئی مہینے وہ اسی طرح بیلا کی موجودگی میں عالیان کے گھر کے چکر۔

لیکن بیلا اسے موقع نہیں دے رہی تھی۔ اور یہ چیز اسے بیلا کی طرف اور مائل کرتی جا رہی تھی۔ پھر ایک دن بارش ہو گئی۔ تب بچوں کے فائنل ٹرمز چل رہے تھے اور بیلا ان کی تیاری کے سلسلے میں ذرا دیر رک گئی تھی کہ بارش شروع ہو گئی۔ موسم کئی دن سے اچھا ہی تھا بیلا باہر نکلی تو اچھی خاصی بارش شروع ہو چکی تھی۔

وہ بارش میں بھیگتی ہوئی تیز تیز چل رہی تھی۔ ان کے گھر سے مین روڈ تک پیدل اس کو لگ بھگ دس منٹ لگتے تھے پھر وہاں سے دو بسیں بدل کر گھر جاتی تھی۔

آج اسے اس بارش میں وہ دس منٹ کا مین روڈ تک کا سفر ڈیڑھ گھنٹے کا لگ رہا تھا کہ ہارون جو کب سے کسی موقع کی تلاش میں تھا گاڑی لے کر اس کے راستے میں آ گیا۔ اور اسے لفٹ کی آفر کی۔ وہ متامل ہوئی۔

''بیٹھ جائیں۔ اتنی تیز بارش میں بسیں نہیں چلتیں۔'' اس نے بارش کے باعث چیخ کر کہا۔

''کوئی بات نہیں میں رکشہ کر لوں گی۔'' بیلا نے کہا پر نجانے کیوں ٹھہری رہی۔

''روڈز پر پانی جمع ہے۔ رکشہ بھی نہیں ملے گا آپ کو۔''

ہارون نے سنجیدگی سے کہا وہ اب بھی نہ بیٹھتی اگر وہ لوگوں کی گزر جانے والی نظروں سے شدید بے

زار نہ ہوتی اور بارش اتنی تیز نہ ہو رہی ہوتی اور پھر گھر تک کا راستہ وہ اسے بتاتی گئی اور ان کے درمیان کوئی بھی اور بات نہیں ہوئی نہ ہی ہارون نے اس کی طرف نظر گھما کے دیکھا۔

اپنی گلی سے باہر اس نے گاڑی رکوائی کیونکہ ان تنگ گلیوں کے اندر گاڑی جا نہیں سکتی تھی۔ اس تھوڑی دیر کی بارش نے بھی اس کے علاقے میں جگہ جگہ پانی کے جوہڑ بنا دیے تھے۔ وہ گاڑی سے اتری بارش کم تو ہو چکی تھی پر ابھی بھی ہلکی ہلکی بوندا باندی جاری تھی۔

''گھر آنے کو نہیں کہو گی مجھے میریڈا۔'' اس نے بھی گاڑی سے اتر کر اچانک کہا تو بیلا چونک گئی۔ اس طرح فیری ٹیلو کے نام تو وہ دیا کرتی تھی ماہم کو۔

''نہیں۔'' بیلا نے اس کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اور یہ پہلی دفعہ تھا کہ اس نے ہارون کو غور سے دیکھا تھا۔

''میں پھر بھی آؤں گا۔'' وہ پیچھے لپکا تھا۔ ''مجھے تمہاری امی سے ملنا ہے میریڈا۔'' بیلا حیرت سے پلٹی تھی۔

''ارے مجھے دیکھنا ہے کہ اس قدر نک چڑھی لڑکی کی امی کیسی ہوتی ہیں۔'' اس نے بات بنائی تھی۔ بیلا ناگواری سے گلی میں آگے چلتی گئی۔ گھر پہنچ کر اس نے دروازہ کھٹکھٹایا اس کی امی نے فوراً ہی کھول دیا وہ اس کے لیے بہت پریشان تھیں اور کئی بار فون بھی کر چکی تھیں۔ وہ اندر داخل ہوئی اور اپنے پیچھے دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔ بس اسے ڈر تھا۔ لوگوں سے زیادہ امی کا اور پھر امی نے بیلا کے پیچھے جوان جہان اجنبی لڑکے کو آتے دیکھا تو ٹھٹک گئیں اور ان کا پورا کا پورا منہ کھل گیا۔ بیلا نے ان کو فون پر نہیں بتایا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ آ رہی ہے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس کے پیچھے گھر تک آ جائے گا۔ ہارون نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور مسز انیسہ کو سلام کیا۔ انہوں نے جواب نہیں دیا بلکہ بیلا کو سوالیہ نظروں سے گھورا۔

''امی! یہ ہارون ہیں۔ عالیان سر کے بھائی۔ بارش ہو رہی تھی تو مجھے چھوڑنے آئے ہیں۔'' بیلا نے طریقے سے ان کو بتایا۔

''اچھا۔'' مسز انیسہ نے طویل پرسوچ اچھا کہا اور اسے مروتاً اور گھر میں آنے کا کہا۔ بیلا آ کر جلدی سے باتھ روم میں گھس گئی۔ چھوٹا سا گھر تھا صحن میں ایک طرف کچن اور باتھ روم بنے تھے سامنے دو کمرے تھے۔

بیلا فریش ہو کر آئی تو وہ امی سے باتوں میں مصروف تھا بیلا نے مروتاً چائے کا پوچھا۔

''شیور۔'' اس نے انیسہ بیگم کو دیکھ کر مسکرا کر کہا۔ کچن میں انیسہ بیگم نے پہلے سے بیسن گھول کر رکھا ہوا تھا اور ساتھ لوازمات۔ وہ لوگ موسم کی پہلی بارش میں پکوڑے ضرور کھاتے تھے اس نے پکوڑے تلے اور ساتھ چٹنی لے آئی اور ٹرے چھوٹی سی ٹیبل پر اس کے سامنے رکھی تو اس کا منہ کھل گیا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ مجھے بارش میں پکوڑے کھانا پسند ہے؟ اور اتنی جلدی کیسے بنا لیے تم نے؟'' وہ ایک جست میں آپ سے تم پر آیا تھا۔

''امی نے پہلے سے سب کر کے رکھا ہوا تھا میں نے بس فرائی کیے ہیں۔''

بیلا سے اس کی اتنی بے تکلفی وہ بھی امی کے سامنے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اب اسے اس کے جانے کے بعد امی کے سوالوں کے جواب دینا تھے وہ جانتی تھی۔ اور امی کو قائل کرنا۔ اف......

''ہاں وہی تو...... اتنے لذیذ پکوڑے تم تو نہیں بنا سکتیں ناں۔''

وہ پکوڑے چٹنی میں ڈبو ڈبو کر کھاتا بولتا رہا۔ اور وہ دانت پیستی مڑ کر دوبارہ کچن میں آ گئی جہاں وہ چائے چڑھا کے آئی تھی اور جب وہ چائے لے کر آئی تو وہ سی سی کرتا پکوڑے کھاتا ہوا انیسہ بیگم سے باتوں میں مصروف تھا۔ وہ اتنی اپنائیت اور دلچسپی سے باتیں کر رہا تھا کہ لگتا نہیں تھا کہ وہ پہلی بار گھر آیا ہے۔ وہ شام ہارون کے لیے ایک یادگار شام تھی۔ بارش، پکوڑے اور اس کی محبت تینوں ہی اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس نے فوراً جیب سے موبائل نکالا اور پکوڑے کھاتے

ہوئے بیلا کی امی کے ساتھ اس بھیگے ہوئے موسم کو قید کرلیا۔

☆☆☆

ماہم ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی آئینے میں علی کے عکس کو دیکھ رہی تھی۔ سیاہ شیفون کی لمبی سی فراک میں اس کا وجود چمک رہا تھا۔ علی ایک سیاہ مخملی ڈبیہ سے بہت نازک سا نیکلس نکال کر اس کی خوب صورت گردن میں پہنانے لگا

''اوہ...... ماہی ڈیئر تم اتنی حسین اور نازک ہو۔ تمہیں تو محلوں میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔'' وہ اسے نیکلس پہنا کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے سامنے آئینے میں اس کے عکس کو دیکھتے ہوئے مخاطب تھا۔

''تم مجھے پہلے کیوں نہیں ملیں۔''

''پہلے کیسے مل سکتی تھی۔'' اس نے اپنی گردن میں پہنائے گولڈ کے اس نفیس سے نیکلس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ذومعنی لہجے میں کہا۔

''ہاں پہلے کیسے مل سکتی تھیں۔ تم تو اتنی چھوٹی ہو۔''

''بالکل۔'' ماہم نے اس کے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹائے اور اس کے مقابل ٹیبل سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوئی اس کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتے بولی۔

☆☆☆

یہ دو کمروں کا اپارٹمنٹ تھا۔ کشادہ خوب صورت ویل فرنشڈ۔ شہر کے بہترین علاقے میں جو علی نے اس کے لیے لیا تھا۔ وہ آفس چھوڑ چکی تھی۔ کیونکہ وہاں کا اسٹاف اس کے متعلق باتیں بنانے لگا تھا اور ان کی چبھتی ہوئی نظریں۔ ایسا نہیں تھا کہ ماہم کو لوگوں کا خوف تھا۔ یہ تو علی کی خواہش تھی کہ وہ اب آفس نہ آئے۔

ماہم سے پہلے بھی علی کی فی میل اسٹاف سے متعلق کئی خبریں گردش کرتی رہی تھیں۔ وہ پہلی تو نہیں تھی۔ یہ سارا اسٹاف ہی جانتا تھا۔ شروع شروع میں ماہم آفس کے اوقات میں آفس کے بجائے اس اپارٹمنٹ میں آنے لگی۔ اور پھر جلد ہی اس نے ممانی کا گھر چھوڑ کر مستقل اپارٹمنٹ میں رہنا شروع کر دیا۔

اور گھر چھوڑتے وقت ایک طویل تماشا ہوا۔

اگرچہ ماہم نے بتایا تھا کہ وہ آفس کی طرف سے دیے گئے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو رہی ہے۔ مگر پھر احمد نے کہیں سے کھوج لگا کر پورے گھر کو اصل حقیقت بتا دی جس پر پورے گھر میں ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔

ممانی نے سنتے ہی پورے محلے کو اکٹھا کر کے اس کی سات پشتوں کو سنایا اور عفان کی صدمے سے بری حالت تھی وہ اپنے سے کئی سال بڑی ماہم کی محبت میں پچھلے کئی سال سے گرفتار تھا۔

اور ماموں ہی تھے۔

وہ حیرانگی اور افسوس سے بس اسے دیکھتے ہی رہے اور وہ ان سے نظریں نہیں ملا پائی۔ بس خاموشی سے نظریں چراتے ہوئے اپنا تھوڑا بہت سامان پیک کر کے ان کے گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی۔

آتے ہوئے ممانی نے اس سے کہا تھا کہ اب وہ ان سب کے لیے مر چکی ہے لہٰذا اب کبھی وہ دوبارہ پلٹ کر ان کو اپنی شکل بھی مت دکھائے۔ اور ماہم تو خود یہی چاہتی تھی۔

اس شام آسمان پر پرندے اداس اور خاموش سے اڑ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے جانے کا سوگ منا رہے ہوں۔

☆☆☆

وہ یونی ورسٹی سے آئی تھی۔ آتے ہی کھانا پکا کر اب لکڑی کی کرسی پر ایک پاؤں نشست پر اور دوسرا ہتھے پر رکھے بیلنس بنائے ہاتھ میں جھاڑو پکڑے چھت کے جالے اتار رہی تھی۔

ممانی ذرا فاصلے سے کھڑے ہو کر کمر پر ہاتھ رکھے اسے ہدایت دیتی ہوئی مسلسل اس پر طعنوں اور لعنتوں کی برسات کر رہی تھیں جو کہ ان کی پرانی عادت تھی۔

''آپ کو پتا ہے۔'' اس نے ہاتھ روک کر

دونوں پیر کرسی کی نشست پر رکھے اور ذرا کمفرٹیبل ہو کر کہنے لگی۔

"میرے ذہن میں اکثر خیال آتا تھا کہ عورتیں جہنم میں زیادہ کیوں جائیں گی۔" اس کا سانس پھول رہا تھا۔ وہ بے حد تھکی ہوئی تھی۔ ممانی نے بغیر کچھ کہے بےزاری سے سوالیہ انداز میں آنکھیں پھیلائیں۔

"جبکہ دنیا کے بڑے بڑے کرائم تو مرد کرتے ہیں۔ اغوا، چوریاں، ریپ، قتل، جنگیں پھر کیوں اب پتا چل گیا ان کی زبان کی وجہ سے۔"

اس نے کہہ کر پھر سے اپنا کام شروع کرنا چاہا مگر ممانی طیش کے عالم میں اس کی طرف جھپٹیں اور اسے اس کی قمیض سے پکڑ کر اپنے قریب کیا۔

"مت بھولا کرو بدبخت لڑکی اپنی اوقات۔ میرے احسانات یاد کرو۔ تم صرف ایک بدقسمت اور بےکار لڑکی ہو اور تمہیں یہ بات ہر دفعہ اپنا یہ بدصورت منہ کھولنے سے پہلے یاد رکھنی چاہیے۔"

ان کی آنکھیں اس کی آنکھوں سے دو سینٹی میٹر کے فاصلے پر تھیں ان کے منہ سے اڑتا کف اس کے چہرے پر بکھر رہا تھا۔ وہ انتہائی سرخ آنکھوں میں نفرت لیے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے انہیں گھور رہی تھی جیسے ابھی اس کا بس چلا تو انہیں قتل کر ڈالے۔ یہ کہہ کر انہوں نے مٹھی میں جکڑی اس کی قمیض کو جھٹکے سے پیچھے چھوڑا اور تن فن کرتی کمرے سے نکل گئیں۔

ماہم کا تنفس تیز ہو گیا تھا۔ بہت تیز نفرت انگیز جملوں اور لہجے کا اثر چند سیکنڈ وہ ہل نہیں سکی پھر ایک گہری سانس لے کر کرسی پر گری۔

دھیمی سی آواز آئی اور علی ٹیرس کا دروازہ کھول کر اس کے برابر آ کھڑا ہوا اور وہ ماضی سے حال میں لوٹ آئی۔ علی نے ہاتھ میں پکڑے گلاس سے گھونٹ بھرتے ہوئے دوسرا ہاتھ لمبا کر کے اس کے گرد حمائل کیا۔ وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد وہاں ٹھہرے ہوئے تھے وہ سرخ ٹخنوں کو چھوتا نائٹ ڈریس پہنے ٹیرس پر کھڑی نیچے سوئمنگ پول پر جھلملاتی روشنیوں کے عکس دیکھ رہی تھی۔ علی اپنا مشروب پیتا ہوا دور شہر کے مین روڈ سے ٹریفک گزرتا ہوا دیکھنے لگا۔

"نہیں ممانی! آپ غلط تھیں اور میں بھی۔ میں بدقسمت نہیں ہوں اور نہ ہی لوزر امی کی طرح۔ میں شارٹ کٹ پر بلیو رکھتی ہوں۔" وہ سوچ ہی رہی تھی کہ علی نے اس سے پوچھا۔

"کیا سوچ رہی ہو سویٹ ہارٹ؟"

"میں یہ سوچ رہی ہوں کہ ہم دونوں کتنے خوش قسمت ہیں ناں۔" اس نے علی کے مزید قریب ہوتے ہوئے ناز سے کہا۔

"ہم دونوں؟" علی نے شرارتی انداز میں کہا جبکہ اس کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔

☆☆☆

"تم گناہ کا ارتکاب کر رہی ہو، تم کیوں نہیں سمجھتیں یہ گناہ کبیرہ ہے۔" بیلا چلائی تھی۔

"آہستہ بولو بیلا۔ پاگل ہو گئی ہو تم۔"

ماہم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ کمروں کے اندر بھی زور سے بات کرو تو پڑوسی سن سکتے تھے وہ جو سننے کے لیے تیار بیٹھے ہوتے تھے۔

بیلا نے نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹکا تھا۔ ماہم سٹپٹا کر رہ گئی۔ پچھلے ایک گھنٹے سے ان کی بحث ہو رہی تھی۔ ماہم بیلا سے ملنے اس کے گھر آئی ہوئی تھی وہ اس کو علی سے ملوانا چاہتی تھی۔ اس کو اپنا گھر دکھانا چاہتی تھی وہ گھر جس کی پلاننگ اس نے بچپن سے کی تھی۔ بہت بچپن سے۔

جب وہ اور اس کی ماں ٹھنڈے فرش پر ایک ناکافی گرم چادر بچھا کر سوتے تھے ٹھنڈ اور مچھروں سے لڑتے ان کی پوری رات گزر جاتی تھی تب۔

اور جب اس کی ممانی اس کی ماں کو اس کے سامنے ذلیل کرتی تھیں کام کرنے پر۔ اور اس کی ماں کی دبی دبی سسکیاں رات کی تنہائی میں گونجتی تھیں۔ جن سسکیوں کی گواہ صرف وہ تھی یا اللہ۔

اس کی ممانی اسے بے حد بے رحمانہ طریقے

سے مارتی تھیں۔ ممانی بھی اور اس کے کزنز بھی۔ اور جب وہ ممانی اور کزنز سے پٹ رہی ہوتی تھی تو اس کی امی اس کو ان سے کبھی نہیں بچاتی تھیں۔ بچاتیں بھی کیسے۔ وہ ان کے گھر میں رہتی تھیں۔ ان کا کھاتی تھیں۔

اور جو آپ پر پیسے خرچ کرتے ہیں ان کے سامنے آپ کی نظریں جھکتی ہیں۔ آپ ان کی ہر جائز و ناجائز بات سننے اور ماننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان کے غلام بن جاتے ہیں اور غلاموں کو اپنی مرضی کرنے کی آزادی نہیں ہوتی۔ انہیں بھی نہیں تھی۔ مگر یہ بات وہ آٹھ سالہ بچی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ وہ یہ بات بڑے ہو کر سمجھی تھی اور بہت اچھی طرح۔ اس وقت اسے لگتا تھا کہ وہ اپنی ماں سے نفرت کرتی ہے ممانی سے زیادہ نفرت۔ مگر خونی رشتوں سے نفرت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ وقتی طور پر کبھی کبھی ہمیں ایسا لگتا بھی ہے کہ ہم ان سے نفرت کرتے ہیں مگر حقیقت میں وہ نفرت ہوتی نہیں ہے۔

ماہم کو بھی ان کے مرنے کے بعد پتا چلا کہ وہ ان سے نفرت نہیں کرتی تھی۔ اس کو بس ان سے اختلاف تھا۔ نظریاتی اختلاف۔ جس قناعت پر وہ کاربند رہیں ساری زندگی اور جس کا درس وہ اسے دیتی رہی تھیں ہمیشہ اس سے اسے شدید اختلاف تھا۔

اس کو لگتا تھا کہ اگر اس کی ماں کسی بھی طرح بہت سارا پیسہ کما لیتی تو وہ لوگ یوں ساری زندگی ذلیل نہ ہوتے ان کا اپنا گھر ہوتا۔ اور بہت سارا پیسہ۔ اسے بس ہر مسئلے کا حل پیسہ لگتا تھا۔ اسے بہت سارا پیسہ اور اپنا گھر چاہیے تھا ایک اپنا خوب صورت سا گھر۔ یہی اس کا خواب تھا واحد خواب۔

وہ خواب جو اس نے بہت کمسنی سے دیکھا تھا اور اس خواب سے اسے شدید محبت تھی۔ اس خواب کے علاوہ اس کی زندگی میں اور کچھ تھا بھی نہیں۔

اس نے کبھی کسی سے دوستی بھی نہیں کی تھی۔ اپنے احساس کمتری اور آئے دن چہرے اور جسم کے مختلف حصوں پر پڑے ہوئے نیلوں کی وجہ سے۔ لیکن پھر کالج تک آتے آتے۔ جب اسے احساس ہونا شروع ہوا کہ وہ بہت خوب صورت ہے۔

لڑکیاں تک اسے رک کر دیکھتی تھیں۔

نہیں اتنے سارے لوگ تو غلط نہیں ہو سکتے ناں۔ ممانی جھوٹی ہیں جو اسے بچپن سے بدصورتی اور تاڑ جیسے لمبے قد کے طعنے دے دے کر احساس کمتری میں مبتلا کرتی رہی ہیں۔

اس کو جلد پتا چل گیا کہ اس کے پاس حسن ہے جو کہ اکثر مراعات یافتہ لوگوں کے پاس نہیں ہے۔ اس کے پاس دماغ اور ہنر بھی ہے اور جیسے جیسے اسے اپنی ان صلاحیتوں کا ادراک ہونا شروع ہوا اس کے اندر اعتماد آتا گیا اور اس اعتماد نے اس کی شخصیت کو چار چاند لگا دیے تھے۔

وہ نئے دور کی سنڈریلا تھی۔ خوب صورت، غریب، پراعتماد اور اپنی اس خوب صورتی اور اعتماد کو استعمال کر کے وہ اپنی اس غریبی سے نکلنا چاہتی تھی۔ اور بظاہر اس کے راستے میں کوئی دشواری نہیں تھی سوائے بیلا کے۔ بیلا اس کی واحد دوست تھی۔ اور وہ بیلا سے بے حد محبت کرتی تھی۔ کالج میں آ کر اس کی ملاقات بیلا سے ہوئی تھی۔ اور پھر آڑوؤں نے ان کو جگری دوست بنا دیا تھا۔

ایک ہی محلے میں رہنے کی وجہ سے وہ دونوں ایک ہی روٹ کی بس پکڑتی تھیں ایک روز کالج سے آتے ہوئے راستے میں ماہم کو ایک پھل فروش نظر آیا جو ریڑھی پر آڑو بیچتا ہوا جا رہا تھا خوب صورت تازہ آڑو۔ وہ انہیں لاشعوری طور پر دور تک دیکھتی رہی۔

آڑوؤں سے اس کا رشتہ عجیب سا تھا۔ ان کو دیکھ کر اسے اپنا بچپن یاد آتا تھا۔ اور بچپن کی چوریاں اور ساری محرومیاں بھی۔ بیلا نے اس کی نظریں محسوس کر لی تھیں۔ ماہم کے پاس ان کو خریدنے کے پیسے نہیں تھے وہ اپنی تعلیم کے اخراجات ہی بہت مشکلوں سے لوگوں کے کپڑے سی کر اور کبھی کبھی ماموں اور کزنز سے مانگ مانگ کر پورے کر رہی تھی۔ آڑو خریدنے جیسی عیاشی وہ کبھی بھی افورڈ نہیں

کرسکتی تھی۔ اس کی غربت کی چغلی اس کے یونیفارم سے لے کر اس کی کتابیں اس کے پین سب ہی کھاتے تھے۔

اور پھر بیلا اگلے ہی دن اس کے لیے آڑوؤں سے بھرا ہوا شاپر لے آئی۔ اسمبلی سے پہلے اس نے وہ شاپر ماہم کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟" خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے بیلا سے کہا۔ شاپر کی طرف اس نے ہاتھ نہیں بڑھایا تھا لیکن وہ چونک ضرور گئی تھی۔

"آڑو...... کل بازار گئی تھی امی کے ساتھ سوچ رہی تھی تمہارے لیے کیا لوں۔ یہ اچھے لگے تو لے لیے۔" بیلا نے سادہ سے لہجے میں کہہ کر بات بنائی۔

اور ماہم سمجھ گئی۔ اس کی نظروں میں کل کا وہ آڑوؤں سے بھرا ٹھیلہ اور اس کو دیر تک دیکھتے رہنا گھوم گیا۔

اور پھر اس نے مسکرا کر بیلا کے ہاتھ سے وہ شاپر پکڑ لیا۔ وہ خوش تھی۔ بہت خوش۔ کسی نے زندگی میں پہلی دفعہ بن کہے اس کی بات سمجھی تھی۔ اسے اہمیت دی تھی۔ ماہم کو یہ اہمیت دینا اچھا لگا۔

یہاں سے ان کی دوستی کا آغاز ہوا۔ آڑوؤں کے بھرے ہوئے تھیلے سے اور پھر بیلا اکثر ماہم کے لیے آڑو لانے لگی۔ حالات بیلا کے بھی بہت اچھے نہیں تھے مگر اتنے برے بھی نہیں تھے۔ بیلا اکثر اس کی باتیں بن کہے سمجھ لیتی تھی۔ مگر اب ماہم کا اٹھایا جانے والا ایک غلط قدم ان دونوں کے درمیان حائل ہو گیا تھا۔ بیلا کی اپنی ویلیوز تھیں اور وہ ان پر کسی قسم کا کوئی کمپرومائز کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اپنے سے وابستہ لوگوں سے بھی وہ کچھ اسی قسم کی توقعات رکھتی تھی اور ماہم نے اس کی توقعات کو بری طرح توڑا تھا۔

بیلا ابھی تک ماہم سے منہ موڑے کھڑی تھی اور کمرے کے دروازے پر بیلا کی امی چبھتی ہوئی نظروں سے ماہم کو دیکھ رہی تھیں۔ ان سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں تھا، ماہم کو ان کی نظریں اپنے اندر گڑتی ہوئی محسوس ہوئیں اسے لگا وہ یہاں تھوڑی دیر اور رکی تو پگھل جائے گی یا پھر زمین کے اندر دھنس جائے گی

اس نے ایک نظر بیلا کی پشت کو دیکھا اور اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر باہر نکلنے لگی۔

"رکو ماہم!" ماہم رکی۔

"انہیں لے کر جاؤ۔" بیلا کا اشارہ ان دو بڑے بیگز کی طرف تھا جن میں ماہم بیلا کے لیے آڑو اور کچھ دوسری چیزیں لائی تھی۔ اور اس نے آتے ہی بیلا سے کہا تھا۔

"دیکھو بیلا۔ اب میں بھی جب چاہوں جو چاہوں خرید سکتی ہوں۔ آڑو بھی۔" اس نے آنکھ دبا کر شرارتی انداز میں بیلا سے کہا تھا۔

"مجھے ان سب کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" بیلا نے مڑے بغیر کہا اور آڑو کے بھرے ہوئے تھیلے سے شروع ہونے والی ان کی دوستی کے بھرے ہوئے تھیلے پر ختم ہو گئی تھی۔

ماہم نے مردہ ہاتھوں سے ان بیگز کو پکڑا اور اپنے بھاری قدموں کو گھسیٹتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ بیلا کی امی نے ایک طرف ہٹ کر ماہم کو جانے کا راستہ دیا تھا اور اس کے گھر سے نکلتے ہی اس کی پشت پر گھر کا دروازہ بند کر دیا۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔

"یہ ہے تمہاری وہ دوست جس کی ہنر مندی اور عقل مندی کے تم قصیدے پڑھا کرتی تھیں۔" ماہم کے پیچھے دروازہ بند کرنے کے بعد بیلا کی امی اس کے پاس آئی تھیں۔

وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھی تھی سر اٹھا کے بولی۔

"حالات کی تلخی نے اس کے اندر زہر بھر دیا ہے امی۔"

"زہر بھر دیا ہے تو وہ یہ گل کھلاتی پھرے گی۔ معاشرے کی اور اللہ کی حدود کو توڑے گی۔" وہ اس کے مقابل کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔

"غلطی ہو رہی ہے اس سے امی۔ ہر انسان سے ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی ہنر مند اور عقل مند ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ اس سے کبھی کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔" بیلا نے نظریں جھکا کر نرمی سے کہا۔

"غلطی اور گناہ میں فرق ہوتا ہے بیلا۔"
"اور گناہ بھی انسانوں سے ہی ہوتے ہیں۔"
"اب تم اس کی وکیل بھی بن رہی ہو۔"
"دوست ہوں ناں۔ اور دوست تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

بیلا جو ماہم سے ایک گھنٹے تک لڑتی رہی تھی اور اس کی ایک بھی وضاحت اور دلیل نہیں مان رہی تھی اس کے جانے کے بعد اپنی امی سے اس کا دفاع کرنے لگی اور اس کی امی جو بیلا کو ماہم سے اختلاف کرتے اور لڑتے دیکھتی رہی تھیں سارا وقت۔ اب اکیلے میں بھی چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹی دوسرے کی بیٹی کے اٹھائے جانے والے غلط قدم کی بھرپور مذمت کرے اور بار بار کرے۔ مگر وہ ایک دوست بھی تھی اور وہ بھی ماں تھیں متاثر ہوئے بغیر بولیں۔

"بی بی ہمیں نہ سناؤ اپنی دوستیوں کے یہ ترانے۔ دوستیاں ہم نے بھی کی ہیں۔ اسکول کالج ہم بھی گئے ہیں۔ ہم بھی جہاں جاتے تھے سب ہمارے گرویدہ ہو جاتے تھے مگر ہم نے کبھی کسی دوست کو یوں سر نہیں چڑھایا۔ دیکھ بھال کر دوستیاں کیں۔"

بیلا جو ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے سعادت مندی سے انہیں سن رہی تھی گویا ہوئی۔

"امی، خلیل جبران کہتا ہے کہ۔" "تم اپنے بچوں کو اپنی محبت تو دے سکتے ہو مگر اپنے خیالات نہیں۔ ان کے پاس ان کے اپنے خیالات ہوتے ہیں۔ کیونکہ زندگی پیچھے کی طرف نہیں جا سکتی نہ ہی گزرے ہوئے کل میں رک سکتی ہے۔" اس نے ڈرتے ڈرتے خلیل جبران کو ایڈٹ کر کے انہیں سنایا اور دانت نکال کر جھٹ سے باتھ روم میں گھس گئی۔

☆☆☆

چار دن ہو گئے تھے اس بارش کو اور چار دن سے ہی ان کی بجلی غائب تھی اور پھر اس شام جب گلی میں سب کی بجلی بحال ہو گئی تو صرف ان کی اور دو چار اور گھروں کا وولٹیج کم تھا۔ اور ایک طرف کی دیوار پر کرنٹ آنے لگا تھا دیوار پر بارش کی وجہ سے بیلا نے مین سوئچ آف کر دیا تھا۔

چار دن سے بغیر بجلی کے رہتے ہوئے کرائے دار سمیت وہ لوگ خود بھی عاجز آ چکے تھے۔ فون ڈیڈ تھے۔ فریج میں رکھا سامان خراب ہو چکا تھا۔ پانی کب کا ختم ہو چکا تھا۔ کئی بار کمپلین کی جا چکی تھیں مگر کوئی پرسان حال نہ تھا۔ کرائے دار جن کے اپنے گھر میں کوئی مرد نہیں تھا سوائے ایک بزرگ کے ساری خواتین تھیں۔

انیسہ بیگم نے اپنی جوان بچی کی وجہ سے اسی شرط پر گھر کرائے پر دیا تھا کہ ان کی فیملی میں کوئی جوان لڑکا نہیں ہوگا۔ پھر جب ان کے کرائے داروں کی آنٹی اور بزرگ انکل انیسہ بیگم کو نیچے بلا کر بجلی کی عدم موجودگی کے سبب ہونے والی پریشانیوں اور سائیڈ وال پر آنے والے کرنٹ کے دکھڑے رو رہے تھے اور انیسہ بیگم ان کو سمجھانے کی ناکام کوششوں میں مصروف تھیں تب ہارون آ گیا۔ عین موقع پر ہیرو والی انٹری۔ اس کا وہاں آنا بنتا تو نہیں تھا مگر دوپہر سے اس کا دل اتنی شدتوں سے چاہ رہا تھا وہاں آنے کا کہ وہ اپنی گاڑی لے کر نکل کھڑا ہوا تھا مگر آنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا اور دو گھنٹے بے مقصد سڑکوں پر گاڑی گھماتے رہنے کے بعد بالآخر وہ آ ہی گیا تھا ڈرتا ہوا۔ دل میں سو بہانے تراشتا ہوا۔

اس نے ان کے دروازے کو کھلا ہوا پایا۔ چھوٹے سے صحن میں بالکل سامنے ہی کرائے داروں کے انکل آنٹی اور انیسہ بیگم کھڑے بحث و مباحثے میں مشغول تھے۔ اس نے کھلے دروازے پر دستک دی۔ ایک بار دوسری بار اور تیسری بار ذرا زور سے دستک دینے پر وہ تینوں چپ ہو کر دروازے کے باہر کھڑے نو وارد کو دیکھنے لگے۔

انیسہ بیگم پریشان نگاہوں سے اور باقی دو سوالیہ نگاہوں سے۔ اس نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور کچھ ہچکچاتے ہوئے ان سے مسئلہ ازراہ تکلف دریافت کیا۔

انیسہ بیگم کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اسے بتائیں یا

نہیں ۔ انہیں اس کا وہاں آنا معیوب لگتا تھا مگر وہ دونوں ہی ان کے منہ کھولنے سے بھی پہلے اسے اپنی پریشانی کا بتانے لگے تھے۔ وہ لب بھینچے ان تینوں کو دیکھنے لگیں اور پھر انہوں نے دیکھا۔ ہارون بڑے اطمینان سے انکل کے کندھے پر ہاتھ رکھے ان سے تسلی دینے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"مجھے دیکھنے دیں ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔"

اس کے ایک دوست کا بڑا بھائی "کے۔ الیکٹرک۔" میں بڑا آفیسر تھا۔ اس نے سب سے پہلے اسے کال کی۔ اور اسے اس جگہ کا بتا کر اس گلی کا جو دوسرا فیڈر بند پڑا تھا جس کی وجہ سے وولٹیج کم تھا۔ اسے کسی بھی طرح جلد از جلد فکس کرنے کا کہا۔ پھر جب وہ پینتیس منٹ بعد ہلکی پڑنے والی پھوار میں بھیگا ہوا ان کے پاس اوپر آیا تو ان کے دونوں مسئلے حل ہو چکے تھے۔ وہ گیلے ٹشو سے اپنے گندے ہاتھ صاف کر رہا تھا، گھنگھریالے گیلے بال اس کے ماتھے پر چپکے ہوئے تھے۔

بیلا جو چھوٹے سے صحن میں ٹہلتے ہوئے خفگی اور کوفت سے اپنی ماں سے کہہ رہی تھی کہ۔

"امی...... بھگا دیتیں ناں اس کو۔ چار باتیں سناتیں۔ امی اس سے پہلے بھی ہم نے اس طرح کتنی ہی چویشنز کو اکیلے ہی فیس کیا ہے ناں...... اب یہ کیا اوپر سے فرشتہ بن کے ٹپک گیا ہے۔ وہ بھی ہماری مرضی کے خلاف۔"

وہ کہتے کہتے مڑی تو وہ بالکل سامنے کھڑا تھا۔ غروب ہوتے سورج کی نارنجی شعاعیں سرمئی اندھیرے میں ٹھیک اس کے گیلے چہرے پر پڑ رہی تھیں جس سے اتنا بڑا معرکہ سر کرنے کی خوشی لمحوں میں غائب ہوئی تھی۔

"فکس ہو گیا آنٹی! آپ کا مسئلہ۔ آپ کے نیبر نے کنڈا ڈالا ہوا تھا ان کا کیبل ٹچ ہو رہا تھا آپ کی سائیڈ وال پر اور گیلی ہونے کی وجہ سے کرنٹ پھیل رہا تھا۔" اس نے انیسہ بیگم کو دیکھ کر کہا۔

"وہ بات سننے پر آمادہ ہی نہیں ہو رہے تھے۔ انہیں کنوینس کرنے میں ٹائم لگ گیا۔ ورنہ تو منٹوں کا کام تھا یہ۔ اور ڈم وولٹیج کا مسئلہ بھی سولو ہو گیا ہے اب میں چلتا ہوں۔"

وہ کچھ خجل سا ہو کر بولا۔ بیلا کے لفظوں کا ری ایکشن حدت بن کر اس کے چہرے پر پھیل رہا تھا۔ وہ ایک ٹک اس کو دیکھے گئی۔ انیسہ بیگم اسے روکنے لگیں مگر وہ نہیں رکا۔

واپسی میں ہارون ڈرائیونگ کرتا ہوا بار بار سر جھٹک کر ایک ہلکی سی شرمندگی کو زائل کرنے کی کوشش کرتا رہا جو اسے گھیرے میں لیے ہوئے تھی اور ایک ہلکا سا افسوس جو بیلا پر سوار ہو رہا تھا رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

"آپ ہمارے اسکول میں آ جائیں ناں۔ پلیز میتھس کی ٹیچر مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔"

ایلان نے اپنی بکس اور کاپیز سمیٹتے ہوئے ناک چڑھا کر کہا تھا۔ بیلا احد کا سامان سمیٹ رہی تھی وہ ان کو پڑھا چکی تھی۔ تبھی ہارون آ گیا۔

"ایلان تمہاری فیورٹ چاکلیٹس۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی چاکلیٹس لہرائیں۔

اس نے چاکلیٹس ان کو دیں، دونوں خوشی سے اچھلنے لگے۔

بیلا ہارون کو دیکھنے لگی پتا نہیں کیوں۔ اگرچہ وہ چند دن پہلے والا ملال جو اس پر سوار تھا۔ کب کا زائل ہو چکا تھا، احد اور ایلان اچھلتے کودتے چاکلیٹس کھاتے بیگ جھلاتے اندر بھاگ گئے۔ اب لان میں وہ دونوں بیٹھے رہ گئے۔ آمنے سامنے بیلا کو آج اپنی فیس لینی تھی تب ہی وہ بیٹھی تھی اور وہ اپنے موبائل میں بظاہر مصروف اسکرولنگ کر رہا تھا۔

"کیسی ہو مریڈا؟" اس نے اچانک ہی موبائل سے نظریں ہٹا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

"میرا نام بیلا ہے۔" اس نے اپنی نظریں اس پر سے ہٹائی تھیں۔

''رئیلی۔ تبھی تو مریڈا تو بریوتھی ناں۔'' اس نے اس کے چہرے پر نظریں جما کر کہا تھا۔

اور بیلا کی ہارٹ بیٹ مس ہوئی تھی۔ وہ منہ موڑ کر مخالف سمت دیکھنے لگی۔

اور پھر تب ہی مسز شمیم آرا اپنی چھوٹی بہن کے ہمراہ لان میں آئی تھیں۔ بیلا کو فیس دیتے اور ان دونوں کو ساتھ بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک کر ایک لمحے کو رکیں۔ سب تو ویسے بھی سمجھ چکے تھے اس کا کئی مہینوں سے بیلا کی موجودگی میں آنا۔ اور انہوں نے اپنی بہن سے کہا۔

''ایک تو یہ چھوٹے گھروں کی لڑکیاں بڑے گھروں میں آنے کا ان کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے۔ یہاں کے مردوں کو پھانسنا۔ بس......''

آواز آہستہ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی تھی جو ان کو سنائی نہ دیتی۔ بیلا کا رنگ یکدم سرخ پڑا تھا۔ جیسے کسی نے اس کے منہ پر کھینچ کر تھپڑ مارا ہو۔ وہ بے اختیار کھڑی ہوئی تھی۔ ہارون نے پہلے اپنی بھابھی اور ان کی بہن کو دیکھا پھر بیلا کا ہتک سے سرخ ہوتا چہرہ۔ وہ بھی ایک دم کھڑا ہوا۔ بے اختیار ہی اس نے اپنا ہاتھ منہ پر رکھا تھا۔ اس کو لگا یہ بے عزتی بیلا کی نہیں اس کی کی گئی ہے۔ وہ اس کے لیے بہت معنی رکھتی تھی۔ بیلا نے ہارون کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ اور......

''کیا چل رہا ہے؟'' شمیم آرا نے قریب آ کر ذو معنی انداز میں مسکرا کر کہا۔

''بھابھی! وہ نہیں چل رہا جو آپ سوچ رہی ہیں۔ پھانس یہ مجھے نہیں رہیں۔ میں انہیں پھانسنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پچھلے کئی مہینوں سے مگر مجھے ناکامی ہوئی ہے۔ پھنس ہی نہیں رہی ہیں۔''

ہارون نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آں ہاں کیا ایسا ہے؟''

انہوں نے طنزیہ انداز میں کہہ کر مضحکہ خیزی سے بیلا کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ لگ تو نہیں رہا۔

''بائی دا وے آپ کو اپنے ہسبینڈ پر توجہ دینی چاہیے۔ سنا ہے آج کل کسی پری وش کے چکروں میں پڑے ہیں۔''

اس نے مسکرا کر بے حد اعتماد سے شمیم آرا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا ان کا رنگ فق ہو گیا۔ بیلا کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی اس کے لیے ہارون نے ہی اتنا کچھ کہہ دیا تھا اور اچھا ہی کیا تھا۔ کیونکہ اس وقت وہ کچھ بھی کہنے کی حالت میں تھی ہی نہیں۔

☆☆☆

تھے بہت بے درد لمحے ختم دردِ عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد

اور اس حسین اپارٹمنٹ میں شروع کی گئی ماہم کے خوابوں کی فیری ٹیلز جیسی دنیا کی عمر صرف ڈھائی ماہ تھی۔ ڈھائی ماہ تک سب بہت اچھا رہا اور پھر علی کے اس کے پاس لگائے گئے چکروں میں وقفہ آنے لگا۔ شروع شروع میں مختصر اور پھر طویل۔ اور پھر اس کا فون بزی رہنے لگا۔

وہ اس کے آفس گئی تو پتا چلا کہ وہ ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔ ماہم شاکڈ رہ گئی۔ اسے بتائے بغیر۔ وہ کب آئے گا۔ کس سلسلے میں گیا ہے۔ کس ملک گیا ہے۔ کوئی اسے کچھ نہیں بتا رہا تھا۔ وہ واپس آ گئی۔ فون۔ ای میلز سوشل میڈیا۔ کسی پر بھی علی نے اس کو جواب نہیں دیا۔ اس نے اس کے بعد اس کے آفس کے کئی چکر لگائے وہاں پر اس کا بھائی ہوتا تھا وہ نہیں۔ اور پھر اس کو اندر جانے سے روکا جانے لگا۔ گھر کا راشن ختم ہونے لگا تھا۔ اس نے اپنی سیونگز نکالنی شروع کر دیں۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اسے یہ تک نہیں پتا تھا کہ علی کا گھر کہاں ہے۔

وہ ساتویں آسمان سے منہ کے بل پاتال میں آ گری تھی۔ ممانی کا گھر وہ چھوڑ چکی تھی۔ بیلا نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ اور علی۔ وہ کہیں تھا ہی نہیں۔ وہ پیدل بے مقصد سڑکوں پر گھومتی رہتی۔ کیونکہ اس کے پاس گاڑی نہیں تھی۔ یا پھر اپارٹمنٹ میں بیڈ پر

چت لیٹی کئی کئی گھنٹوں تک چھت کو گھورتی رہتی۔ اس کو آگے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ جیسے وہ ایک بند گلی میں کھڑی ہو۔

اس کو لگ رہا تھا کہ وہ اس پوری دنیا میں اکیلی ہے اور تب اس کو پتا چلا کہ وہ اکیلی نہیں تھی۔ امید سے تھی۔ وہ ایک دم جیسے ہڑبڑا کر ہوش میں آئی تھی۔ علی کے ایک بزنس نمبر پر جس کو آن رکھنا اس کی مجبوری تھی اس نے کئی گھنٹوں تک مسلسل میسجز اور کالز کیں، منتیں، واسطے بس ایک دفعہ بات سن لینے کی التجائیں۔

اور پھر اس نے کال ریسیو کر لی۔ کچھ دیر تو ماہم کچھ بول ہی نہیں سکی۔ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آیا وہ بولے کیا۔ غصہ۔ دکھ۔ جذبات سب اس قدر زیادہ تھا کہ آنسو اس کے حلق میں اٹکنے لگے۔

''علی! تم کہاں ہو؟'' اس نے بالآخر بھرائی ہوئی آواز میں کہا تو اس کی آواز میں ٹوٹی امیدوں کی کرچیاں اور آسمان سے زمین پر گرنے کی تھکن تھی۔

جواباً علی نے ایک گہرا سانس لیا جیسے اب اس کے سوالوں کا جواب دینے کے لیے تیار ہو۔

''ماہم میں وہاں نہیں ہوں۔ ملک سے باہر ہوں اور شاید اگلے سال تک نہ آسکوں پاکستان۔ میں نے اپنا بزنس یہاں شفٹ کرنے کا فیصلہ کیا......''

''تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو علی۔''

ایک گھسا پٹا جملہ ماہم کے لبوں سے نکلا۔

''دیکھو ماہم، سچ تو یہ ہے کہ میں اب اس قصہ کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔'' علی نے اکتائے ہوئے لہجے میں دوٹوک کہنا چاہا مگر ماہم نے دوبارہ اس کی بات کاٹ دی۔

''علی......! میں پریگنینٹ ہوں۔''

''واٹ دا...... تم لڑکیوں کے پاس بس یہی ایک ڈرامہ ہوتا ہے۔''

''علی! پلیز پلیز ایسا مت کرو۔ تم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو۔''

ماہم کے لہجے میں اس قدر بے چارگی اور التجا تھی کہ بس اسے علی کے پیر پکڑنا ہی رہ گیا تھا۔ اگر وہ سامنے ہوتا تو وہ شاید اب تک پکڑ بھی چکی ہوتی۔

''میں...... تم...... تم جو تم کہو گے میں وہ کروں گی مگر تم......''

''تو پھر جاؤ اور اس مصیبت سے جان چھڑاؤ پاگل عورت۔ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ یہ سب مت کرنا تم مگر تمہاری چھوٹی سی کھوپڑی میں کوئی بات نہیں گھستی۔''

اور ماہم کا سانس رکنے لگا تھا اسے لگا کسی نے اسے کسی اونچے پہاڑ سے دھکا دیا ہے اور وہ نیچے لڑھک رہی ہے۔ ایک دم سے اس کا خون ابلنے لگا تھا۔

''تم...... تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے علی۔ میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔ میں...... میں تمہیں پوری دنیا کے سامنے ایکسپوز......'' اس کی اس دھمکی کے برعکس اس کا لہجہ اتنا کمزور اور ٹوٹا ہوا تھا کہ علی بے اختیار ہنسا۔ تمسخرانہ ہنسی۔

''اوہ! شٹ اپ!'' علی نے اس کو ایک موٹی سی گالی دی۔

''تم جیسی عورتوں سے ڈیل کرنا مجھے اچھی طرح آتا ہے۔ اور جاؤ جو کرنا ہے کرو۔ ثبوت کیا ہے تمہارے پاس؟''

اس نے حقارت سے کہا تھا۔ علی کا اپنے لیے حقارت میں ڈوبا لہجہ اور گالی سن کر ماہم گنگ رہ گئی تھی۔ اس سے مزید کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ جس کے لیے سب کچھ چھوڑا تھا۔ ممانی کا گھر۔ واحد دوست اور اپنے خواب اس نے اسے کس قدر آسانی سے اور کس قدر جلدی چھوڑ دیا تھا۔

''آئندہ مجھے کال کی یا میرے آفس کے پاس بھی نظر آئیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ جانتی ہو تم مجھے ناں۔ میں کیسا بندہ ہوں۔''

اس نے اسے ایک اور گالی دے کر فون بند کر دیا۔ ماہم سکتے کے عالم میں بیٹھی رہ گئی۔ اور پھر علی نے اس کو اپنے اس نمبر سے بھی بلاک کر دیا۔ ماہم اب اس کو فون کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس کے لیے اتنی

تذلیل کافی تھی۔اس کو یاد آیا۔ جب شروع میں ماہم اس کے آفس میں کام کرتی تھی اور علی اور اس کے درمیان ابھی تکلف کی دیوار قائم تھی تب اس کے ایک سینئر کولیگ نے اس سے فری ہونا شروع کر دیا تھا۔ اس کے آفس کے چکر لگانا۔ اس سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈنا اور پھر ایک دن اس نے ماہم کو گھر ڈراپ کرنے کی آفر کر دی۔ ماہم نے منع کر دیا۔ وہ اصرار کرنے لگا۔ اسی وقت علی بھی اتفاق سے اپنی کار لے کر نکل رہا تھا۔ پارکنگ میں اس نے یہ منظر اپنی کار سے رک کر دیکھا تھا۔

پھر اگلے دن ہی علی نے اپنے آفس میں ماہم کے سامنے اس بندے کو بلا کر کل کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ وہ بوکھلا گیا تھا اور کوئی ڈھنگ کی وضاحت نہیں دے سکا تھا۔ اور پھر علی نے اس کو آفس سے نکال دیا۔ ماہم کے لیے اتنی سی بات پر ایک سینئر اسٹاف ممبر کو نکال دینا حیران کن تھا۔ ماہم کے حیرت کے اظہار پر علی نے کہا تھا۔

''میں نے اسے صرف فائر کیا ہے شکر کرو۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا۔ اگر آئندہ تمہیں کوئی ہراساں کرے ناں تو تم مجھے بتاؤ گی۔ پھر میں دیکھ لوں گا سب کو۔''

علی نے جس انداز میں کہا تھا۔ ماہم کچھ بول نہیں سکی یہ بھی نہیں کہ حمزہ کا اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرنا ہراسمنٹ تھا تو علی کا اس سے غیر ضروری اور ذاتی باتیں کرنا اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنا کیا تھا۔ اور یہ بھی نہیں کہ اگر حمزہ کو اسے لفٹ کی آفر کرنے کا حق نہیں تھا تو علی کو بھی نہیں تھا مگر اگلی ہی شام وہ اطمینان سے علی کی گاڑی میں بیٹھ گئی اور علی نے اسے کافی پلا کر اس کے گھر سے ذرا دور مین روڈ پر ڈراپ کر دیا۔

علی ایک شاطر انسان تھا وہ ماہم کے بیک گراؤنڈ سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ اسے پتا تھا ماہم کو کیسے قابو کرنا ہے۔ وہ اسے بڑے ہوٹلوں میں کھانا کھلاتا اور بڑے بڑے شاپنگ مالز میں لے کر گھنٹوں گھوماتا رہتا۔ ایسے مالز جو اس نے خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے اس پر پیسے اڑاتا تھا۔

شہر کے تمام ہوٹلز، مالز نمائشوں پر ڈیٹس کر کے وہ اپنے اس ریلیشن شپ کو دوستی کا نام دیتا تھا۔ اصل خرابی وہاں سے شروع ہوئی جب ماہم نے علی کو ''واقعی دوست'' سمجھ کر اس کے سامنے اپنے دکھ رونے شروع کیے۔ اپنی محرومیاں اپنی حسرتیں اپنی ذات کے خلا۔ اتنا کچھ کہ اب اس کے پاس بتانے کو کچھ باقی نہ بچا۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا کہ اسے زندگی میں اس سے پہلے کوئی ہمدرد میسر نہیں آیا تھا۔

اپنے سارے دکھ اور بیلا کے کندھے پر سر رکھ کر ـــــ رو چکی تھی اور بیلا بہت اچھی سامع۔ غم گسار اور دوست بھی تھی۔ مگر شاید یہ انسان کی فطرت ہے اسے مخالف جنس چاہیے ہی ہوتی ہے۔ ہر وقت ہر روپ میں۔ خاص کر تب جب آپ کے پاس باپ، بھائی اماں اور بہن جیسے خوب صورت، پاکیزہ اور مخلص رشتے نہ ہوں۔ یا نہ ہونے کے برابر ہوں۔۔ رسم و رواج اور تکلفات میں جکڑے ہوں اور ایسا ہی ماہم کے ساتھ ہوا تھا۔

ایک انتہائی خوب صورت، نازک لڑکی آپ کے سامنے بیٹھ کر اس طرح اپنی اذیتوں کے قصے روتے ہوئے سنائے تو اور آپ کیا کر سکتے ہیں؟ وہی جو اس وقت علی نے کیا۔ ہمدردی۔

وہ اس کا ہمدرد بن گیا۔ اور پھر ہمدردی نے محبت کو جنم دیا۔ اور اس دور کی اکثر نام نہاد محبتیں ہمدردی سے ہی شروع ہوتی ہیں مگر۔ ہمدردی کی وجہ سے چڑھنے والا محبت کا یہ بخار بہت جلد اتر بھی جاتا ہے۔ اصل سکندر تو وہی ہوتے ہیں جو اپنی پریشانی اور غم کی فریاد اللہ ہی سے کرتے ہیں۔ کیونکہ آپ لوگوں کو اپنے غم نہیں سناتے۔ اپنی عزت نفس گروی رکھواتے ہیں اور جب آپ کی عزت ایک دفعہ کسی کے ہاتھوں میں چلی جائے تو وہ اسے رسوا ضرور کرتا ہے۔

یہی کچھ علی نے کیا تھا اور کچھ نیا تو نہیں کیا تھا۔

اور اس نے ایک اور پرانا کام بھی کیا تھا۔ ماہم کو بدلے میں اپنی مجبوریوں کے جھوٹے قصے وضاحتوں سے سنائے تھے۔

''میری شادی ایک ایک ڈراؤنا خواب تھی۔ میری بیوی سے میری ایک لمحے بھی کبھی نہیں بنی۔ وہ ایک پرانی سوچ کی زبان دراز عورت ہے۔ اور حادثاتی طور پر ہمارے دو بچے ہو گئے۔ پتا نہیں کس طرح۔ میری بیوی نے میرے بچے بھی مجھ سے دور کر دیے ہیں۔

میں بھی بالکل اکیلا ہوں اندر سے۔ وغیرہ وغیرہ۔''

اور ماہم نے بڑے آرام سے آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کر لیا تھا نا صرف اس پہ بلکہ اکثر بے وقوف لڑکیوں کی طرح اسے یہ بھی لگتا تھا کہ علی کے اس کی تعریفوں میں بولے جانے والے تمام ڈائیلاگز سچے ہیں۔ اس کے ساتھ گزارا وقت۔ اس پر لٹایا جانے والا پیسہ۔ فیملی دوستوں اور کام پر اس کو دی جانے والی ترجیح سب محبت کی وجہ سے ہے۔

محبت؟ محبت تو اسے ماہم سے تھی ہی نہیں۔ اور اگر تھی بھی تو اس اس کی محبت ماہم کو پا لینے تک تھی اور بس۔

اشفاق احمد نے لکھا ہے ''مرد دریافت کا پرندہ ہے۔'' اس نے بھی ماہم کو دریافت کیا تھا اور اڑ گیا تھا اور خود کو دریافت کیے جانے میں اس نے خود علی کو بہت سپورٹ کیا تھا۔ علی کے لیے یہ دریافت کا پروسیس بہت آسان اور تیز کر دیا تھا صرف ڈھائی ماہ۔ ان ڈھائی ماہ میں وہ شمع کی طرح پگھلتی گئی اور پگھل کر اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی اسے روند کر آگے بڑھ گیا تھا اب ماہم۔ پامال۔ تہی دامن اسے خود کو سمیٹنا تھا۔ پھر سے کھڑا ہونا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ ایک دن لگا تھا اسے خود کو دوبارہ سے مجتمع کرنے میں پورے چوبیس۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ جو بھی تھا وہ بھی ہار نہیں مانے گی حالات کے سامنے اپنی ماں کی طرح۔

اور پھر وہ اباڑشن کے لیے ایک پرائیویٹ کلینک گئی تھی۔ کوئی اس کے اندر سے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ ایسا مت کرو۔ جو بھی تھا وہ قتل جیسا گناہ کم از کم نہیں کر سکتی تھی...... اور وہ ایک دفعہ پھر اپنے وجود کو گھسیٹتی ہوئی واپس آ گئی اس نے اس بچے کو جنم دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے اپنے اکاؤنٹ میں موجود رقم معلوم کی۔ کچھ اس کی سیلری کی سے بچ جانے والی رقم۔ اور کچھ وہ جو بھی کبھار علی نے اس کو دی تھی۔ سب ملا کر بھی بہت زیادہ رقم نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ایک گولڈ کا نیکلس جو اس کو علی نے پہنایا تھا۔ اور اس کی ماں کی بالیاں جو وہ آتے ہوئے اپنے ساتھ لے آئی تھی بس یہی اس کی کل جمع پونجی تھی۔ اس نے دونوں بیچ دیئے اور وہ رقم بھی اکاؤنٹ میں ڈال دی۔ اپارٹمنٹ ایک اچھے علاقے میں تھا وہاں کسی کو کسی سے کوئی زیادہ سروکار نہیں ہوتا تھا لہٰذا وہ محتاط طریقے سے وہاں رہتی گئی۔ اور مستقبل کے بارے میں پلاننگ کرتی رہی۔

☆☆☆

تنہائی نے اسے ہی پاگل کر رکھا تھا۔ اس کی زندگی میں کوئی تھا ہی نہیں جس کی طرف دھیان جاتا۔ یوں بھی محبت اور عزت نفس دونوں ایک جگہ مشکل سے ہی جمع ہوتی ہیں۔ عزت نفس پہلے ہی گنوا چکی تھی اور جو اس کی حالت تھی۔ اسے محبت کی ضرورت تھی۔

اس نے نماز پڑھنی شروع کر دی اور اس کی نماز کا واحد مقصد یہی ہوتا تھا کہ وہ دعا کر سکے کہ اللہ علی کا دل اس کی طرف پھیر دے۔ وہ اس کی زندگی میں واپس آ جائے اور اس کی زندگی میں سب سیٹ ہو جائے۔

کچھ عرصہ ایسے ہی گزرا پھر ایک دن اس کا اپارٹمنٹ خالی کرنے کا نوٹس مل گیا وہ اپارٹمنٹ کرائے کا تھا۔ وہ خالی دماغ سے اس نوٹس کو بہت دیر تک دیکھتی رہی۔ اسے لگا تھا وہ جو نماز پڑھنے لگی ہے

اور دعائیں کرتی ہے تو اللہ اس کی دعا جیسے وہ چاہتی ہے بالکل ویسے ہی قبول کر لے گا اور ایک دن وہ دروازہ کھولے گی اور علی اس کے سامنے کھڑا ہوگا اس سے معافی مانگے گا اور سب ٹھیک ہو جائے گا مگر وہ غلط تھی۔ بہت غلط، زندگی میں اللہ نے اس کے لیے کچھ اچھا رکھا ہی نہیں تھا۔ سوائے ٹھوکروں اور اندھیروں کے۔ اس کے ذہن میں اس وقت منفی خیالات آ رہے تھے۔ اپارٹمنٹ کا ایڈوانس کرایہ اسی مہینے تک کا تھا جس کی ابھی پہلی تاریخ تھی۔ اس کے پاس پورا ایک مہینہ تھا اور اس کی ڈلیوری میں چار مہینے باقی تھے۔

وہ ایک بار پھر بند گلی میں آ کر کھڑی ہو گئی ہے اور وہاں سے نکلنے کا کوئی بھی راستہ نہیں ہے۔ وہ اس حالت میں کہاں جاتی۔ ممانی کے پاس جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اور خالائیں استغفر اللہ۔

جن خالاؤں نے اسے ماں کی زندگی میں نہ ان کے مرنے کے بعد کبھی پلٹ کر پوچھا تھا وہ اسے اس حالت میں کیسے رکھ لیتیں۔ وہ بھی تب جب کہ ممانی نے اس کے کسی اور کے ساتھ گھر سے بھاگ جانے کے قصے مرچ مسالہ لگا لگا کر سارے محلے اور خاندان والوں کو سنا رکھے تھے۔ اور وہ دونوں تو پہلے ہی اسے زبان دراز اور شاطر گردانتی تھیں۔

بہت سارے دن اس نے کبوتر کی طرح منہ چھپا کر گزار دیئے اور جب صرف چند دن رہ گئے مہینہ ختم ہونے میں تب وہ اٹھی اور بوجھل دل اور کسی بھی مستحکم ارادے کے بغیر ایک بڑی سی چادر میں خود کو چھپا کر باہر نکلی۔

وہ بالکل تہی داماں تھی اور اپنی اس غربت اور تنہائی پر وہ روتی رہی اور سڑک کنارے چلتی رہی اور جب آنسوؤں کی چادر اس کی آنکھوں کے آگے مکمل تن گئی اور اسے دو قدم آگے دیکھنا بھی بند ہو گیا اور بھوک اور گرمی سے اس کا برا حال ہو گیا اور اس کے اندر مزید چلنے کی سکت ختم ہو گئی تو وہ سڑک کنارے لگی ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔

شہر کی بھیڑ میں کسی نے ایک بڑی سی چادر میں لپٹی منہ چھپا کے روتی ہوئی عورت پر غور تک نہیں کیا اور اگر کیا بھی تو درماں کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ سب کو اپنی اپنی پریشانیاں تھیں۔ وہ جب خوب رو چکی تو منہ صاف کر کے اٹھی۔ اس کی کمر میں درد کی تیز لہر اٹھ رہی تھی۔

اس نے قریب سے گزرتا ایک رکشہ روکا اور اس میں بیٹھ گئی۔ جانتی اب بھی نہیں تھی کہ جانا کہاں ہے۔ ڈرائیور کو بس آگے چلنے کا کہا اور خود سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر خالی نظروں سے باہر دیکھتی رہی۔ باہر اکتوبر کی تیز، چمکتی ہوئی دھوپ برس رہی تھی مگر اس کو سارے منظر دھندلے نظر آ رہے تھے۔

ڈرائیور ہر تھوڑی دیر بعد رکشہ کی رفتار ذرا دھیمی کر کے اس سے پوچھتا کہ آپ نے جانا کہاں ہے۔ وہ کہتی آگے۔ ذرا آگے۔ کافی آگے پہنچ کر ڈرائیور نے آخر کار رکشہ ایک طرف روک ہی لیا۔

''او بی بی۔ جانا کدھر ہے آپ کو؟؟'' اس نے پان کی پیک سڑک کے کنارے تھوک کر اس کی طرف مڑ کر کہا۔

''مجھے ...... دراصل مجھے ایک گھر چاہیے۔ کرائے پر...... چھوٹا، چھوٹا سا۔'' الفاظ جیسے خود بخود اس کے لبوں سے نکلے تھے۔ مگر ٹوٹ ٹوٹ کر۔

''تو گھر یوں سڑکوں پر تھوڑی ناں ملے گا۔'' وہ سر جھٹک کر بولا اور دوبارہ رکشہ اسٹارٹ کیا۔ ماہم کو ایک دم اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اس طرح ایک رکشہ ڈرائیور سے سڑک پر گھر کی بات کرنا۔ اس کی پوزیشن کتنی آکورڈ ہو گئی تھی وہ شرمندگی سے لب کاٹنے لگی۔

''کس علاقے میں چاہیے گھر آپ کو؟'' اس نے مڑ کر عجیب سی نظروں سے ماہم کو دیکھا تھا پھر چلا کر کہا۔

''کسی عام سے چھوٹے ...... میرا مطلب ہے کسی متوسط علاقے میں۔'' اس کو بات کرنے میں بہت دشواری پیش آ رہی تھی اس کو لگا وہ بات کرنا

بھول گئی ہے۔

"ٹھیک ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چلو۔ ہم آپ کو دکھادوں گا۔ دو ایک گھر ہیں ہمارے علاقے میں ادھر۔ جدھر ہم رہتا ہے ناں......ادھر۔"

ڈرائیور نے اسے شیشے میں دیکھتے ہوئے علاقے کا نام بتایا جو ماہم کے پرانے محلے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ڈرائیور مسلسل ماہم کو شیشے میں دیکھے چلا جا رہا تھا۔ اپنی چادر سے تقریباً اپنا پورا منہ چھپالیا تھا۔

بیلا کے پاس جانے کا اس نے بہت بار سوچا تھا مگر ہر بار اس کو ان کی آخری ملاقات یاد آجاتی تھی۔ بیلا کا رویہ اور خاص طور پر اس کی امی کی چبھتی ہوئی نظریں۔

راستے میں رک کر اس نے چار سمز خریدی تھیں کیونکہ اس کو اب بھی یہی لگتا تھا کہ اس کی زندگی میں اگر کوئی دوبارہ روشنی لاسکتا ہے تو وہ صرف علی ہی ہے۔

تب ہی ماہم نے اسے نئے نمبرز سے فون کرنے کا سوچا تھا۔ ایک دن ایک نئے نمبر سے اس نے آواز سنتے ہی فون بند کر دیا۔ اگلے دن دوسرے نمبر سے اسے میسجز کیے وہ بھی بلاک ہوگیا۔ اور رات کو تیسرے نمبر سے فون کیا۔ اس بار علی نے اس کی آواز سنتے ہی اسے اتنا سنایا۔ اسے وہ گالیاں دیں کہ اس کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا اور اس کے ہاتھ سے فون چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ وہ نشے میں تھا مگر ماہم جانتی تھی کہ وہ نشے کی حالت میں بھی اپنے حواسوں میں ہوتا تھا ماہم اس رات سو نہیں سکی تھی چوتھی سم یونہی بند پڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

آج اکتیس تاریخ تھی اور اس نے یہ اپارٹمنٹ چھوڑنا تھا۔ وہ اٹھ کر مردہ ہاتھوں سے پیکنگ کرنے لگی۔ ایک بیگ جو وہ اپنے ساتھ لائی تھی یہاں جس میں اس کے کپڑے سرٹیفکیٹس اور کچھ دوسرا سامان تھا وہی ساتھ لے کر جا رہی تھی۔ رکشہ ڈرائیور کے بتائے ہوئے محلے میں اس نے مناسب کرائے پر ایک کمرے کا گھر لے لیا تھا۔

گھر کافی بری حالت میں تھا مگر محفوظ بنا ہوا تھا۔ بالکل بند۔ لوہے کے مضبوط دروازے۔ اور یہی چیز ماہم نے دیکھی تھی باقی اور کوئی نخرے کر نا وہ افورڈ نہیں کر سکتی تھی کسی بھی طرح کے رضوان کا گھر بھی اسی گلی میں تھا کچھ گھر چھوڑ کر۔

رضوان ایک کم پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ وہ اکثر پان کھاتا تھا جس کے باعث اس کے دانت خوفناک حد تک خراب ہو چکے تھے۔

بچپن میں وہ یقیناً ایک خوب صورت بچہ رہا ہوگا مگر اب اس کے چہرے پر مہاسوں کے گڑھے اور سنجیدگی کے ڈیرے تھے اور بڑی بڑی آنکھوں سے افسردگی ٹپکتی تھی۔ وہ گھسی ہوئی جینز پر ٹی شرٹ یا ڈھیلی سی لنڈے کی ہڈی پہنے ہوتا تھا۔

اس نے خلاف توقع کوئی ایسی ویسی حرکت بھی نہیں کی تھی بلکہ سارے معاملات طے کرنے میں اسی نے اس کی مدد کی تھی۔ پھر بینک سے ایڈوانس وغیرہ نکالنے اور بازار سے کچھ ضرورت کی چیزیں اور فرنیچر کے نام پر ایک چارپائی ایک کرسی اور اسی طرح کی چھوٹی موٹی چیزیں لانے کے لیے وہ اسی کے ساتھ چکر لگاتی رہی تھی۔

اس کی اتنی مدد کے بغیر وہ اتنا سب اکیلی اس حالت میں شاید کبھی نہ کر پاتی۔ آخر میں رضوان نے اس کو اس کے اپارٹمنٹ کے باہر چھوڑ کر سنجیدہ اور پر سوچ نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے آگے ایک چھوٹی سی چٹ بڑھائی تھی۔

"یہ نمبر ہے میرا۔ آپ کو کوئی بھی کام ہو مجھے بتانا۔"

ماہم نے ایک نظر اس کے سنجیدہ چہرے پر ڈالی اور کچھ ہچکچاتے ہوئے اس کے ہاتھ سے وہ چٹ تھام لی۔

ماہم کو رضوان کی شکل میں ایک ہمدرد اور مخلص انسان نظر آیا تھا۔ "کیا پتا اللہ ایک در بند کرتا ہے تو کئی اور کھول ہی دیتا ہے۔" اس نے سوچا تھا پھر سر جھٹک کر تھکن زدہ سی اپنے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گئی۔

جانے سے پہلے اس نے اپنے برابر والی آنٹی کو اپنا نیا ایڈریس اور فون نمبر ایک چابی کے ساتھ دے دیا تھا اور ان سے کہا تھا کہ اگر کوئی مجھے پوچھتا ہوا آئے تو اس کو یہ دے دینا۔ اور پھر اکتیس اکتوبر کی اس شام اس نے وہ گھر چھوڑ دیا۔ وہ گھر جس کے لیے اس نے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔

اس شام آسمان پر پرندے بے حد نیچی پرواز کرتے ہوئے شور مچا رہے تھے۔ بے تحاشا شور۔ ہوا سانس روکے ہوئے تھی۔

"بات کرو بھائی اس کے مالک مکان سے۔ کیسے کیسے لوگوں کو اٹھا کر مکان دے دیتا ہے یہ۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں۔ پوری گلی کا ماحول خراب ہو رہا ہے۔"

"صحیح بات ہے۔ سب کے گھروں میں بچیاں ہیں شریفوں کا محلہ ہے یہ۔ پہلے تو ان جیسیوں کا الگ ہی محلہ ہوتا تھا۔ مگر اب تو ایسی عورتیں شریفوں کے محلے میں۔"

ماہم کا سانس پھولنے لگا وہ مزید تیز تیز چلنے لگی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں، گروسری کے دو بیگز تھے وہ قریب کی مارکیٹ سے اپنے لیے ضرورت کی چیزیں خریدنے گئی تھی۔ واپسی پر اس سے گلی پار کرنا محال ہو گیا تھا یہ تین عورتیں تھیں جو اپنے گھروں کے سامنے کھڑی تیز آواز میں اس کو آتا دیکھ کر باتیں کر رہی تھیں۔ ایک فربہ عورت دہلیز پر کھڑی ذرا چلا کر بولی۔

"قیامت کی نشانیاں ہیں اور کیا۔ پہلے سنتے تھے بڑوں سے۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں نکال کے پھینکو اس کو یہاں سے۔ وہ لفنگا رضوان ہے اس کا کچھ لگتا وہی......"

عورتوں کی نظروں اور الفاظ کے تیروں نے اس کا گھر تک تعاقب کیا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے بیگز فرش پر پھینکے اور دروازہ بند کر کے تیز تیز سانس لینے لگی۔ اس کا سانس اکھڑنے لگا تھا۔

پھر شام ڈھل گئی۔ سائے گہرے ہو گئے۔ پرندے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ وہ کمرے کا دروازہ اندر سے اچھی طرح بند کیے چارپائی پر رضائی اوڑھے سکڑ سمٹ کر لیٹی رہی گھر کی ساری بتیاں جلائے۔ آنکھیں میچے باہر چھوٹے سے صحن کے اکھڑے ہوئے فرش پر ابھی تک شاپنگ بیگز پڑے تھے اور ان کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ تبھی دھیرے دھیرے دروازے پر دستک ہونے لگی۔

"ماہم جی...... ماہم جی۔" ماہم نے آنکھیں اور زور سے میچ لیں۔ "دروازہ کھولیں۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ ماہم جی۔" رضوان کی آواز پست تھی۔

تو جنہیں رستم و سہراب کہا کرتا تھا
وہ جواں میں نے یہاں خاک بسر دیکھے ہیں

ماہم بمشکل ایک مہینہ ہی اس کرائے کی گھر میں گزار پائی تھی وہ لگژری فلیٹ۔ جو اس کا خواب بھی تھا۔ ایک خوب صورت اپنا گھر۔ اس کا آرام چھوڑ کر۔ ایک کمرے کے ایسے کرائے کے گھر میں اکیلے رہنا جہاں گلی محلے کی عورتیں اس پر زنا کا فتویٰ لگا چکی تھیں اور اسے واجب القتل سمجھتی تھیں۔ اور مردوں کی گدھوں جیسی نظریں نیزے کی طرح اس کے آر پار ہو جاتی تھیں۔

اس کو کئی بار وہ گھر خالی کرنے کا کہا جا چکا تھا۔ بینک میں موجود رقم ختم ہو رہی تھی اور آگے اس بچے کے ساتھ اکیلے وہ کیسے سروائیو کرتی ان سب ٹینشن کی وجہ سے اس کا بی پی ہائی رہنے لگا تھا اور وہ وقت سے بہت پہلے ہاسپٹل پہنچ گئی تھی۔

وہ اوائل دسمبر کا ایک سرد ترین دن تھا اور اچانک سے ہونے والی بارشوں نے سردی کو مزید بڑھا دیا تھا جب ماہم نے ایک پرائیوٹ کلینک میں ایک بچے کو جنم دیا۔ اس کی ساری جمع پونجی پرائیوٹ کلینک میں ڈاکٹرز اور آپریشن کے خرچوں میں نکل گئی تھی بچہ پری میچور تھا اسے تین دن وینٹی لیٹر میں رکھا گیا۔ جب ان دونوں کی طبیعت بہتر ہو گئی تو چوتھے

دن ان کو ڈسچارج کر دیا گیا۔ ہاسپٹل کے سارے اسٹاف کو پتا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی بھی نہیں ہے نہ آپریشن کے لیے، پرمیشن لیٹر پر سائن کرنے کے لیے نہ بلڈ اور میڈیسن وغیرہ کا انتظام کرکے یہ سب کام ہاسپٹل کے عملے نے کیے تھے جس کے لیے الگ سے چارج کیا گیا تھا۔

ہاسپٹل آتے وقت جو بیگ وہ اپنے ساتھ لائی تھی جس میں بچے کے سامان کے ساتھ ساتھ اس کا والٹ اور موبائل تھا دوبارہ جب اس کے حوالے کیا گیا تو اس میں اس کا فون موجود نہیں تھا۔ اس نے نرسز سے اپنے موبائل فون کے بارے میں استفسار کیا مگر ظاہر ہے انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور تھوڑا بہت ڈھونڈنے کے بعد بھی وہ کہیں نہیں ملا نہ ہی اسے اب ملنا تھا۔ تاہم اپنے اس آخری اثاثے کے لٹ جانے پر بس گم صم ہواؤں میں گھورتی رہی۔ وہ فون اس کا آخری رابطے کا ذریعہ تھا باہر کی دنیا سے وہ باہر کی دنیا جس میں اس کا کوئی ایسا نہیں تھا جس سے رابطہ کیا جاسکے۔

بچے کی اس طرح پری میچور ڈلیوری وہ بھی آپریشن سے (جس میں اس کا سارا بینک بیلنس لگ گیا تھا) اس کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ جب اس کو ڈسچارج کرنے کا وقت آیا تو شدت خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔

اور اس نے ایک آخری کوشش کرنا چاہی ایک نرس سے اس کا موبائل مانگ کر اس نے سب سے پہلے علی کو فون کیا۔ علی کے فون ریسیو کرتے ہی اس نے سانس روک کر جلدی جلدی کہنا شروع کیا ''علی میں ہاسپٹل میں ہوں۔ ہمارا......''

''افوہ!'' علی نے اس کی بات مکمل نہیں سنی تھی اس کی آواز پہچانتے ہی اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تھا اور فون بند کر دیا تھا۔ وہ کئی لمحے یونہی موبائل کان سے لگائے جامد بیٹھی رہ گئی پھر اس نے بھرائی آنکھوں اور لرزتے ہاتھوں سے بیلا کا نمبر ملایا تھا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ ایک، دو، تین......''

''فون اٹھاؤ بیلا۔ پلیز فون اٹھاؤ۔'' وہ تڑپ کر دل میں التجا کر رہی تھی۔ ٹک......ٹک......ٹک سیکنڈ کی سوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے پاس ٹائم کم تھا۔ یہ اس کا آخری چانس تھا۔ نرس کوفت سے اپنا موبائل لینے کے لیے اس کے سر پر کھڑی تھی اور پھر۔

''آپ کے مطلوبہ نمبر سے فی الحال جواب موصول نہیں ہو رہا برائے مہربانی کچھ دیر بعد کوشش کیجیے۔''

بیلا نے فون ریسیو نہیں کیا تھا۔ آواز باہر تک آ رہی تھی۔ نرس نے اس کے ہاتھ سے موبائل واپس لے لیا تھا۔ اس کا ہاتھ بے جان ہو کر پہلو میں گر گیا۔ اور اس نے خواہش کی کہ کاش وہ ڈلیوری کے وقت مر گئی ہوتی وہ بھی اور اس کا بچہ بھی۔ اور اس کو یہ سب دیکھنا نہ پڑتا۔

ہاسپٹل کی ہی بلائی گئی ٹیکسی میں بیٹھتے وقت کوئی اس کے اندر دھاڑیں مار مار کر چلاتا اور کرلاتا رہا۔

''مجھے مت بھیجو وہاں خدارا میں مر جاؤں گی۔ اس محلے میں۔ ایسے ظالم لوگوں میں۔ یہیں رکھ لو۔ کچھ دن بس کچھ دن اور نرسز کی نگہداشت میں۔ میں تو خود اٹھ کر چل بھی نہیں سکتی۔ وہاں تو کچھ کھانے کو بھی نہیں ہے نہ میرے پاس پیسے ہیں کہ میں کچھ خرید سکوں۔ میں مر جاؤں گی۔ میں مر جاؤں گی۔''

مگر اس کے لب بھنچے ہوئے تھے۔ مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ وہ امید کھو چکی تھی۔ ہمت ہار چکی تھی۔ ایک لاش کی طرح وہ ٹھنڈی اور نیلی پڑ رہی تھی اور ٹیکسی میں اس کے برابر لیٹا ننھا وجود بے خبر سو رہا تھا۔

☆☆☆

ٹیکسی ڈرائیور ایک ادھیڑ عمر کا مہربان انسان تھا اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے اس نے بچہ اور اس کا بیگ اٹھا کر اس کے گھر کے اندر کمرے میں چارپائی پر رکھ دیے تھے۔

ڈرائیور کے ہاتھ پر اس نے اپنے پرس میں موجود آخری تین سو روپے کپکپاتے ہاتھوں سے

رکھے تو ڈرائیور اسے عجیب اور ترحم آمیز نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کا خالی گھر اوپر سے یہ حالت۔ ڈرائیور نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر پھر کچھ بھی کہے بغیر مڑ کر چلا گیا ماہم نے اس کے جاتے ہی دروازہ بند کیا اور لڑکھڑاتی ہوئی آ کر چارپائی پر بچے کے برابر گر گئی۔

ہلکی برستی بارش زور پکڑ رہی تھی۔ سردی بھی بڑھتی جا رہی تھی جیسے جان لے کر ہی چھوڑے گی۔ اس کی رضائی ناکافی پڑنے لگی۔ بند کواڑوں کی درزوں سے آتی سرد ہوا کی لہریں تیز دھار خنجر کی طرح اس کے بدن کو کاٹ رہی تھیں اس نے اپنی چادریں اور کپڑے تک اپنے بچے اور خود پر ڈال دیے۔

اب اسے یہ بارش زہر لگ رہی تھی کبھی اسے بارش سے عشق تھا مگر علی کے عشق کی طرح اسے یہ عشق بھی لے ڈوبا۔

اسے علی کے ساتھ اس اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوتے زیادہ دن نہیں گزرے تھے تب ایک دن اس نے علی سے کہا تھا۔

”مجھے بارش سے عشق ہے علی۔ اور مجھے لگتا ہے کہ اس دنیا میں پہاڑوں پر برستی بارش سے زیادہ کچھ بھی خوب صورت نہیں ہے۔“

”نہیں تم ہو ناں تمہاری آنکھیں ہیں۔“ وہ اس کے حسن میں ڈوبا تھا تب اسے اور کیا ہی دکھنا تھا۔

”مجھے لگتا ہے کہ مجھے پہاڑ بلا رہے ہیں علی۔ مجھے دیکھنا ہے کہ جب بارش پہاڑوں پہ برستی ہے تو کیسا لگتا ہے۔ مجھے بارش کا شور سننا ہے۔ مجھے پہاڑوں کی خاموشی سننی ہے۔“

ماہم نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ علی نے ایک گہری سانس لی تھی۔

”ہم جائیں گے ناں ہنی۔ ناردرن ایریاز بھی ......اور جہاں جہاں پہاڑ ہیں۔ نیپال، اٹلی، کولمبیا اور پوری دنیا گھماؤں گا تمہیں۔ اور ہم اپنا گھر بنائیں گے۔ ایک بہت خوب صورت سا گھر۔ وہاں جہاں......“

”ٹپ ٹپ ٹپ......“ قطرہ قطرہ بارش کا پانی چھت سے اس کی چارپائی پر ٹپک رہا تھا اور قطرہ قطرہ زندگی اس کے اندر سے ختم ہو رہی تھی۔

کئی پہر یونہی گزر گئے۔ اس پر بار بار بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ مگر ہر تھوڑی دیر بعد اس کے بچے کے رونے کی آوازیں اس کو ہوش کی دنیا میں لا پٹختی تھیں۔ اب تو اس میں اس ننھی جان کی ضرورت پوری کرنے کی سکت بھی نہیں بچی تھی۔

بارش فی الحال تھم گئی تھی مگر بادلوں کے باعث اندھیرے نے وقت سے پہلے ہی اجالے کو نگل لیا تھا۔ بجلی تھی نہیں۔ چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا تھا۔

وہ جو ساری زندگی اپنی ماں کو موردِ الزام ٹھہراتی رہی تھی اب اس پر منکشف ہوا کہ وہ دراصل بہت بہادر تھیں بزدل نہیں۔ کامیاب تھیں ناکام نہیں۔ ناکام تو وہ تھی۔ نام اور نامراد۔ اب اس کو اپنی ماں پہ رشک آنے لگا۔ ان پر اور ان کی چوائسز پہ......اور آنسو اس کی آنکھوں سے بے تحاشا بہنے لگے۔ اس نے اپنے وجود میں بچ جانے والی ساری ہمت مجتمع کر کے مدد کے لیے پکارنا شروع کیا۔

”ہماری مدد کرو۔ خدا کے لیے ہماری مدد کرو۔ ہم مر رہے ہیں بچاؤ کوئی ہے۔“

مگر کوئی نہ آیا۔ یہاں تک کہ ایک اور شام ڈھل گئی۔ اور بارش پھر سے شروع ہو گئی۔ اس کا حلق سوکھ گیا تھا۔ ساتھ رکھی پانی کی بوتل میں پانی ختم ہو چکا تھا۔

بے بسی خوف اور اذیت کی انتہا پر پہنچ کر اس کے دل سے نکلا۔ یا اللہ مدد...... یا اللہ۔“ پھر وہ اپنے خشک لبوں سے مسلسل پکارتی گئی۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

قرۃ العین خرم ہاشمی

ایک ہم

”مگر آپ کو بیکنگ کی کلاس لیتے ہوئے صرف دو ہفتے ہوئے ہیں۔“ مس طلعت نے حیرانی سے سامنے کھڑی بیس سال کی لڑکی کی طرف دیکھا تھا۔ ”میم! مجھے لگتا ہے کہ بیکنگ کی نسبت آئل پینٹنگ زیادہ دلچسپ ہے۔ سنا ہے کہ ایک پینٹنگ کی قیمت بھی بہت اچھی ہوتی ہے۔ میری ایک کزن مصورہ ہے۔ ان کے کام کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔ مجھے بھی یہ سب سیکھنا ہے۔“ لڑکی نے جلدی سے کہا تو مس طلعت مسکرادیں۔

”اور ایسی ہی ایک مثال آپ نے بیکنگ کی

کلاس میں داخلہ لیتے وقت بھی دی تھی کسی مشہور شیف کی ......!'' مس طلعت نے نرمی سے کہا۔

''آں......! وہ میری امی کی کزن ہیں مگر اب مجھے بیکنگ اتنی اچھی نہیں لگ رہی۔'' لڑکی اپنی بات پر بضد تھی۔

''مگر آپ اچھا کام کررہی ہیں۔ ویسے بھی ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ہمارا ادارہ کئی سالوں سے لڑکیوں کو امور خانہ داری سے لے کر کئی طرح کے جدید کورسز کروارہا ہے۔ آپ خود کو کچھ وقت دیں۔ پہلے آپ نے سلائی سیکھنے کی کلاس میں داخلہ لیا۔ ایک مہینے بعد وہاں سے دل بھر گیا تو بیکنگ کی طرف آ گئیں اور اب......!'' مس طلعت نے حیرانی سے کہا۔

''یہ آخری بار ہے۔ میں دل لگا کر آئل پینٹنگ کا کام سیکھوں گی۔ پلیز میم!'' لڑکی نے منت کی تھی۔

''ٹھیک ہے جیسی آپ کی خوشی مگر بیٹا! ایک بات ہمیشہ یاد رکھیں کامیاب وہ لوگ ہوتے ہیں جو ہمیشہ سوچ سمجھ کر ایک سمت کا چناؤ کرتے ہیں اور اس میں محنت کرتے ہیں۔ انسان ہر چیز میں پرفیکٹ نہیں ہوسکتا ہے۔''

مس طلعت نے آخری بار سمجھایا۔ لڑکی نے فوراً سر ہلا دیا۔ چند دن گزرے تو اس لڑکی کا دل اس کام سے بھی اکتا گیا۔ بمشکل اپنا تین مہینے کا کورس مکمل کیا اور پھر بیوٹیشن کا کام سیکھنے کا جنون سر پر سوار ہوگیا مگر وہ بھی بس چند ہفتے تک ہی رہا تھا۔

☆☆☆

''بھئی۔ آج تو کمال ہی ہوگیا۔ کیا شان دار باؤلنگ کی اپنے حسن نے ہارتے میچ کو جتوادیا۔''

عثمان پسینے میں شرابور، سفید رنگ کے مخصوص کپڑے پہنے لاؤنج میں داخل ہوا اور کرکٹ کٹ سائیڈ پر رکھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ زین جو انہماک سے ویڈیو گیم کھیل رہا تھا۔ اس نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا۔

''حسن نے کرکٹ کھیلنا کب سے شروع کردی ہے؟ اس کے کالج کا پہلا سال ہے۔ عظمیٰ کا تو بہت شوق ہے اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنانے کا۔ فضول کے کاموں میں وقت ہی ضائع کررہا ہے۔'' لبنیٰ نے کچن سے نکلتے ہوئے پہلے جیٹھانی کی شان میں قصیدہ پڑھا اور پھر شوہر کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ہماری ٹیم کا ایک لڑکا بیمار ہوگیا تو مجبوری میں حسن کو شامل کیا مگر سچ میں بھتیجے نے سر فخر سے بلند کردیا ہے۔'' کرکٹ سے جنونی محبت کرنے والے عثمان نے خوشی سے کہا۔

''ویسے حسن پڑھائی میں بھی اچھا ہے۔ اسکول، کالج میں تقریری مقابلوں میں بھی حصہ لیتا رہا اور اب کھیل کے میدان میں بھی جھنڈے گاڑ دیے ہیں۔'' لبنیٰ نے پرسوچ نگاہوں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر کہا جو نویں جماعت کا طالب علم تھا۔

''ہاں، تو ٹھیک کہا۔ ہمارا حسن ہرفن مولا ہے۔'' عثمان نے بھتیجے کی محبت میں کہا۔ لبنیٰ کے دل میں حسد کی آگ جل اٹھی۔

''جی اور ایک ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔ جو اتنا پڑھنے کے بعد بھی، حسن سے کم نمبر لیتا ہے۔ اسٹیج پر بھی تقریر نہیں کرسکا کیوں کہ اعتماد کی کمی ہے۔ غیر نصابی سرگرمیاں ویسے ہی پسند نہیں۔ بس ویڈیو گیمز کا شوقین ہے۔'' لبنیٰ حسب معمول تقابل کرتے ہوئے بولنا شروع ہوگئی تھی۔

''یہاں حسن اور زین کا مقابلہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا بیٹا اتنا بھی کند ذہن نہیں ہے۔ جتنا تم نے سمجھ لیا ہے۔'' عثمان نے ہمیشہ کی طرح طرف داری کی تھی۔ زین نے تشکر آمیز نگاہوں سے باپ کو دیکھا۔

''میں ماں ہوں، ان کی دشمن نہیں! دوسروں کے بچے آگے نکل جائیں گے اور ہمارے پیچھے رہ جائیں گے۔'' لبنیٰ نے منہ بنا کر کہا۔

''پھر وہی بحث!'' عثمان نے بے زاری سے کہا اور اٹھ کر کمرے کی طرف چلا گیا۔ لبنیٰ نے زین کو گھورا جو وہاں سے کھسکنے کی تیاری کررہا تھا۔

"کل سے تم بھی روز شام کو کرکٹ کھیلنے جاؤ گے۔" لبنیٰ نے حکم دیتے ہوئے کہا۔

"مگر مما! مجھے کرکٹ کھیلنا پسند نہیں ہے۔" زین نے جھنجلا کر کہا۔

"بے وقوف لڑکے! حسن کو دیکھو۔ ہر چیز میں تم سے آگے اور تم......!"

لبنیٰ اسی ٹریک پر پھر گاڑی کو لے آئی تھی۔ زین نے بے بسی سے ماں کی طرف دیکھا۔ جس کے بولنے کے سامنے کوئی اسپیڈ بریکر نہیں آتا تھا۔

☆☆☆

"زین! آج تم کرکٹ کھیلنے نہیں گئے؟" لبنیٰ نے کمرے میں بند زین کو پکارتے ہوئے کہا۔

"کل! اسکول میں بہت ضروری ٹیسٹ ہے۔" زین نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر کے بعد لبنیٰ کمرے میں داخل ہوئی۔

"ٹیسٹ کی تیاری آکر کر لینا۔ جلدی سے جاؤ۔ حسن سے اچھا کھیلنا ہے تم نے۔"

لبنیٰ نے ایسے کہا جیسے اچھی کرکٹ کھیلنا ایک یا دو دن کی بات ہو۔ حسن جو سالوں سے اس میدان میں محنت کر رہا تھا۔ زین کی بے دلی سے کی گئی کوشش اس کے مقابل کیسے ٹھہر سکتی تھی۔

"مگر مما! وہاں کچھ لڑکے......" زین نے روہانسے انداز میں کچھ بتانا چاہا مگر لبنیٰ اس کی بات سنے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی۔

زین بے دلی سے گھر سے باہر نکلا۔ میدان میں معمول کے مطابق رونق لگی ہوئی تھی مگر زین کو یہ سب بورنگ لگتا تھا۔ لبنیٰ کی ضد اور مسلسل اصرار پر زین نے شام کو کرکٹ گراؤنڈ جانا تو شروع کر دیا تھا۔ مگر اسے اس کھیل میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چند دنوں میں وہ اکتا گیا اور اس نے کھیلنے سے معذرت کر لی مگر لبنیٰ کی ڈانٹ سننے کے بعد، اگلے دن وہ اپنے مخصوص وقت پر گھر سے باہر نکل گیا۔

"کہاں چلے شہزادے! آج میدان میں نہیں جانا؟" محلے کے آوارہ لڑکے شاہ جہاں نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ عام دنوں میں زین نے کبھی اسے منہ نہیں لگایا تھا مگر اب معاملہ دوسرا تھا۔

"مما کی خواہش ہے کہ میں کرکٹ کھیلوں مگر مجھے یہ کھیل پسند نہیں۔ مجھے ویڈیوز گیمز اچھی لگتی ہیں۔" زین نے منہ بنا کر کہا۔

"تم تو اپنی ہی پارٹی کے نکلے ہو۔ آجاؤ۔"

شاہ جہاں نے زین کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ شاہ جہاں کی عمر سترہ سے اٹھارہ سال کے درمیان تھی۔ جس نے کئی سال پہلے پڑھائی چھوڑ کر آوارہ گردی کو چن لیا تھا۔ اس دن زین جو ماں کی وجہ سے گھر سے باہر نکلا، باہر ملنے والی فرار کو چن کر مطمئن ہو گیا۔

"اگر مما میری بات نہیں سمجھ سکتیں تو میں کیوں مانوں؟" گھر واپس آکر پہلی بار جھوٹ بولتے ہوئے زین نے خود کو بہلایا تھا۔

☆☆☆

"زین کہاں ہے؟" عثمان شام ڈھلے حسن کے ساتھ گھر واپس آیا تو سنجیدگی سے سوال کیا۔ حسن کو دیکھ کر لبنیٰ فوراً آگے بڑھی۔

"اپنا زین تو ہر روز کرکٹ کھیلنے جاتا ہے۔ دیکھنا حسن بیٹا ایک دن آپ سے آگے نکل جائے گا اور......!" لبنیٰ کہتے ہوئے ایک دم چپ ہوئی تھی کیونکہ عثمان کے چہرے پر شدید غصے کے تاثرات تھے۔

"زین کرکٹ کے میدان میں نہیں ہے بلکہ وہ ایک مہینے سے وہاں گیا ہی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ زین ایک مہینے سے کہاں جاتا ہے؟"

عثمان نے غصے سے پوچھا تو لبنیٰ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

"چاچو! میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ زین کو مشکل کھیل پسند نہیں ہیں جن میں بھاگنا پڑے یا محنت کرنی پڑے۔ وہ ہمیشہ آسان چیز کو منتخب کرتا ہے۔ جیسے کہ......!" حسن کہتے ہوئے چپ کر گیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ میرا زین ست ہے،

نکما ہے۔" لبنیٰ نے ناگواری سے کہا تو حسن نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں! وہ بس مجھ سے الگ ہے۔ جیسے میں اس سے الگ ہوں۔" حسن نے نرمی سے کہا۔

"امام مسجد نے علاقے کی کمیٹی سے کچھ آوارہ لڑکوں کی شکایت کی ہے جو مسجد کے چندہ باکس سے پیسے چرا کر لے گئے ہیں۔ ان میں زین کا نام بھی شامل ہے۔" عثمان نے غصے سے کہا اور پھر سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ لبنیٰ نے بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

"چاچو! مجھے پہلے ہی شک تھا کہ زین آج کل کسی غلط قسم کی سرگرمی میں مبتلا ہے۔ اسی لیے تو بار بار آپ کو خبردار کر رہا تھا۔" حسن نے عثمان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اور میں تمہاری چاچی کی عقل مندی پر یقین رکھ کر مطمئن رہا مگر......!" عثمان نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔

"ہم زین کو نرمی سے سمجھائیں گے۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

حسن نے سمجھداری سے کہا۔ لبنیٰ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اپنے بچوں کا مقابلہ دوسروں کے بچوں سے کرتے ہوئے وہ بھول گئی تھی کہ سمجھ داری اور عقل پلیٹ میں رکھ کر پیش نہیں کی جاتی اسے وقت کے ساتھ ساتھ زندگی کشید کرتی ہے۔

اچانک لبنیٰ کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ کچھ دھندلے سے منظر اسے ماضی کے کسی لمحے میں کھینچنے لگے۔

"چلیں! ہم زین کو ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ نجانے ڈر کر کہاں چھپ گیا ہے۔" حسن نے فکر مندی سے کہا تو عثمان سر ہلاتا اس کے ساتھ گھر سے باہر نکل گیا۔ لبنیٰ گم صم کھڑی تھی۔

"مما! بھائی کو کیا ہوا؟" زین سے دو سال چھوٹی حرا نے حیرانی سے سوال کیا تو لبنیٰ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

ابھی تو ایسے بہت سے سوالوں کے جواب میں اس نے نجانے کس کس کو دینے تھے۔

☆☆☆

"زین! کمرے میں بند کیوں ہو؟ چلو واک کریں۔"

عثمان نے نرمی سے کہا۔ بند کمرے میں بے زار بیٹھے زین نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا۔ اس واقعہ کو کئی مہینے گزر چکے تھے۔ عثمان کے رویے میں واضح تبدیلی آئی تھی۔ اس نے زین کے سلسلے میں جو لاپروائی پہلے کی تھی۔ اب سائے کی طرح اس کے ساتھ ہوتا۔ زین کو احساس دلائے بغیر اس کے معمولات پر نظر رکھتا۔ زین بری فطرت کا مالک نہیں تھا۔ وہ وقتی طور پر ماں کے غلط رویے کی وجہ سے، جلد بازی میں بری صحبت اختیار کر بیٹھا مگر شکر تھا کہ جلد واپس لوٹ آیا۔ عثمان کے علاوہ، حسن بھی اسے وقت دیتا۔

عثمان نے لبنیٰ کو زین سے سختی برتنے سے منع کر دیا تھا۔ لبنیٰ خاموش تھی مگر اس کے اندر یہ احساس ضرور تھا کہ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔ لبنیٰ زین کے معاملے میں محتاط ہو گئی تھی۔ زین نے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا اور حسن کے کالج میں داخلہ لے لیا۔

حرا نویں جماعت کی طالبہ تھی۔ لبنیٰ کی توجہ اب بیٹی پر رہنے لگی۔ لبنیٰ کی خواہش تھی کہ حرا ہر فن مولا ہو۔ وہ حرا کو بیک وقت کئی چیزیں سکھانے کی کوشش میں تھی۔ اسی وجہ سے حرا کوئی کام بھی درست نہیں کر پاتی۔ لبنیٰ کی جھنجلاہٹ اور حرا پر پریشر بڑھنے لگا۔ جو حرا کو چڑچڑے پن میں مبتلا کرنے لگا تھا مگر لبنیٰ کو اس بات کا احساس نہیں تھا۔

"میرے دونوں بچے ہی نکمے نکلے ہیں۔ دوسروں کے بچے ہر چیز میں آگے ہیں۔ چاہے پڑھائی ہو یا کوئی اور ہنر......!"

ایک دن لبنیٰ نے اکتا کر کہا تو پاس بیٹھی حرا نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے اٹھ کر

کمرے میں چلی گئی۔ لاؤنج میں داخل ہوتا زین ٹھٹک کر رک گیا۔ اسے کئی سال پہلے کا وقت پوری شدت سے یاد آیا تھا۔

''کاش! ہم بچے والدین کو یہ سمجھا سکتے کہ ایک ہم اور خواہشوں کی اتنی قسمتیں...... ایک وقت میں کیسے سر ہوں گی۔''

زین نے بے زاری سے سوچا اور ماں کو مخاطب کیے بغیر، اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ لبنیٰ کو اس کا خاموشی سے چلے جانا بہت چبھا تھا۔

☆☆☆

''لبنیٰ! اف کتنے عرصے کے بعد ملاقات کر رہے ہیں۔ تم تو شادی کے بعد مجھے بھول ہی گئیں۔''

ہمیشہ کی طرح شوخ لہجے میں بولنے والی ثنا نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ لبنیٰ رشک بھری نگاہوں سے اپنے کالج کی دوست کو دیکھ رہی تھی۔ جو وقت کے ساتھ مزید نکھر گئی تھی۔ پراعتماد لہجہ، ہنستے مسکراتے زندگی سے بھرپور باتیں کرتے کہیں سے بھی نہیں لگتا تھا کہ وہ تین جوان ہوتے بچوں کی ماں ہے۔ لبنیٰ آج میکے آئی تو اسے ڈھونڈتی چلی آئی تھی۔ لبنیٰ کے والدین تو حیات نہیں تھے۔

دونوں بھابیوں نے ثنا کو خوش دلی سے اٹینڈ کیا اور اس کا نمبر لے کر اگلے دن لبنیٰ کو دے دیا۔ لبنیٰ نے بچھڑی دوست سے رابطہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ ثنا نے فوراً اسے فیملی سمیت ڈنر پر مدعو کر لیا۔ ثنا کے گھر کا ماحول ویسا ہی تھا جیسی لبنیٰ کو توقع تھی۔

''عثمان کی جاب کی وجہ سے پہلے دوسرے شہر چلی گئی تھی۔ جب واپس اس شہر میں آئی تو تم پیا سنگ رخصت ہو چکی تھیں۔ بس زندگی کی بھاگ دوڑ نے اتنا وقت ہی نہیں دیا کہ عہد رفتہ کو آواز دیتے۔'' لبنیٰ نے مسکرا کر کہا۔

''اب میں یہاں آ گئی ہوں تو ملاقاتیں ہوتی ہی رہیں گی۔'' ثنا نے یقین سے کہا اور پھر آنے والے وقت میں ثابت بھی کیا۔ کچھ مہینوں میں دونوں سہیلیاں پہلے کی طرح گھل مل گئی تھیں۔

☆☆☆

''یہ کیک تم نے بنایا ہے؟''

ثنا کی بیٹی میریب کی سالگرہ کی تقریب تھی۔ جو حرا سے ایک سال چھوٹی تھی۔ ثنا نے اس کی سالگرہ پر زیادہ تر چیزیں گھر پر بنائی تھیں مگر سب سے اہم چیز سالگرہ کا کیک تھا جو کسی پروفیشنل بیکر کا بنایا لگ رہا تھا۔

''ارے کیا تم بھول گئیں۔ مجھے کالج میں بھی بیکنگ کا کتنا شوق تھا۔ کتنی ریسپیز ٹرائی کرتی تھی بلکہ مجھے دیکھ کر تمہیں بھی بیکنگ کرنے کا موسمی بخار چڑھا تھا اور پھر کچھ دن کے بعد سب بھول کر آئل پینٹنگ سیکھنے چل پڑیں۔ تمہارے شوق بہت تیزی سے بدلتے تھے کیا اب بھی ایسی ہو؟''

ثنا نے مسکراتے ہوئے سوال کیا تو کچھ دور صوفے پر بیٹھے زین اور حرا نے چونک کر پہلے ماں اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیے۔

''نہیں! اب مما ہمیں تختہ مشق بنائے رکھتی ہیں۔ مما کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے سب کام ایک دن میں سیکھ کر، سب جاننے والوں کے قابل بچوں کو ہرا دیں مگر افسوس کہ مما کے بچے بہت عام سے بچے ہیں کوئی سپر ہیرو نہیں!''

زین نے ہلکی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر طنزیہ انداز میں کہا۔ لبنیٰ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا جبکہ ثنا نے حیرانی سے زین کی طرف دیکھا تھا۔

''اس عمر میں، ماں کے لیے اتنی تلخی؟''

ثنا ٹھٹک گئی مگر لبنیٰ زین کے پاس جا کر اسے ڈانٹنے لگی۔ زین کا چہرہ سرخ ہوا اور ایک دم اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی مگر جیسے ہی زین کی نگاہ ثنا کی سنجیدہ نگاہوں سے ٹکرائی تو اس کے ذہن کو زور کا جھٹکا لگا۔ وہ دو سال پہلے کے اس وقت میں پہنچ گیا جب ایسی ہی ترس کھاتی کئی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ زین جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھا اور لاؤنج سے باہر نکل گیا۔ لبنیٰ ہکا بکا رہ گئی۔

''دیکھا تم نے! ابھی اس کی عمر کیا ہے اور ماں کے ساتھ یہ رویہ......!'' لبنیٰ لب کاٹتی بے بسی سے

بھی ثنا کے پاس آئی۔

"لبنیٰ! یہ تو تمہیں سوچنا ہے کہ اتنی کم عمری میں تمہارا بچہ، تم سے بدگمان کیوں ہے؟ ابھی اس کا سرکل محدود ہے۔ پرواز محدود ہے۔ کل کو پر پھیلا کر جب آسمان پر اڑے گا تو تب کیا کرو گی؟ بچوں کے رویے کسی وجہ کے بغیر نہیں بدلتے ہیں۔"

ثنا نے سنجیدگی سے کہا اور پھر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ سالگرہ کی ساری ارینجمنٹ لان میں کی گئی تھی۔ سب مہمان آچکے تھے۔ میرب نے تالیوں کے شور میں کیک کاٹا تھا۔ اپنے آس پاس کی گہما گہمی کا حصہ ہوتے ہوئے بھی لبنیٰ وہاں موجود نہیں تھی۔

☆☆☆

"یہ سب آپ کے بے جا لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔ وہ ماں کو دشمن سمجھتا ہے۔ آج مجھے ثنا کے سامنے اتنی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔"

گھر آتے ہی لبنیٰ ایک دم پھٹ پڑی تھی۔ عثمان نے تحمل سے اس کی بات سنی اور پھر سوالیہ نگاہوں سے زین کی طرف دیکھا۔ جو ماں کی بات سن کر شرمندہ ہو گیا تھا۔

"سوری مما! میں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتا ہوں۔ جب بھی آپ کو کسی بات پر اصرار کرتا دیکھتا ہوں تو مجھے دو سال پہلے کا وہ وقت یاد آجاتا ہے جب میں آپ کے ڈر کی وجہ سے کرکٹ کا بلا اٹھائے میدان میں جاتا تو وہاں موجود لڑکے مجھے دیکھتے ہی ہوٹنگ شروع کر دیتے۔

میرا مذاق اڑاتے۔ مجھ پر ہنستے کیونکہ مجھے تو ٹھیک سے بیٹ پکڑنا بھی نہیں آتا تھا۔ میں کئی دن ان کے مذاق کا نشانہ بنتا رہا۔ آپ سے کہنا چاہتا تھا مگر آپ سختی سے چپ کروا دیتیں۔ پھر مجھے یہ ہی بہتر لگا کہ میں شاہ جہاں کو دوست بنا لوں جو میرا مذاق نہیں اڑاتا تھا۔ مجھے وہ کام کرنے پر مجبور نہیں کرتا جو مجھے نہیں آتا تھا۔ وہ میرا سایہ بن گیا۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ آپ کے ڈر سے جس کے پیچھے جا رہا ہوں، وہ سمت میری نہیں تھی۔ پھر مجھ پر چوری جیسا الزام لگ گیا جبکہ میں اس میں شامل نہیں تھا مگر میں شاہ جہاں کا دوست تھا۔ سب سمجھے یہ بھی ویسا ہی ہوگا مگر لوگ نہیں جانتے تھے کہ میں تو اپنی ماں کی وجہ سے یہاں تک آیا ہوں، اپنی خواہش کے پیچھے تو نہیں۔ مگر مجھے بدنامی کی سزا ملی۔

شاید وہ تلخی میرے اندر ہے جو آپ کو سامنے دیکھ کر باہر آجاتی ہے۔ آج ثنا آنٹی نے آپ کے ماضی کا ذکر کیا تو میری اور حرا کی سمجھ میں آیا کہ آپ ہمیشہ سے ایسی ہیں۔ اسی لیے آپ بھی ثنا آنٹی کی طرح کسی کام میں مہارت حاصل نہیں کر سکیں۔ سب کام ادھورے کیے۔ ہماری طرح۔ ہم بھی آپ کے بچے ہیں۔ ایک سمت میں کیسے چل سکتے ہیں؟"

زین نے اداسی سے کہا اور اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ حرا بھی سر جھکا کر وہاں سے چلی گئی۔ عثمان نے ایک نظر گم صم بیٹھی لبنیٰ پر ڈالی۔ جو بات وہ اتنے سالوں میں نہیں سمجھا سکا تھا وہ آج زین کے اندر کے ابلتے لاوے نے سمجھا دی تھی۔

"تم ٹھیک ہو؟"

عثمان نے نرمی سے سوال کیا تو لبنیٰ نے آہستہ سے سر ہلایا۔ عثمان مطمئن ہو کر کپڑے تبدیل کرنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

لبنیٰ نے گہری سانس لی۔ ایک ساتھ کئی آنسو اس کی آنکھوں سے گرے تھے۔ اسے آج شدت سے مس طلعت یاد آئی تھیں جنہوں نے اپنے تجربے کی بنیاد پر اس کے مستقبل کا حال دیکھ کر سمجھایا تھا۔ لبنیٰ کچھ دیر بیٹھی کچھ سوچتی رہی پھر اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

"وقت لگا مگر میں جان گئی ہوں کہ مجھے اب کس سمت میں چلنا ہے۔ اپنوں کو ساتھ لے کر۔ ایک ہم اور سمت بھی ایک رکھنی ہو گی۔"

لبنیٰ نے دل میں عہد کیا جس پر اس نے آنے والی صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی عمل کرنا تھا کہ جب تک امید ہے ہر صبح اولین ہے۔

☆☆

ذرا سا ہجر سہتے ہیں

سنو تم جانتے ہو کیا؟
کہ یہ ریشم کا کیڑا بھی
جو ریشم خود بناتا ہے
مگر ریشم کی حدت سے
وہ اک دن مر ہی جاتا ہے
میری جاں یہ حقیقت ہے
محبت ریشمی بھی ہو
محبت دائمی بھی ہو
جدائی بھی ضروری ہے
وگرنہ اتنی قربت سے
یہ سانسیں رکنے لگتی ہیں
محبت کی ردا میں بھی یہ دم گھٹنے سا لگتا ہے
تو ہمدم ایسا کرتے ہیں
محبت کی لطافت کو
بچانے کے لیے ہم تم
ذرا سا ہجر سہتے ہیں

شازیہ رباب

وہ جو ایک شخص مجھے طعن جاں دیتا ہے
مرنے لگتا ہوں تو مرنے بھی کہاں دیتا ہے

تیری شرطوں پہ ہی کرنا ہے اگر تجھ کو قبول
یہ سہولت تو مجھے سارا جہاں دیتا ہے

تم جسے آگ کا تریاق سمجھ لیتے ہو
دینے لگ جائے تو پانی بھی دھواں دیتا ہے

ناروا لاکھ سہی اپنی امامت لیکن
اس پہ واجب ہے جو صحرا میں اذاں دیتا ہے

جم کے چلتا ہوں زمیں پر جو میں آسانی سے
یہ ہنر مجھ کو مرا بار گراں دیتا ہے

ہاں اگر پیاس کا ڈھنڈورا نہ پیٹا جائے
پھر تو پیاسے کو بھی، آواز کنواں دیتا ہے

اظہر فراغ

شگفتہ جاہ

باتوں سے خوشبو آئے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا!

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک خاتون سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

''جا کر اسے دیکھ لو، امید ہے کہ تم دونوں میں موافقت پیدا ہو جائے گی۔'' انہوں نے ایسے ہی کیا، پھر اس سے شادی کر لی۔ اس کے بعد انہوں نے اس سے موافقت کا ذکر فرمایا۔

فوائد و مسائل:

1۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر عمل کرنے میں برکت ہے۔

2۔ نکاح سے پہلے جائز حدود میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ لینے سے ایک دوسرے کی طرف میلان ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں نکاح کے بعد باہم ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔

3۔ جواز صرف ایک نظر دیکھ لینے کا ہے۔ تنہائی میں ایک دوسرے سے ملاقات کرنا اور طویل بات چیت یا اکٹھے سیر کو جانا وغیرہ یہ سب کام دین کے صریح خلاف ہیں۔ اس حدیث سے ایسے کاموں کا جواز نہیں نکلتا۔

جاپانی کہاوت

جب ہمیں کوئی درخت گرانا ہوتا ہے تو ہم اس کو کاٹتے نہیں ہیں۔ بلکہ اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کے سامنے دوسرے درختوں کو پانی دیتے ہیں توجہ دیتے ہیں، ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور اس درخت کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں اور وہ درخت اپنے آپ مرجھا جاتا ہے پھر اسے گھن لگتا ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے ختم ہو جاتا ہے۔

یونانی کہاوت اور درخت

☆ ایک معاشرہ تب پروان چڑھتا ہے کہ جب وہاں کے عمر رسیدہ افراد یہ جانتے ہوئے بھی پودے لگائیں کہ وہ اپنے لگائے گئے پودوں کے سائے میں کبھی نہیں بیٹھ پائیں گے۔

☆ ایک بیٹی اور ایک درخت، دونوں کا گھر میں ہونا ضروری ہے، کیونکہ درخت ہمیشہ دھوپ میں سایہ دیتا ہے اور بیٹی ہمیشہ درد میں ساتھ رہتی ہے۔

روایت

بنی اسرائیل کی روایات کو نہ تو انہیں سچ مانیں (کیونکہ ہو سکتا ہے وہ جھوٹی ہوں) اور نہ ہی انہیں جھٹلائیں (کیونکہ ہو سکتا ہے وہ سچی ہوں) تاہم ایک بات ضرور ہے کہ بعض باتیں واقعی اس لائق ہوتی ہیں کہ انہیں پڑھا جائے۔ ایسی ہی ایک دلچسپ روایت پیش خدمت ہے۔

''کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام کے ایک چرواہے کی نگرانی میں کچھ بھیڑیں تھیں۔ ایک دن اس کے پاس ایک بھیڑیا آیا اور بولا۔

''مجھے ایک بھیڑ دے دو!''

چرواہے نے حیران ہو کر جواب دیا۔

''یہ بھیڑیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی ملکیت ہیں، میں تو بس ان کا رکھوالا ہوں!''

بھیڑیا بولا: ''تو جا کر حضرت سلیمان سے پوچھ لو کہ کیا وہ مجھے ایک بھیڑ دینے کی اجازت دیتے ہیں؟''

چرواہے نے کہا: ''مجھے ڈر ہے کہ اگر میں چلا گیا تو تم بھیڑوں پر حملہ کر دو گے۔''

شگفتہ جاہ

حسب ستم گر، باتوں سے خوشبو آئے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا!

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک خاتون سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

''جا کر اسے دیکھ لو، امید ہے کہ تم دونوں میں موافقت پیدا ہو جائے گی۔'' انہوں نے ایسے ہی کیا، پھر اس سے شادی کر لی۔ اس کے بعد انہوں نے اس سے موافقت کا ذکر فرمایا۔

فوائد و مسائل:

1۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر عمل کرنے میں برکت ہے۔

2۔ نکاح سے پہلے جائز حدود میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ لینے سے ایک دوسرے کی طرف میلان ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں نکاح کے بعد باہم ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔

3۔ جواز صرف ایک نظر دیکھ لینے کا ہے۔ تنہائی میں ایک دوسرے سے ملاقات کرنا اور طویل بات چیت یا اکٹھے سیر کو جانا وغیرہ یہ سب کام دین کے صریح خلاف ہیں۔ اس حدیث سے ایسے کاموں کا جواز نہیں نکلتا۔

جاپانی کہاوت

جب ہمیں کوئی درخت گرانا ہوتا ہے تو ہم اس کو کاٹتے نہیں ہیں۔ بلکہ اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کے سامنے دوسرے درختوں کو پانی دیتے ہیں توجہ دیتے ہیں، ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور اس درخت کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں اور وہ درخت اپنے آپ مرجھا جاتا ہے پھر اسے گھن لگتا ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے ختم ہو جاتا ہے۔

یونانی کہاوت اور درخت

☆ ایک معاشرہ تب پروان چڑھتا ہے کہ جب وہاں کے عمر رسیدہ افراد یہ جانتے ہوئے بھی پودے لگائیں کہ وہ اپنے لگائے گئے پودوں کے سائے میں کبھی نہیں بیٹھ پائیں گے۔

☆ ایک بیٹی اور ایک درخت، دونوں کا گھر میں ہونا ضروری ہے، کیونکہ درخت ہمیشہ دھوپ میں سایہ دیتا ہے اور بیٹی ہمیشہ درد میں ساتھ رہتی ہے۔

روایت

بنی اسرائیل کی روایات کو نہ تو انہیں سچ مانیں (کیونکہ ہوسکتا ہے وہ جھوٹی ہوں) اور نہ ہی انہیں جھٹلائیں (کیونکہ ہوسکتا ہے وہ سچی ہوں) تاہم ایک بات ضرور ہے کہ بعض باتیں واقعی اس لائق ہوتی ہیں کہ انہیں پڑھا جائے۔ ایسی ہی ایک دلچسپ روایت پیش خدمت ہے۔

''کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام کے ایک چرواہے کی نگرانی میں کچھ بھیڑیں تھیں۔ ایک دن اس کے پاس ایک بھیڑیا آیا اور بولا۔

''مجھے ایک بھیڑ دے دو!''

چرواہے نے حیران ہو کر جواب دیا۔

''یہ بھیڑیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی ملکیت ہیں، میں تو بس ان کا رکھوالا ہوں!''

بھیڑیا بولا: ''تو جا کر حضرت سلیمان سے پوچھ لو کہ کیا وہ مجھے ایک بھیڑ دینے کی اجازت دیتے ہیں؟''

چرواہے نے کہا: ''مجھے ڈر ہے کہ اگر میں چلا گیا تو تم بھیڑوں پر حملہ کر دو گے۔''

بھیڑیا ہنسا اور بولا: ”جب تک تم واپس نہ آجاؤ، میں خود بھیڑوں کی نگرانی کروں گا، اللہ نہ کرے کہ میں خیانت کروں لیکن اگر میں نے خیانت کی تو میں آخری امت کا قرب قیامت والا ایک آدمی بن جاؤں۔“

یہ سن کر چرواہا روانہ ہوگیا۔

چلتے ہوئے چرواہے نے تین عجیب و غریب مناظر دیکھے۔

پہلا منظر:

اس نے ایک گائے کو اپنی ہی بچی کا دودھ پیتے دیکھا! حیران ہو کر اس نے سوچا۔ سبحان اللہ میں نے اس جیسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا، اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟

دوسرا منظر:

آگے بڑھا تو ایسے لوگ دیکھے، جو بوسیدہ کپڑے پہنے ہوئے تھے، مگر ان کے ہاتھوں میں سونے کی تھیلیاں بھری پڑی تھیں! چرواہے نے سوچا۔ یہ بھی بڑی عجیب بات ہے ان کے پاس سونا ہے مگر یہ پھر بھی فقیر نظر آرہے ہیں۔

تیسرا منظر:

کچھ اور آگے بڑھا تو ایک بہتا ہوا چشمہ نظر آیا، پیاس کی شدت میں جیسے ہی قریب پہنچا، تو بدبو نے اسے روک دیا۔ پانی کی بدبو اتنی شدید تھی کہ وہ پیچھے ہٹ گیا اور حیران ہو کر بولا۔ یہ کیسی بات ہے؟ بہتا ہوا پانی اور اتنا گندا؟

حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکمت بھری وضاحت:

بالآخر وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچا اور بھیڑیے کی درخواست بیان کی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا:

”ٹھیک ہے، میں نے اسے اجازت دی کہ وہ ایک بھیڑ چن کر کھالے۔“

چرواہے نے عرض کیا:

”حکم بجا لاتا ہوں، مگر راستے میں تین عجیب چیزیں دیکھی ہیں، ان کی حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا۔

پہلا منظر:

یہ آخری زمانے کی نشانی ہے۔ مائیں اپنی بیٹیوں کو فتنہ میں مبتلا کریں گی تاکہ خود فائدہ حاصل کر سکیں۔

دوسرا منظر:

یہ لوگ ڈاکو اور چور ہیں۔ جو مال حرام سے آتا ہے، اس میں برکت ختم ہو جاتی ہے۔ آخری زمانے میں حرام کمائی عام ہو جائے گی، قناعت ختم ہو جائے گی اور برکت اٹھالی جائے گی۔

تیسرا منظر:

آخری زمانے کے نام نہاد دین دار ہیں۔ دور سے دیکھو تو ان کا لباس دین داری کا ہوگا، مگر جب قریب جاؤ گے تاکہ کچھ سیکھ سکو، تو پاؤ گے کہ وہ دنیا اور خواہشات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

یہ سن کر چرواہے نے تڑپ کر کہا۔

”میں اس زمانے کے فتنے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔“

بھیڑیے کی حیران کن دیانت داری۔

چرواہا واپس آیا تو دیکھا کہ بھیڑیا واقعی بھیڑوں کی نگرانی کر رہا تھا۔

اس نے کہا:

”حضرت سلیمان نے تمہیں اجازت دے دی ہے کہ تم کسی بھی بھیڑ کو چن کر کھا سکتے ہو۔“

بھیڑیے نے بھیڑوں پر نظر دوڑائی اور ایک کمزور، بیمار بھیڑ کو چن لیا۔

چرواہے نے حیرت سے پوچھا: ”تم نے یہی بھیڑ کیوں چنی؟“

بھیڑیا بولا:

”کیونکہ یہ اپنے رب کی تسبیح سے غافل تھی! جو اپنے رب کے ذکر سے غافل ہو، وہ بہت بڑی آزمائش میں ہوتا ہے۔“

اس ماہ کی مسکراہٹیں

فیصلہ

بیوی نہایت غصے میں اپنے شوہر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتی ہے۔

''میں آئندہ تم سے بات نہیں کروں گی۔''

شوہر اطمینان سے جواباً کہتا ہے۔

''ٹھیک ہے۔''

بیوی الجھن بھرے لہجے میں ''کیا تم وجہ نہیں جاننا چاہتے۔''

''نہیں میں تمہارے فیصلے کی قدر کرتا ہوں۔'' شوہر نے جواب دیا۔

دھمکی

شوہر ''میں دوسری شادی کرلوں۔''

بیوی: ''کرلو!''

شوہر۔ ''اجازت ہے؟''

بیوی: ''کیوں نہیں''

شوہر: ''ناراض تو نہیں ہوگی۔''

بیوی: ''بالکل نہیں۔''

شوہر: اچھا میری شادی والے دن کیا پہن کر آؤ گی؟''

بیوی: ''خودکش جیکٹ۔''

علاج

ایک صاحب ماہر نفسیات کے پاس گئے اور کہنے لگے۔

''رات کو سونے لیٹتا ہوں تو ڈرتا ہوں کہ کہیں گھر میں چور نہ آجائیں اس لیے جاگتا رہتا ہوں، صبح آفس جانے سے دل گھبراتا ہے کہ کہیں میرا ایکسیڈنٹ نہ ہوجائے، اس لیے میں گھر میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہوں۔'' ماہر نفسیات یہ سب سن کر بولے۔

''تو اس وقت آپ میرے پاس کیسے چلے آئے کیا آپ کی بیگم نے آپ کو ٹوکا نہیں۔''

''ارے جناب ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔''

''اوہ تو پھر آپ شادی کرلیں آپ بہت سے خوف توہمات سے نجات پالیں گے۔''

وہ صاحب چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد ماہر نفسیات کے کلینک پر ایک صاحب دوڑتے ہوئے داخل ہوئے اور آتے ہی ان کی گود میں چڑھ گئے ان کا حلیہ بے ترتیب اور سانس پھولا ہوا تھا۔

''ارے بھئی آپ کون ہو اور میری گود میں کیوں چھپ رہے ہیں۔''

''ڈاکٹر صاحب میں وہی ہوں جسے رات کو سونے میں چوروں کے خوف سے نیند نہیں آتی تھی اور ایکسیڈنٹ کے ڈر سے آفس نہیں جاتا تھا تو آپ نے مجھے ایک مشورہ دیا تھا۔''

''اچھا اچھا، آپ نے اس مشورے پر عمل کیا۔'' ڈاکٹر صاحب نے سر ہلاتے پوچھا۔

''جی ڈاکٹر صاحب آپ کے مشورے کے مطابق شادی تو کرلی لیکن اب مجھے اپنے گھر جاتے خوف آتا ہے۔''

ماہر نفسیات مسکرایا اور بولا۔

''گڈ آپ نے بہت امپروو کیا ہے۔ بس اب یہاں میرے برابر والی کرسی پر بیٹھ جائیں میں بھی پچھلے پانچ سالوں سے اسی خوف میں مبتلا ہوں۔ میرا بھی ابھی تک علاج چل رہا ہے۔''

☆☆

واصفہ سہیل

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

زرینہ خانم لغاری..................مظفر گڑھ
یوں محبت میں نہ ہم خانہ بدوشوں کو بلا
اتنے سادہ ہیں گھر بار اٹھالائیں گے

آمنہ سعد..................کراچی
شکوہ خدا سے کیا، مقدر میں کچھ نہ تھا
ہم غوطہ زن ہوئے تو سمندر میں کچھ نہ تھا
دیکھا جو دور سے تو سبھی لعل وگوہر تھے
پرکھا جو دوستوں کو تو اکثر میں کچھ نہ تھا

سائرہ قریشی..................چکوال
اداس شاموں کا تم کچھ حساب رکھ لینا
دل حزیں میں محبت کا باب رکھ لینا
نہ بیٹھنا کبھی تنہا اداس موسم میں
نظر کے سامنے دل کی کتاب رکھ لینا

لکی بٹ..................گلشن حدید
تم یہ کیسے جدا ہوگئے
ہر طرف ہر جگہ ہوگئے

فرح شمسی..................نرسری
ہم دوستی میں درختوں کی طرح ہیں محسن
جہاں کھڑے ہوں، مدتوں قائم رہتے ہیں

رومانہ..................نارتھ کراچی
کبھی برسات میں شاداب بیلیں سوکھ جاتی ہیں
ہرے پیڑوں کے گرنے کا کوئی موسم نہیں ہوتا
بہت سے لوگ دل کو اس طرح محفوظ رکھتے ہیں
کوئی بارش ہو یہ کاغذ ذرا بھی نم نہیں ہوتا

ثوبیہ قطب..................کراچی
تھے بہت بے درد لمحے ختم درد عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد

انعم بیگ..................لاہور
اس نے سیکھا نہیں وفا کرنا
ہم نے رکھی نہیں طلب کوئی

فاکہہ سہیل..................کراچی
یہی ہے ناں تمہیں ہم سے بچھڑ جانے کی جلدی ہے
کبھی ملنا تمہارے مسئلے کا حل نکالیں گے

رخشندہ خان..................پشاور
وقت گزرا تو یہ ملال ہوا
ختم اک زندگی کا ایک سال ہوا
کتنی شدت سے کوئی یاد آیا
آج جینا بڑا محال ہوا

ربیعہ واحد..................دوبئی
میں جس سکوں کے لیے شہر شہر پھرتا تھا
وہ منتظر میری آمد کا میرے گھر میں تھا

رخسانہ..................لاہور
تمہارے ہونے کے فیصلے کو میں مقدر پہ چھوڑتا ہوں
اگر مقدر کا کوئی ٹوٹا کبھی ستارہ تو میں تمہارا
یہ کس پہ تعویذ کر رہے ہو، یہ کس کو پانے کے ہیں وظیفے
تمام چھوڑو، بس ایک کرلو جو استخارہ تو میں تمہارا

رضوانہ وقاص..................ہری پور کرلاں پور
اترا ہے رگ و پے میں تو دل کٹ سا گیا ہے
یہ زہر جدائی کہ گوارا بھی کبھی تھا
تتلی کے تعاقب میں کوئی پھول سا بچہ
ایسا ہی کوئی خواب ہمارا بھی کبھی تھا

☆☆

امت الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

شاہ جہاں کے بیٹوں کا عروج و زوال

شاہ جہاں نے ویسے تو کئی شادیاں کیں لیکن صرف دو ازواج سے اولاد ہوئی، ان میں دوسری بیوی ارجمند بانو ممتاز محل سے جو اولاد ہوئی وہی مشہور ہے ارجمند بانو سے بعض تاریخ نویسوں کے مطابق سولہ بچے ہوئے جن میں تخت نشینی کی جنگ کے وقت چار لڑکے اور تین لڑکیاں زندہ تھیں۔

شاہ جہاں کو اپنی ساری اولاد سے محبت تھی لیکن ابتدا ہی سے اس کا رجحان دارا شکوہ، اورنگ زیب اور جہاں آرا کی طرف زیادہ تھا۔

دارا کی ابتدائی تعلیم نہایت اعلا پیمانے پر کی گئی تھی، وہ فقہ، حدیث، قرآن، فلسفہ، منطق وغیرہ کا گہرا مطالعہ کر چکا تھا۔

فلسفہ، مذہب کی تعلیم اس نے دیگر مذاہب کے مطالعے سے حاصل کی تھی، جس سے اسے دیگر مذاہب کے گہرے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ کیونکہ شروع سے ہی اس کی طبیعت میں تحقیق کا مادہ تھا اس میں بعد میں خودسری کی عادت پیدا ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے جو خیال ایک بار اس کے ذہن میں بیٹھ جاتا۔ وہ کبھی بھی نہیں نکلتا تھا۔

مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے بعد اس نے مجوسی، افلاطونی، یونانی، فلسفہ فکر وحدانیت کو تصوف کا نام دے کر ایک نئے طور و طریقہ پر پیش کیا۔ پھر مختلف علوم کے مطالعے کے بعد وہ سمجھ بیٹھا کہ وہ ولی کامل ہو گیا وہ یونانی مکتبہ فکر سوفسطائی کے خیالات کا حامل ہو گیا۔

دربار میں خوشامدی درباری امراء نے اس کا دماغ عرش پر کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عملی زندگی سے وہ دور ہوتا گیا۔ طبیعت میں خودسری، ضد اور لاپروائی بڑھتی گئی۔

شاہ جہاں نے اسے اتنے اونچے درجہ تک چڑھا دیا تھا کہ اس سے پہلے کسی مغل بادشاہ نے اپنے ولی عہد سلطنت کو اتنا اعلا مقام نہیں دیا تھا۔ اسے تخت شاہی کے قریب ایک سونے کی کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دی گئی۔

اس نے بلند مقام کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے تخت و تاج کی راہوں کو ہموار کرنے کے لیے اپنے تمام بھائیوں کو دارالسلطنت سے دور دراز علاقوں میں بھجوا دیا تاکہ اسے من مانی کرنے کا موقع مل سکے اور اس کے جنگجو بھائیوں کو بادشاہ کی موت پر سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکے۔

شجاع کو مشرقی علاقے بنگال کا حاکم مقرر کیا، اورنگ زیب کو دکن میں مرہٹوں اور دکنی ریاستوں کے ساتھ مستقل جنگوں میں الجھا دیا اور مراد کو گجرات کا پورا صوبہ دے دیا گیا۔ چونکہ وہ اپنے بھائیوں کی صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف تھا، اس لیے ان سے خائف رہتا تھا۔

آخری دور حکومت میں شاہ جہاں کو دارا کی بھائیوں کے ساتھ نفرت کا شدت سے احساس ہو گیا تھا وہ اکثر و بیشتر دارا کو نصیحت کرتا تھا کہ بھائیوں کے ساتھ اپنا رویہ بہتر بنائے۔

بادشاہ کی نصیحت کو اس نے سنی ان سنی کر دیا۔ اس کی فطرت اس قدر تبدیل ہو گئی تھی کہ وہ دربار کے اکابر امراء کی بھی توہین کر دیتا۔

شاہ جہاں کو ان مخالفتوں کا اندازہ تھا، وہ امراء کو عموماً یہی مشورہ دیتا تھا کہ وہ دارا کا ساتھ دیں۔ اپنے عہد کے آخری ایام میں شاہ جہاں کو دارا کی کارکردگی اور حکومت کے معاملات میں دخل اندازی کا شدت سے احساس ہو گیا تھا اس کے خیالات دارا کی طرف سے یکسر تبدیل ہو گئے تھے، کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ دارا رفتہ رفتہ اپنے پنجوں کو مضبوطی سے گاڑ رہا تھا چنانچہ اس کی حالت ایک غلام کی سی ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ اسے اتنا ڈر لگنے لگا کہ دارا کہیں اسے زہر نہ دے دے۔ اسی وجہ سے بادشاہ کے سامنے شہزادی جہاں آرا کھانا چکھ کر دیتی تھی۔

دارا کے اس سلوک نے یقیناً شاہ جہاں کو اس سے برگشتہ کر دیا تھا۔ وہ دارا کی قید میں تھا سوائے تین امراء کے کسی بھی شخص کو بادشاہ سے ملنے نہیں دیتا تھا۔ اس من مانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام میں بادشاہ کی موت کی افواہ پھیل گئی اور اس کی اس قدر تشہیر ہوئی کہ شہزادوں نے حصول تخت کی جدوجہد شروع کر دی۔ اور اپنی اپنی فوجوں کو لے کر دارالسلطنت کی طرف بڑھے۔ نتیجتاً ساموگڑھ کے مقام پر 1658ء میں اورنگ زیب اور مراد کی عسکری فوج نے دارا کی شاہی افواج کو شکست دی بعدازاں اسے ایران فرار ہونے کی کوشش کرتے ہوئے ملک جیون نے گرفتار کر کے اورنگ زیب کے حوالے کر دیا۔ اس پر فتویٰ لگا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

دارا کا قتل اڑتالیس سال کی عمر میں ہوا۔ وہ ایک ذہین، عالم، فلسفی، شاعر اور ایک اچھا ادیب تھا۔ ان تمام اوصاف کے باوجود اس میں خودسری، ضد اور سیاسی سوجھ بوجھ کا فقدان تھا۔ اپنے مشیروں کا مشورہ بھی اس کے لیے قابل قبول نہ تھا، اس کی ضد اور ہٹ دھرمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاہ جہاں کا یہ عالم بیٹا تخت و تاج کی حسرت لیے موت سے ہم آغوش ہو گیا۔

شاہ جہاں کا دوسرا لڑکا شجاع تھا وہ 1616ء میں پیدا ہوا اور بچپن ہی سے جہانگیری محل میں رہا اور نور جہاں کی زیر نگرانی تربیت پائی۔ شجاع کو بنگال کا زرخیز علاقہ حکومت کرنے کے لیے دیا گیا اور وہاں وہ بیس سال تک حکومت کرتا رہا، وہ بہادر، نڈر اور بہترین جنرل تھا لیکن بنگال کی زرخیزی اور اس کے اپنے خزانے کی فراوانی نے رفتہ رفتہ اس سے یہ خوبیاں چھین لیں، وہ نفس کا غلام ہو کر رہ گیا تھا۔ زیادہ وقت عیش و عشرت میں گزارتا۔

اپنی اس عادت کی بنا پر تمام سنجیدہ دوستوں کی ہمدردیوں سے محروم ہو گیا۔ شاہ جہاں کی رائے کے مطابق اس میں صرف ایک اچھائی تھی اور وہ اس کی سیر چشمی تھی۔

بادشاہ کی بیماری کے دوران شجاع نے سب سے پہلے اپنی خود مختاری اور بادشاہت کا اعلان کیا اور ایک کثیر فوج اور بہترین توپ خانہ تیار کر لیا۔ راجہ جے سنگھ اور سلیمان شکوہ سے مقابلہ کے دوران شاہی فوج شجاع سے مقابلہ کرنے سے گریز کرتی رہی کیونکہ وہ اتنی بڑی فوج سے مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس پر دھوکے سے حملہ کیا گیا اور وہ بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔

اس تباہی کا نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ اس کے بعد اس کی فوج کسی بھی میدان میں جم کر نہ لڑ سکی اور آخر میں اورنگ زیب کے ہاتھوں 1661ء میں تباہ کن شکست کھا کر بنگال سے اراکان کی طرف چلا گیا جہاں اس کی زندگی اور موت کا پتا نہ چل سکا۔

شاہ جہاں کا تیسرا لڑکا اورنگ زیب تھا۔ بچپن ہی سے وہ شاہ جہاں کے سایہ عاطفت میں پلا۔ شاہ جہاں اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس وقت جب ممتاز محل کے یہاں اورنگ زیب کی ولادت ہوئی اور جہانگیر کو اس کی اطلاع دی گئی تو جہانگیر نے فوراً کہا۔

"اگر یہ بچہ زندہ رہا اور بادشاہ بنا تو تمام ہندوستان کو فتح کر لے گا۔"

جہانگیر کے حکم سے ہی اس کا نام اورنگ زیب رکھا گیا۔

آٹھ سال کی عمر میں اورنگ زیب کو یہ خدمت دی گئی کہ وہ غسل خانہ میں بادشاہ کو مور چھل جھلے۔ غسل خانہ وہ جگہ تھی جہاں حکومت چلانے کے لیے اعلاترین اور رازدارانہ فیصلے کیے جاتے تھے ان محفلوں میں اہم ترین اور مخصوص امراء کو مشورے کے لیے بلایا جاتا تھا۔

اورنگ زیب کی عمر جب چودہ سال تھی تو اس نے ایک مست ہاتھی کا تنہا مقابلہ کیا اور اپنی بے مثل بے باکی اور بہادری کا عملی ثبوت دیا، یہ پہلا موقع تھا کہ دارا کو اورنگ زیب کے مقابلے میں زک اٹھانی پڑی۔

سترہ سال کی عمر میں اورنگ زیب کو دکن جیسے صوبے کا گورنر بنا کر بھیج دیا گیا اس وقت اس کی شادی نہیں ہوئی تھی اس طرح ابتدا ہی سے اسے خون ریز جنگوں کا عملی تجربہ ہو گیا اور ایک ہی سال میں اس کی بے مثال ثابت قدمی، استقلال بہادری، سیاسی سوجھ بوجھ اور انتظامی قابلیت کا خواص و عام کو اندازہ ہو گیا تھا۔

داراکو اس سے حسد پیدا ہونا شروع ہو گیا ہو اور اس نے جہاں آرا کے ساتھ مل کر اورنگ زیب سے بادشاہ کو پھیرنے کی سعی کی۔

دارالسلطنت میں بیٹھ کر دارا نے جہاں آرا کی مدد سے بادشاہ کو اورنگ زیب سے برگشتہ کر دیا تھا اور بعد میں خود بادشاہ کی اورنگ زیب پر سختی کی وجہ سے 1644ء میں اورنگ زیب نے تارک الدنیا ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا چنانچہ جب بادشاہ کو اس فیصلے کی اطلاع دی گئی تو وہ بے حد ناراض ہوا اور اسے دکن کی گورنری سے معزول کر دیا بلکہ اس کے تمام عہدے اور سالانہ تنخواہ بھی بند کر دی۔ لیکن بادشاہ کو جلد اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور 1645ء میں وہ اچانک خود یا جہاں آرا کی فہمائش پر اپنے سابقہ عہدوں پر بحال کر دیا گیا۔

دکن کی گورنری کے دوران اورنگ زیب نے جس شجاعت اور مردانگی کا مظاہرہ کیا اس کی دھاک تمام علاقوں میں پھیل گئی اور کوئی بھی اس کے مقابلے میں آنے کی جرات نہ کر سکا۔

اسی دوران دارا اور اورنگ زیب کے درمیان شدید تر اختلافات کی وجہ سے دربار و حرم میں گروہ بندی شروع ہو گئی۔ دونوں شہزادوں کے ساتھی اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔ اور دونوں ہی خود کو غیر محفوظ سمجھتے تھے۔ ان میں ایک تو اپنی زندگی کی جدوجہد میں مصروف تھا اور دوسرا اپنے تخت و تاج کے حصول میں سرگرم تھا۔ ایک طرف اورنگ زیب کو کلی یقین تھا کہ دارا کی تخت نشینی کا جشن اس کے قتل کے ساتھ خاندانی روایات کے مطابق منایا جائے گا۔

دوسری طرف دارا، اورنگ زیب کے وجود کو اپنی تخت نشینی کے لیے عظیم خطرہ سمجھتا تھا۔ بادشاہ، دارا کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی مانند تھا ان دونوں کے درمیان یہ مخاصمت ساموگڑھ کی جنگ کے بعد تک جاری رہی، یہاں تک کہ دارا گرفتار ہوا اور الحاد کے جرم میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

شاہ جہاں کا چوتھا لڑکا مراد تھا۔ وہ نڈر، جری اور بہادر شہزادہ تھا۔ جنگوں میں اس کی شجاعت بے مثل تھی۔ ان تمام اوصاف کے باوجود وہ شباب کی سرگرمیوں میں گم رہا۔

مراد کی ان تمام خوبیوں کے علاوہ جذباتی عادات، لا ابالی پن اور سیاسی سوجھ بوجھ کے فقدان اور جنگی چالوں کے نہ سمجھنے کی کمی کی وجہ نے اس کی تمام اچھائیوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ قندھار کی مہم پر جب اسے بھیجا گیا تو اس کی تمام خرابیوں کا ثبوت اس مہم سے مل گیا اس نے اس مہم میں شروع ہی سے لاپروائی دکھائی اور کوئی بھی تکلیف اٹھانے سے گریز کرتا رہا اور بادشاہ سے اجازت حاصل کیے بغیر مہم سے لوٹ آیا۔ شاہ جہاں اس کی اس حرکت کی وجہ سے سخت ناراض ہو گیا اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار مراد کو شرابی کہہ کر کرتا۔

جب مراد نے شاہ جہاں کی موت کی خبر سنی تو اپنی خود مختاری اور شہنشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ ساموگڑھ میں شاہی افواج پر فتح یابی اور آگرہ پر قبضہ کے بعد مراد کے ذہن میں تبدیلی ہونا شروع ہو گئی۔ اس جنگ میں کامیابی وہ اپنی بہادری کی مرہون منت سمجھنے لگا، چنانچہ اس کے بعد اس سے ایسی حرکتیں سرزد ہونا شروع ہو گئیں جو اس معاہدہ کے جو اورنگ زیب اور اس کے درمیان طے پایا تھا، سراسر خلاف تھیں۔

اورنگ زیب نے مراد کی اس حرکات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے گرفتار کر کے گوالیار کے قلعے میں بھیج دیا۔ بعد میں اس نے جیل سے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور اپنے دیوان علی قلی خان کے قتل کے الزام میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس طرح آخر میں صرف اورنگ ہی شاہ جہاں کا لڑکا رہ گیا جو بغیر پس و پیش یا کسی تردد کے ہندوستان کا بادشاہ اورنگ بیگ بنا جس کی پیش گوئی جہانگیر نے کی تھی۔

(از عالمگیر اور سلطنت مغلیہ کا زوال۔ تحقیق محمد ظہیر)

عارفہ رباب..... کراچی

☆☆

بقیہ خط آپ کے

زرنم اف کتنا پیارا نام ہے کاش حمیرا بہن اس کا مطلب لکھ دیتیں۔ کہانیاں تقریباً تمام ملتی جلتی تھیں۔ سب کی شادیاں ناممکن ہو چکی تھیں لیکن رمضان شریف کی برکت سے سب کی بیڑیاں پار لگ گئیں۔ انجام خوش گوار ہوئے۔

باتوں کی خوشبو نے مہکا دیا۔ مسکراہٹیں لاجواب۔ سب مسکراہٹیں پسند آئیں لیکن حیران نمبر لے گئی اور کمال نگاہ بھی پسند آئی۔

تاریخ کے جھروکے لاجواب سلسلہ ہے۔ کافی دن پہلے میں نے تاریخ کے جھروکے لکھا تھا۔ اب تک چھپا نہیں کیا وجہ ہے آپ ہماری تحریریں ردی کی ٹوکری میں نہ ڈالا کریں ہم بڑی محبت سے لکھتے ہیں۔

زرینہ بہن! آپ کا شکوہ سر آنکھوں پر شکوہ اپنوں سے ہی کیا جاتا ہے لیکن آپ کے جواب تاخیر سے موصول ہوئے اس لیے شامل نہ ہو سکے۔ اس ماہ شامل ہیں۔ پیاری بہن ہمیں اپنی تمام قارئین عزیز ہیں لیکن جو قارئین باقاعدگی سے ہر ماہ شرکت کرتی ہیں۔ ان سے خصوصی لگاؤ ہوتا ہے۔

آسماء بنت محمد فیاض خان شہر کراچی سے ایک بار پھر شریک محفل ہے

فروری مارچ 2025 کا ماہنامہ شعاع دیکھ کر پڑھ کر خوشی کی انتہا ہی نہ رہی کی محفل کی زینت۔ ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ اس دفعہ بھی ہماری حوصلہ افزائی کی گئی۔ بہت ہی اچھے لگے ہماری دل کو یہ خوب صورت الفاظ، خوش آمدید، اپنے نام کا خط پڑھنے لگی تو مجھے خوشی نہیں بلکہ ڈبل خوشی ہوئی کہ میری بڑی بہن عینا عمر خان نے بھی میری حوصلہ افزائی کی۔ اور ہم دونوں بہنیں ایک ہی گاؤں کے رہائشی ہیں۔ اس کے ساتھ میں آپ کو یہ بھی بتا رہی ہوں کہ آپ کی نند کی بیٹی کی میرے فرسٹ کزن کے کزن (شوکت) کے ساتھ شادی ہوئی ہے۔

اور ساتھ میں ناراضی ادارے سے بھی ہو رہی تھی کہ میں نے اتنی لگن محبت کے ساتھ کہانی لکھی لیکن وہ بھی ردی کی ٹوکری کی نذر ہوئی۔ لیکن میں بھی ارادے کی پکی اور ضدی پٹھانی ہوں۔ میں نے آج تک کبھی بھی ہمت نہیں ہاری۔ ہمت، اللہ کا کرم خاص ہے مجھ پر۔ شکوے گلے ہزار مگر کوئی بات نہیں۔ کیونکہ شکوے گلے لوگ اپنوں سے ہی کیا کرتے ہیں۔ غیروں سے نہیں۔ غیروں پر کرم، اپنوں پہ ستم یہ دنیا کا دستور رہا ہے۔

ناتا (رشتہ) جوڑا ہے بہت ہی اعلیٰ، قرۃ العین صاحبہ کی (ناشکری عورت) کے بہت خوب صورت ڈائیلاگ کو جسم پر لگے تلوار کے زخموں کو وقت کا مرہم بھر دیتا ہے مگر زبان کے خنجر سے لگے روح کے زخم تاحیات رہتے ہیں۔

اگر سچ کہوں تو تمام رسالے بڑی معلوماتی فراہم کرتے ہیں لیکن ان کو بری آنکھ سے نہیں، دل و دماغ کی آنکھ سے پڑھنا چاہیے۔ تو تب ہی انسان کی سمجھ میں بات آئے گی۔ باقی ساری قارئین بہنوں کے خطوط کی بات کریں تو یہ علمی خزانے کی مانند ہے میں نے کافی کچھ انہی خطوط کے ذریعے حاصل کیا ہے اور اب تک یہی کوشش جاری و ساری ہے اور آپ کے محبت بھرے جوابات کی بات ہی کچھ اور ہے۔

پیاری اسما! آپ نے بڑی خوب صورت بات لکھی ہے واقعی دل اور دماغ کی آنکھ کھلی ہو تب ہی اچھی بات سمجھ میں آتی ہے۔ دوسری بات جو ہمیں بہت اچھی گئی۔ آپ کا حوصلہ کہ آپ ہمت ہارنے والی نہیں ہیں۔ پٹھانی ہیں واقعی پٹھان سے بڑھ کر کوئی محنت نہیں کر سکتا ہے نہ ہی ہمت اور حوصلہ میں اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

آپ افسانے شائع ہونے کا انتظار نہ کریں۔ ہمیں مزید تحریریں بھجوائیں۔

یسریٰ ملک نے کندیاں میانوالی سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

دن کتنی جلدی گزر جاتے ہیں۔ ابھی کل کی بات لگتی ہے کہ پچھلی عید پر میں نے سروے میں حصہ لیا تھا اور وہ چھپ بھی گیا پھر چار ماہ مسلسل خط لکھے لیکن اس کے بعد طبیعت اتنی خراب ہوگئی کہ خط لکھنا تو دور کی بات چائے کا کپ اٹھا کر خود سے نہیں پی سکتی تھی۔

اس بار سردیاں بہت تکلیف میں گزاری ہیں۔ سب قاری بہنوں سے گزارش ہے کہ میرے لیے بھی دعا

کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی شفا دے دے۔ کیا پتا کسی بہن کی دعا میرے حق میں قبول ہو جائے۔ بہن رضوانہ وقاص کی بیماری کا پڑھتی ہوں تو دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔ خط آپ کے میں صدف ناصر! اللہ آپ کے بچوں کو مزید کامیابیاں نصیب فرمائے آمین۔ تسنیم کوثر، فرخندہ سلیم، رضوانہ وقاص، ناہید اقبال، زاہد شوکت، ایس ایچ ایس، عینا عمر خان، صائمہ غلام رسول، انیقہ مرید سب کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ صائمہ شادی مبارک ہو۔ اللہ آپ کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دے آمین۔ اس بار دونوں رسالوں میں گوشی جمال کا خط نہیں تھا۔ محفل پھیکی لگی ان کے بغیر۔

پیاری یسریٰ! تہہ دل سے دعا گو ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامل صحت عطا فرمائے۔ بہنوں سے بھی درخواست ہے کہ بہن یسریٰ کے لیے دعا کریں۔ گوشی جمال کا تبصرہ موصول نہیں ہوا، ورنہ ضرور شائع کرتے۔

جویریہ حیدر ملغانی......سوکڑ تونسہ شریف

نیا سال اور اس کا پہلا شمارہ، ماڈل مسکراتی ہوئی دل کش لگی۔ آج کل ٹائٹل بہت اچھے آرہے ہیں۔

2024 کی خوشی کی بات کہ جویریہ حیدر بھی رائٹر بن گئی۔ بلے بھئی بلے۔ زبردست مبارکاں جی مبارکاں، نومبر میں چھپنے والی "نایاب لوگ" یہ کہانی بہنوں کو پسند آئی۔ "تعمیری اور مثبت" بہت شکریہ تمام بہنوں خصوصاً ادارہ خواتین کا جنہوں نے مجھے اس قابل جانا۔

برکت اور نام اپنا کو دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی فوراً صفحہ 116 کھولا۔ افسانے پہ لکھے "دعا ایوب" کو دیکھ کے صحیح معنوں میں پتا چلا کہ رنگ میں بھنگ ڈالنا، غبارے سے ہوا نکلنا، مزا کرا کر ہونا، سٹی گم ہو جانا، خوشی ختم ہونا، سانپ سونگھنا جیسے الفاظ جو لکھتے اور پڑھتے ہیں جب خود پر گزرتے ہیں تو کیسا لگتا ہے۔

کوئی بات نہیں ایسا ہو جاتا ہے کبھی کبھی (یہ اور بات ہے کہ آئندہ ایسا کبھی نہ ہو، آمین)

میری بیٹی عروہ کہہ رہی ہے امی آپ شکایت کر دیں رسالے والوں سے۔ پر امن شکایت درج کروا رہے ہیں نوٹ کرلیں۔ ہاہاہا

سروے ہمیشہ کی طرح شان دار رہا۔ صدف ناصر جیسی خوش بختی اور سعادت مندی اللہ ہمارے نصیب میں بھی لکھ دے (آمین)

پیاری فرخندہ سلیم ویل ڈن۔ کتنی محنت اور عرق ریزی سے پورے سال کے شماروں پر تبصرہ کیا۔ خوب لگے رہو۔ رضوانہ وقاص اللہ آپ کو صحت سے نوازے آمین۔ سلمیٰ مسرت مجھے آپ میں اپنے خاندان کی نوے فیصد ساسوں کا عکس نظر آیا۔ اللہ آپ کو اپنے بچوں کے ساتھ خوش باش رکھے۔

تسنیم کوثر اور ناہید اقبال ماشاءاللہ آپ کے بچوں کی خوش بختی سلامت رکھے۔ خط آپ کے زبردست بھئی زبردست۔ جویریہ حیدر کے بغیر محفل ادھوری لگی۔

میرے رائٹر بننے کی خوشی میں ہمارے سوکڑ شہر کا مشہور سیٹھ نواز کا اخروٹی حلوہ اور تونسہ شریف کا پشکو کا حلوہ دودھ پتی چائے کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ تمام بہنیں منہ میٹھا کرلیں۔

ماہ الملوک نگہت سیما پلیز زحل کے ساتھ ساتھ ہم پر بھی رحم کریں۔ ایک تو رسالے اتنے لیٹ ملتے ہیں۔ جب تک آتے ہیں تو پھر تبصرہ لکھنے اور انہیں پوسٹ کرنے کے مزید مسائل۔ ہم کیا کریں تونسہ ایجنسی والے کچھ کرم کردیں۔ جب بہنیں لکھتی ہیں کہ انہیں شعاع 29 کو مل جاتا ہے تو قسم سے رشک آتا ہے۔

رسالے کل آئے ہیں۔ آج اتوار ہے ڈاک خانہ بند۔ سوموار تک 13 تاریخ ہو جائے گی۔ ابھی رسالہ نہیں پڑھا۔ بچوں کی چھٹیاں ہیں۔ گھر میں اودھم مچا ہوا ہے۔

پیاری ریحانہ چوہدری پیاری گوشی اور ثمینہ اکرم کے سروے کے بغیر سال نومبر تھا۔ حاضری لگوائیں۔

پیاری جویریہ حیدر! سب سے پہلے تو معذرت کہ آپ کا جو آپ نے فروری کے شمارے کے لیے لکھا تھا۔ تاخیر سے موصول ہونے کے باعث شامل نہ ہو سکا۔ اس ماہ شامل ہے۔

آپ کے افسانے پر سہواً دعا ایوب کا نام لگ گیا۔ اس کا ہمیں بھی بے حد افسوس ہے۔ آپ بھی لبنیٰ آصف کی طرح فانٹ ہمیں دونوں پرچوں کے لیے افسانے لکھ کر

ریکارڈ بنادیں۔
ماہ رخ بلند سواتی نے کراچی سے لکھا ہے
کیسے ہیں آپ سب؟ شعاع میں پھر سے حاضر ہوگئی، میں نے اپنا خط بھیجا تھا 2024 ستمبر میں لیکن کسی نے ویلکم ہی نہیں کیا۔ خیر مجھے تو تبصرہ کرنا ہے۔ تو اب آتے ہیں تبصرے کی طرف، ٹائٹل اچھا نہیں تھا یا کہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ کوئی پیارا سا ٹائٹل دیا کریں پلیز۔ اور ہاں آج کل کی کہانیاں بھی اچھی نہیں ہیں۔ 2016، 2017 کے رسالے میں کیسے اچھی اچھی اور سبق آموز کہانیاں ہوتی تھیں۔ میں تنقید نہیں کر رہی صرف بتا رہی ہوں۔ پیر کامل، آب حیات، جنت کے پتے جیسی کہانیاں جن سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ ام ہانی آپ بہت بہت زیادہ سے بھی بہت زیادہ خوب صورت کہانیاں لکھتی ہیں۔
''بوجھ بانٹ لیتے ہیں، بہت اچھی لگی۔ فجر نام پسند آیا اور فجر کا کردار فجر ڈاکٹر بننا چاہتی تھی نہیں بن سکی لیکن ڈاکٹر بننا اس کے نصیب میں نہیں تھا۔ واپسی اچھی سبق آموز کہانی تھی کتنی نادان ہوتی ہیں ایسی لڑکیاں جو زندگی کے سفر کے لیے ایسے راستے کا انتخاب کرلیتی ہیں جہاں سے واپسی ناممکن ہوجاتی ہے۔
حبیبہ شیراز کی کہانی عید ملن بہت خوب۔ زبردست۔ مہر جہاں اتنا لالچ بھی نہیں کرنا تھا کہ بیٹی باہر جائے گی پاکستان سے۔
''ام ایمان قاضی'' آسیہ رزاقی'' عمیرہ احمد، نمرہ احمد، فلک تنویر'' نگہت سیما'' آسیہ رئیس خان'' سمیرا سرفراز، حسنہ حسین، جبیں چیمہ، امت العزیز شہزاد، نعیمہ ناز، سمیرا حمید،'' عفت سحر''، ام ہانی ان سب سے ناول لکھوائیں پلیز۔
زکوۃ بہت زبردست، یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ اللہ نے رشتہ داروں کو دینے کا حکم سب سے پہلے فرمایا ہے۔ حمد، نعت بہت پسند آئی ماشاء اللہ'' پیارے نبی کی پیاری باتیں سب ہی پیاری ہوتی ہیں اور میں بہت غور سے پڑھتی ہوں جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے کبھی کبھار پڑھ لیتی ہوں، روشن ہے صبح عید، عفت سحر، مصباح علی سید، شائلہ دالعباد، کنول خان کے جوابات اچھے لگے۔ خط آپ کے سب کے تبصرے اچھے ہوتے ہیں۔
تسنیم کوثر، یسریٰ ملک، صدف ناصر ریحانہ چوہدری، مسرت حسین، عدینہ لغاری، انیقہ مرید، انیسہ عائش، فرخندہ سلیم، عینا عمر، میشے علی، رضوانہ جی، زرینہ خانم، جویریہ حیدر، ام ہادیہ، زینب نور اور نام یاد نہیں آرہے ان سب کے تبصرے بہت اچھے ہوتے ہیں آنٹیوں باجیوں آپیوں، بچیوں (ہاہاہا) بچی تو میں خود ہوں پندرہ سال کی، ثانیہ بلال اور علیزہ بلال جو کہ سنو ان سے ہیں مجھے آپ دونوں سے دوستی کرنی ہے لڑکیوں، فرخندہ سلیم میں ماہ رخ ہوں کرن والی پلیز نوشی کو میری طرف سے سالگرہ مبارک اور پیار دینا اور اس کو بولو کہ شعاع میں حاضری دو اور حسینہ راؤ کو بھی۔ کچھ پرسنل پرابلم کی وجہ سے میں نے کرن میں لکھنا چھوڑ دیا ہے۔
''عید کے رنگ، محبتوں کے سنگ سب کے جوابات پسند آئے۔ قارئین مجھے ویلکم ضرور کہنا۔ میں پشتو میں لکھی گئی غزل جیسی ہوں، ان اردو ادب والوں کو کہاں سمجھ میں آؤں گی۔
پیاری ماہ رخ! محبت کی زبان سب کی سمجھ میں آتی ہے۔ آپ پشتو میں لکھی غزل ہوں یا اردو ادب کا شاہکار۔ ہم پشتو نہیں جانتے مگر اتنا ضرور جانتے ہیں کہ آپ بہت ذہین ہیں اور بہت پیارے دل کی مالک ہیں۔ محبت کرنے والا دل...... یقین جانیے آپ کا خط پڑھ کر ہمیں حیرت ہوئی کہ پندرہ سال کی بچی نے اتنا پیارا خط لکھا۔ آپ باقاعدگی سے خط لکھیں۔ ہمیں خوشی ہوگی۔
ہم آپ کو شعاع کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں اور ہمیں یقین ہے ہماری قارئین بھی آپ کو ویلکم کہیں گی۔

☆☆

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

مکھنی دال چنا

اجزاء:

چنے کی دال	ایک پاؤ
لال مرچ	ڈیڑھ چمچہ
ہلدی	ایک چوتھائی چمچہ
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	دو عدد
تیل	دو چمچے
مکھن	آدھا کپ
تیز پات	دو عدد
ہری مرچ	تین سے چار
لہسن	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب پسند

ترکیب:

چنے کی دال ابال لیں۔ پیاز باریک کاٹ لیں، ہری مرچیں اور لہسن بھی باریک کاٹ لیں۔ پیاز کو تیل اور مکھن میں سنہری تل لیں۔ زیرہ، تیز پات، لہسن، لال مرچ، ہلدی، دھنیا اور نمک ڈال کر بھون لیں ذرا سا پانی ڈالیں، بھن جانے پر اس میں چنے کی ابلی ہوئی دال اور ہری مرچ شامل کر کے بھون لیں۔ مکھن اور تیل اوپر آنے پر چولہے سے اتار لیں۔

مزے دار مکھنی دال تیار ہے باریک کٹی ادرک ہری مرچ ہرا دھنیا اور لیموں سے گارنش کریں چاہیں تو اوپر سے ایک چمچہ مکھن اور ڈال دیں۔

کلر فل چکن بوٹی اسٹک

ضروری اشیاء:

چکن	آدھا کلو
شملہ مرچ	ایک عدد
ٹماٹر	ایک عدد
پائن ایپل	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
سفید مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
کیچپ	دو کھانے کے چمچے
کٹی سیاہ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
لہسن، ادرک	ایک چائے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

ایک برتن میں بغیر ہڈی کی چکن پہ نمک، پسی ہوئی سفید مرچ، کیچپ، کٹی سیاہ مرچ، لہسن، ادرک اور بھنا زیرہ لگا کر 30 منٹ تک میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ شملہ مرچ اور ٹماٹر کے چوکور ٹکڑے کاٹ لیں۔

اس کے بعد اسٹکس میں ترتیب سے میرینیٹ کی ہوئی چکن، شملہ مرچ، ٹماٹر اور پائن ایپل پرو کر پین میں تیل گرم کر کے اسٹکس کم تیل میں تل لیں۔ سرونگ پلیٹ میں رکھ کر کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

چٹ پٹے کریلے

ضروری اشیاء:

کریلے	چار۔ پانچ عدد
نمک	حسب ذائقہ
پیاز	دو عدد
ادرک	ایک انچ کا ٹکڑا
لہسن	پانچ جوے
ثابت لال مرچ	چار عدد
دھنیا ثابت	ایک کھانے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
سفید تل	ایک چائے کا چمچہ
تیل	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
پسے ٹماٹر	چوتھائی کپ

گڑ	دو کھانے کے چمچے
املی کا گودا	دو کھانے کے چمچے

ترکیب:

سب سے پہلے کریلوں کو اچھی طرح دھو لیں اور چھیل کر لمبائی میں آدھا کاٹ کر بیج صاف کر لیں اور ان کے پتلے ٹکڑے کاٹ لیں۔ اس کے بعد نمک لگا کر 15-10 منٹ تک کے لیے چھوڑ دیں۔ اس کے بعد پانی سے اچھی طرح دھو لیں اور نچوڑ کر سارا پانی نکال دیں۔ پیاز کو چھیل کر باریک کاٹ لیں۔ ثابت سرخ مرچوں، ثابت دھنیا، زیرہ اور تل کو درمیانی آنچ پر توے پر بھون لیں اور ہلکا سنہرا کر لیں۔ بھوننے کے بعد ٹھنڈا کر کے موٹا کوٹ لیں ایک پین میں تیل گرم کریں اور اس میں کریلوں کے سلائس ڈال کر چار پانچ منٹ تک تل لیں اور ہلکا سنہرا کر لیں۔ اس کے بعد پیاز شامل کریں اور تین چار منٹ تک بھونیں۔ لہسن، ادرک کا پیسٹ شامل کرنے کے چمچہ چلاتے ہوئے تقریباً دو منٹ تک بھونیں۔ اس کے بعد پسے ہوئے ٹماٹر شامل کریں اور مزید چند منٹ تک پکائیں۔ اس کے بعد تیار کیا ہوا کٹا ہوا مسالہ شامل کریں ساتھ ہی گڑ، املی کا گودا اور نمک ڈال دیں۔ اچھی طرح چمچہ چلانے کے بعد آنچ ہلکی کر دیں اور ڈھک کر مزید پانچ منٹ تک پکائیں۔ مزیدار چٹ پٹے کریلے تیار ہیں۔

گرین مسالہ چکن

ضروری اشیاء:

مرغی	تین پاؤ
لہسن، ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
گرین چٹنی	چار کھانے کے چمچے
فریش کریم	چھ کھانے کے چمچے
دہی	آدھا کپ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ثابت دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
مکھن	دو کھانے کے چمچے
تیل	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:

پیالے میں پسا ہوا لہسن، ادرک، گرین چٹنی، ہرا دھنیا، پودینہ اور ہری مرچ، فریش کریم، دہی، زیرہ، دھنیا (کوٹ لیں) اور نمک مکس کر کے گوشت کو مسالے لگا کر 3-2 گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پتیلی میں تیل اور مکھن گرم کر کے گوشت فرائی کر لیں، دھیمی آنچ پر ڈھک کر پکائیں۔ گوشت گل جائے تو بھون لیں۔ دہی کی چٹنی، پیاز اور نان کے ساتھ سرو کریں۔

لوکی کی برفی

ضروری اشیاء:

لوکی	آدھا کلو
گھی	آدھا کپ
چینی	آدھا کپ
الائچی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
کھویا	آدھا کلو
بادام پستے	آدھا کپ
کیوڑا	آدھا چائے کا چمچہ
گرین فوڈ کلر	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب:

ایک کڑاہی میں گھی گرم کر کے اس میں کدوکش کی ہوئی لوکی ڈال دیں جب لوکی کا پانی خشک ہو جائے تو چینی ڈال دیں اور ہرا رنگ ڈال کر لوکی کو اتنا بھونیں کہ اس کا کچا پن ختم ہو جائے۔

اس میں کھویا شامل کر دیں اور بادام، پستے کی آدھی مقدار اور الائچی پاؤڈر شامل کر کے کیوڑا ڈال دیں اور اتنا بھونیں کہ لوکی اور کھویا یکجان ہو جائے۔

اس آمیزے کو ٹھنڈا کر کے من پسند انداز دیں اوپر سے بچے ہوئے بادام پستے سجا کر پیش کریں۔

☆☆

ادارہ

خوب صورت بننے

وٹامن ڈی اور سورج

بدلتے موسم معمولات زندگی میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں وہیں جلد پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں یہ تبدیلی بہت محسوس ہوتی ہے کیونکہ سورج کی تیز شعاعیں جلد کو نہ صرف سنولا دیتی ہیں بلکہ چہرے کی شادابی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ بہت سے لوگوں کی جلد اتنی حساس ہوتی ہے کہ جل جاتی ہے اور کھردری ہو جاتی ہے۔

دھوپ انسانی صحت کے لیے مفید بھی ہے کہ یہ وٹامن ڈی کی فراہمی کا ذریعہ ہے جو کیلشیم کو ہونے میں مدد دیتا ہے۔ اس کی کم مقدار ہڈیوں اور پٹھوں کے درد، بالوں کا گرنا اور کمزوری کی وجہ بنتی ہے لہٰذا سورج کی شعاعوں سے مکمل پرہیز کرنا انسانی صحت کے لیے مضر بھی ہو سکتا ہے۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہفتے میں کچھ دن دس سے تیس منٹ تک دھوپ کی شعاعوں سے مستفید ہوں۔

دھوپ کی بہترین شعاعیں حاصل کرنے کا وقت دوپہر کا ہے کیونکہ اس وقت سورج کی الٹراوائلٹ بی (UVB) شعاعیں سب سے زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔ جب سورج کی شعاعیں جسم پر پڑتی ہیں تو انسانی جسم قدرتی طور پر وٹامن ڈی بناتا ہے۔

وٹامن ڈی اور جلد کی رنگت (ٹونز)

جلد کی رنگت وٹامن ڈی کے حصول میں ایک دلچسپ صورت پیش کرتی ہے۔ یعنی صاف رنگ کے لوگوں کو دھوپ سے وٹامن ڈی حاصل کرنے کے لیے گہرے رنگ کے لوگوں سے کم وقت درکار ہوتا ہے۔

غذا اور وٹامن ڈی

وٹامن ڈی کو حاصل کرنے میں چربی والی مچھلی مثلاً سالمن اور ٹونا، دودھ اور اناج، مشروم اور انڈے کی زردی شامل ہے۔ اس کے علاوہ پنیر اور کاڈلیور آئل بھی وٹامن ڈی حاصل کرنے کے بہترین ذرائع میں شامل ہے۔ کاڈلیور آئل کے کیپسول باآسانی بازار میں بھی دستیاب ہیں۔

جلد کی خوب صورتی اور تازگی برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہماری صحت اچھی ہو۔ ہم دودھ اور گوشت کے علاوہ پھلوں، سبزیوں اور اناج کو بھی متوازن غذا کے طور پر لیں۔ پانی کی مقدار بھی مقررہ استعمال کریں، خاص کر گرمیوں کے موسم میں اس کی کم مقدار نا صرف ہماری جلد کو بلکہ نظام ہاضمہ کو بھی متاثر کر سکتی ہے۔ کسی بھی ایک قدرتی جز کی کمی ہمارے چہرے اور رنگت پر واضح نظر آتی ہے۔ لہٰذا قدرت کی عطا کردہ نعمتوں کو بوجھ نہ سمجھیں اور اس سے مستفید ہوں۔

دھوپ سے جھلسی جلد کے لیے

ٹماٹر کے جوس میں سائٹرک ایسڈ جلد کے دھبوں اور جلنے کے نشانات کو دور کر کے نمی دیتا ہے۔

ایک چمچہ ٹماٹر کا رس اور دو چمچے دہی اچھی طرح ملا کر اپنے چہرے پر لگائیں اور ایک گھنٹے بعد ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔ دھوپ سے سنولائی ہوئی جلد کے لیے بہترین نسخہ ہے۔

☆☆